آصفِ سابع

میر عثمان علی خاں

اور اُن کا عہد

طیبہ بیگم

ناشر

ادارۂ ادبیاتِ اُردو

تاریخ اشاعت : نومبر ۱۹۹۳ء

تعدادِ اشاعت : ۵۰۰

ٹائیٹل اور تصاویر : دکن پروسیس لکڑی کا پل۔ حیدرآباد

کتابت : عبدالرزاق خوش نویس
محمد غالب خوش نویس

طباعت : دائرہ الکٹرک پریس چھتہ بازار حیدرآباد

سرورق :

قیمت : ۱۲۵ روپیے

یہ کتاب ایچ.ای.ایچ دی نظامس اُردو ٹرسٹ اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی مالی اعانت سے شائع کی گئی

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اُردو ۳۳۲

انتساب

اپنے والدین

محترم سید رحمت اللہ قادری صاحب مرحوم

اور

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ مرحومہ

کے نام

حمد

نقشِ وفا ہو صفحۂ ہستی پہ شاہ تم

فہرست

حصہ اوّل

کچھ اپنی بات

اُردو سے مجھے عشق ہے اور ادبی ذوق ننھیال سے ورثے میں ملا ہے۔ پرنانا نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، نانی محترمہ طیبہ بیگم بلگرامی اور والدہ محترمہ سکینہ بیگم رحمت اللہ جیسی علم دوست ہستیوں نے حیدرآباد کے خالص علمی اور ادبی ماحول میں میرے ذہن کی آبیاری کی۔ طیبہ بیگم بلگرامی کے درد بھرے ناول سکینہ بیگم کی دل کش کہانیاں اور کرشن چندر کے دل گداز افسانوں نے میرے احساسات کو جگایا اور میں نے جانا کہ زندگی کی حقیقتیں افسانوں کو کس قدر دل کش بنا دیتی ہیں۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی میں نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ میری حساس فطرت نے جو کچھ زندگی میں دیکھا اور اخذ کیا، افسانوں کا روپ دے دیا۔ میری والدہ کی ہمت افزائی نے مجھے اس قابل بنایا کہ اپنی کہانیوں اور افسانوں کو مختلف رسالوں میں شائع کراؤں ورنہ یہ سب میری بیاضوں میں سوکھے ہوئے پھولوں کی مانند دفن رہتے۔ میرے والد سید رحمت اللہ قادری کے قادریہ مسلک اور تصوف کے مذاکروں نے مزید میری ذہنی دنیا کو متاثر کیا۔ مانٹی سوری ماڈل پرائمری اسکول نے بھی میری شخصیت کی تعمیر میں مدد کی۔ اسکول میں ڈراماٹکس میں حصہ لیتے لیتے ڈرامے، فیچر اور کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور فنونِ لطیفہ سے لگاؤ بڑھتا گیا۔ کئی سال ریڈیو پر بچوں کے

پروگراموں میں حصہ لیتی رہی اور خود اپنی کہانیاں فیچر اور ڈرامے پیش کرتی رہی ۔ بچوں کے "ماموں" مرزا ظفر الحسن نے ہر وقت میری کاوشوں کو سراہا اور آواز کی دنیا میں مجھے ایک معروف مقام حاصل ہوا۔

تخیل کی فراوانی تھی ۔ میرا ماحول خود مجھے افسانے اور کہانیاں لکھنے پر اُکساتا رہا ۔ پلاٹوں میں طرح طرح کی دل کشیاں اور رنگینیاں سمٹ کر آتی رہیں اور میرے دلی جذبات کو یوں باہر نکلنے کا موقع ملتا رہا ۔ چوں کہ تخیل کی ہر پیداوار اسی دنیا کا ہی عکس ہوتی ہے جس میں صاحب تخیل زندگی بسر کرتا ہے ۔ ادب بھی اسی تعلق کا نتیجہ ہو گا جو ادیب کو زمانے کے ساتھ ہوتا ہے ۔ زندگی کا ہر خوش گوار واقعہ یا پُرسوز حادثہ آدمی کے احساسات کو متاثر کرتا رہتا ہے، اس کے خیالات وجذبات کا اظہار بھی اس کے ان ہی تجربات کا حاصل ہوتے ہیں ۔ ایک حساس ادیب کا دردمند دل زندگی میں درد وغم کے مرقعے تلاش کر لیتا ہے اور ان مرقعوں میں اپنے دل کی تڑپ اور کسک شامل کر کے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے ۔ دوسرے معنوں میں سچا اور اچھا فن، فن کار کی ذاتی زندگی اور بیرونی تجربوں، اس کے شدتِ احساس اور خلوصِ جذبہ سے پروان چڑھتا ہے ۔ وہ ہر تجربے کو اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدے سے ہم آہنگ کر کے دوسروں کو اپنا شریکِ غم بنا لیتا ہے ۔ تفریحی ادب روح کو سُبک کرتا ہے لیکن حزنیہ ادب کا اثر قاری کے دل پر دیرپا ہوتا ہے کیوں کہ زندگی کی تلخ حقیقتیں اسے زیادہ متاثر کرتی ہیں ۔ ویسے بھی زندگی میں خوشیاں کم اور دکھ درد زیادہ ہی ملتے ہیں ۔

افسانے یا کہانیاں لکھنے کا ڈھنگ میرا اپنا ہے ۔ میں نے کسی کا انداز نہیں اپنایا نہ کسی کے خیالات پر اپنے افسانوں کی عمارت کھڑی کی ۔ میرے کردار میرے اپنے ہیں جو جذباتی بھی

رہیں اور حقیقت پسند بھی ۔ آنسو اور مسکراہٹ زندگی کے دو محبوب صورت رنگ ہیں اور
وہ میری فطرت کا ایک جزو ۔ ان تینوں کا امتزاج ہے میری کہانیاں یا افسانے ۔ زندگی
کی بے شمار کشمکشوں، درد و غم، چیخ و پکار نے میرے دل کے تاروں کو ہمیشہ جھنجھنایا
اور میرے دل کا درد اور روح کی پکار کاغذی پیرہن میں سماتی گئی ۔ میری کہانیوں
میں نہ صرف حقیقت کی جلوہ گری ہے بلکہ تصوّرات کے ہنستے مہکتے پھول بھی ان میں گوندھتی
جاتی ہوں تاکہ ان کی خوش بُو سے حقیقت کے تیز و تند جھکڑ اور زہر آلود ہوائیں مشک بار
ہو جائیں اور زندگی کچھ گوارا ہو جائے ۔

میری کہانیاں میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی سسکیاں ہیں، ماحول اور
اقدار سے معاشرے کی غیر آہنگی اور ٹکراؤ کی دل خراش چیخیں ہیں ۔ میرے افسانے عورت
کی مظلومیت، سپردگی اور بے بسی اور مرد کی بے حسی، بے دردی اور بے وفائی کی داستانیں
ہیں ۔ موضوع نیا نہیں ہے ۔ عورت اور اس کے سماجی اور معاشرتی مسائل ہمیشہ ہی ادب
کا موضوع بنے رہے ہیں ۔ سماج کے ٹھیکہ داروں اور ان کی گندی ذہنیتوں کی پرچھائیاں
انسانیت کی دم توڑتی صدائیں، ظلم و جبر اور ناانصافیاں ہر دور میں ادب پر چھائی رہی
ہیں کیوں کہ ادب اور زندگی کا گہرا تعلق ہے لہٰذا زندگی کو ادب میں پیش کرنے والا ادیب
اپنے زمانے اور ماحول کی آواز ہوتا ہے لیکن ادب کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ کچھ اعلیٰ
قدریں اور معیار مقرر ہوں جن کے بغیر ادب کھوکھلا رہ جائے گا معیاری اور اچھے ادب
میں فحش نگاری کی کوئی جگہ نہیں ہوتی ۔

محبت، رومان اور عورت ہر وقت افسانوں کی دلکشی کا مرکز رہی ہے ۔ رومان
اور تخیّل کی شاعرانہ دنیا میں جو عورت اور مرد سانس لیتے نظر آتے ہیں وہ ہماری اس

جیتی جاگتی دنیا کے عورت اور مرد ہی ہیں جن میں زندگی کی ساری الجھنیں، غم اور خوشیاں اور مسرتیں سمٹ آئی ہیں۔ ان ہی مختلف انسانی جذبات کے آنسو اور مسکراہٹوں سے ترتیب دیا ہوا مجموعہ "سرمژگاں" کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔ مرحوم شاذ تمکنت نے اس نام کا انتخاب کرکے اپنی شعریت کا ثبوت دیا اور ڈاکٹر وحید اختر نے اس کا پیش لفظ لکھ کر مجھے ممنون کیا۔ "سرمژگاں" کے لیے خواجہ احمد فاروقی کے چند کلمات میری کاوشوں کو سراہنے کے لیے داخل کتاب ہیں۔

خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کیا ہوتی ہے اس کا علم اور احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے متعلقہ محترم ہستیوں کے متعلق رسالوں میں خامہ فرسائی کی۔ قارئین نے ستائش کی تو "ابر نیساں" کے نام سے ان خاکوں کو یکجا کیا جس کے دو ایڈیشن ۸۰ء، ۸۱ء اور پھر چند اضافوں کے ساتھ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئے۔ "ابر نیساں" کے دوسرے ایڈیشن کے لیے علی گڑھ کے مرحوم خلیل الرحمن اعظمی نے باوجود علالت کے اپنے خیالات کا اظہار کیا جو ان کی آخری تحریر تھی۔

اس سے قبل ۱۹۵۵ء میں "جوہی کی ڈالی" کے نام سے بچوں کے لیے اپنی والدہ اور نانی کی کہانیوں کو مرتب کیا۔ ۱۹۵۷ء میں پاکستان میں میرے شوہر کے اچانک انتقال نے ذہنی صلاحیتوں کو غم و اندوہ کے طوفان میں بہا دیا اس سانحے نے کچھ اقتصادی ذمہ داری بھی لا ڈالی۔ یہاں چند ہی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ، سینٹ پال اسکول حیدرآباد اور دلہم گرلز اسکول دہرہ ڈون میں چند سال پڑھاتی رہی۔ A.I.C اور سنڈیکیٹ بینک کے لیے بھی میں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۹ء تک علی گڑھ کے قیام کے دوران بیشتر رفاہی کام انجام دیتی رہی۔ ادبی اور سماجی تنظیمیں قائم کیں جن

کے لیے "کریش" اور چوتھے درجے کے ملازمین کے لیے تعلیم بالغاں کا پروگرام چلایا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے میرے نانا عماد الملک اور نانی طیبہ بیگم نے سرسید احمد خاں کا ہاتھ بٹایا تھا اسی جذبۂ خدمت گزاری کے تحت یونیورسٹی کے طلبہ، طالبات، خواتین اور بچوں کی مختلف تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں شامل رہی۔ "خواتین کا مسلم سماج میں مقام" "STATUS OF WOMEN IN MUSLIM SOCIETY" کے عنوان کے تحت کامیاب سہ روزہ سمپوزیم بھی منعقد کیا جس میں ہندوستان کے وکیل، سوشیل ورکرز اور مختلف شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے متعدد دانشوروں نے مقالے پڑھے اور مذاکرے ہوئے۔

حیدرآباد میں "قلم اور آواز" کے نام سے ۱۹۸۲ء میں بنجارہ ہلز پر ایک ادبی، تہذیبی اور سماجی تنظیم کی بنا ڈالی جس کے تحت ہر مہینہ مختلف دلچسپ علمی اور ادبی اور تہذیبی پروگرام پیش کرتی رہی۔ "نظر میں ہیں جلوے نہاں کیسے کیسے" کے نام سے نظام ہفتم میر عثمان علی خاں کی صدی تقاریب کے دوران ایک سمپوزیم منعقد کیا جس میں قدیم و جدید حیدرآباد کے معروف مفکر، ڈاکٹر، پروفیسر، شاعر اور ادیبوں نے حصہ لیا۔ مقالے بھی پڑھے گئے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظام ہفتم کے دیوان سے منتخب غزلیں ساز پر گائی گئیں۔ ایک ایسا ماحول تھا جس میں نظام ہفتم مسند نشین تھے ان کی داستانیں گونج رہی تھیں، ان کے گیت گائے جا رہے تھے، ان کے کارہائے نمایاں تصاویر کی شکل میں بھی سجائے گئے تھے۔ ادارۂ ادبیات اردو میں جہاں یہ سمپوزیم ترتیب دیا گیا تھا، نظام ہفتم کی جلوہ گری تھی اور نمک خوار اپنی نمک خواری کا حق ادا کر رہے تھے۔

دورِ حاضر کی نئی پود کو اپنے ماضی اور اسلاف کے کارناموں سے واقف کرانے

کہ ضرورت ہے کیوں کہ ہر مستقبل کا ایک ماضی اور ہر ماضی کا ایک مستقبل ہونا ضروری ہے۔ ہمیں ماضی کا بار بار جائزہ لینا ہے تاکہ مستقبل کو سنوار سکیں اور اس کی روشنی میں اسے اپنا رہنما بنا کر، کامیابی کی منزلوں سے آشنا ہوسکیں۔

چھ سال قبل ترقی اردو بورڈ نئی دہلی کی فرمائش پر اسی مقصد کے تحت آصف جاہی سلطنت کے آخری تاج دار "میر عثمان علی خان" پر کتاب لکھنا شروع کیا لیکن تعلیمی مصروفیات اور والدہ کی بیماری اور انتقال کے سبب اسے مکمل کرنے میں کافی تاخیر ہوگئی۔ حیدرآباد دکن سے محبت اور حضرت عثمان سے عقیدت اور ان کی نمک خواری نے ہرگز یہ گوارا نہیں کیا کہ اس کام کو نامکمل چھوڑ دوں۔ چناں چہ کوشش جاری رہی جو ۱۹۹۱ء میں آخر کار مکمل ہوگئی اور آج ۱۹۹۳ء میں کتابت اور طباعت کے مراحل سے گزر کر منظر عام پر آرہی ہے۔ حیدرآباد کے چار سو سالہ جشن کے سلسلے میں اپنی اس کاوش کو دنیائے ادب کے روبرو پیش کررہی ہوں۔ حیدرآباد دکن اور نظام ہفتم کی عقیدت نے یادوں کی انجمن سے کچھ پھول اور کلیوں کو سمیٹنے، کچھ جلتے بجھتے چراغوں کو روشن کرنے اور کچھ بھولے بسرے نغموں کو سنگیت پر سجانے پر مجبور کردیا ہے۔ میر عثمان علی خان کی شخصیت، ان کی شاعری، ان کی رواداری، ان کی سلطنت کا نظم و نسق اور حیدرآباد کو اس کے سیاسی و سماجی پس منظر میں پیش کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔

اردو زبان، ادب اور صحافت، تہذیب و تمدن، شایستگی اور بھائی چارہ جو حیدرآباد دکن کی مثالی خصوصیت تھی، ناپید ہوتی چلی ہے۔ جس سلطنت کی آغوش میں فکر و تہذیب کی انجمنیں سجتی رہیں، علم و فن کے مینار بلند ہوتے رہے۔ محبت اور یک جہتی کے چراغ ہر بام و در میں جلتے نظر آئے۔ وہاں آج ننگی تلواریں، چاقو چھریاں، نیزے بھالے شیطانی ہاتھوں

میں رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ نفرت، درندگی اور حیوانیت، انسانیت کی دہلیز پہ ٹھوکر مار رہی ہے۔ تہذیب کی انجمنوں میں آگ لگ گئی ہے۔ لہو پانی کی طرح ہر طرف بہتا نظر آتا ہے۔ اقدار دم توڑ چکے ہیں۔ چار سو سالہ پرانے اس سرچشمۂ اخوت و محبت کے سوتے سوکھ گئے ہیں۔ پس بھری ہواؤں نے اس گلزارِ امن کے ہنستے مسکراتے ہر پھول اور کلی کو نوچ کر پھینک دیا ہے۔ پامال کر دیا ہے۔ دلوں کی پاکیزگی مٹ گئی ہے۔ اس سرزمینِ دکن پہ اب صرف کالے زہریلے ناگوں کا راج ہے۔ ایک سراسیمگی، دہشت، خوف و دہشت کا عالم ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں کبھی اولیائے اللہ کے کرشمے اور کرامتیں اللہ کے بندوں کی ہدایت کرتے تھے اور خدا کی رحمتوں کے سائے میں انسانیت پیار و محبت کے رشتے بانہیں پھیلائے نظر آتے ہیں۔

حیدرآباد کا عروج و زوال دونوں آنکھوں کے سامنے ہے!

یہ کتاب تاج دارِ دکن میر عثمان علی خاں کی داستانِ حیات ہی نہیں، حیدرآباد کے اسی عروج و زوال کی کہانی ہے۔ حیدرآباد کی قومی یک جہتی، رواداری، خلوص و یگانگت کا ایک ناقابلِ فراموش صحیفہ ہے جو نہ دل سے محو ہو سکتا ہے نہ اوراقِ تاریخ سے۔

یہ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے اور دولت و سطوت کے سائے میں سلطنتِ آصفیہ کے حکمران، فقیر منش تاج دار آصف جاہ سابع کی خدمت میں اپنے خلوص و عقیدت کا نذرانہ بھی۔

اردو ٹرسٹ اور نظامس چیریٹیبل ٹرسٹ کے چیرمین پرنس مفخم جاہ بہادر اور سکریٹری نظامس اردو ٹرسٹ عبدالمحمود صاحب کی ممنون و شکر گذار ہوں کہ ٹرسٹ نے میری اعانت کی منظوری دی

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے بھی میری اس کاوش کو سراہ کر اس کی اشاعت کے لیے خاطر خواہ مدد کی ہے جس کے لیے میں ڈائرکٹر اور سکریٹری جناب اقبال مظفر احمد صاحب کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔

پروفیسر مغنی تبسم کی مشکور رہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت و طباعت کے مختلف مراحل میں میری بھرپور مدد کی ہے۔

ساتھ ہی میر عثمان علی خاں کی تصاویر کی فراہمی کے لیے ڈاکٹر یوسف حسین خان محترمہ انیس حسن الدین احمد اور مرزا رضا علی خاں کی اور ان تصاویر نیز ٹائیٹل کور کی اسکرین پرنٹنگ کے لیے جناب شفیق احمد مالک "دکن پروسس" کی بھی شکر گزار ہوں۔ خوش نویس محمد عبدالرزاق اور خوش نویس محمد غالب نے کتابت کے مختلف مرحلوں اور دشواریوں میں میرا ساتھ دیا جس کے لیے میں ان دونوں کی بے حد ممنون ہوں۔ دائرہ پریس کے پروپرائٹر کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔

شکریہ

طیبہ بیگم

نومبر ۱۹۹۳ء

حرفِ اوّل

دولت کے تمکنت کے حشم کے عروج کے
کتنوں کے ہاتھ ہیں تسبیحِ عثماں کے ہاتھ میں (جلیلؔ)

استاذِ سخن واستادِ شاہ فصاحت جنگ جلیلؔ نے شہریارِ دکن آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں، سلطنتِ آصفیہ کے رفیع المرتبت، دوربیں اور دوررس، روشن دماغ، سیاسی مدبر کی نسبت یہ شعر کہہ کر ان کے جاہ وجلال، سطوت وعظمت کے بارے میں بہت کچھ بیان کر دیا ہے۔

یہ رعایا پسند، نیک دل حکمراں، باوصف وبا اخلاق، غریب نواز، اسلامی اصولوں کا پابند، سادگی پسند، مخلص وہمدرد انسان آسمانی بلندیوں پہ پہنچنے کے باوجود غرور ونخوت سے پاک تھا۔ مصلحتوں، ریاکاریوں، ظلم وجور سے دُور تھا۔ اس کی بارگاہ میں سبھی کی باریابی ہوتی تھی۔ ہر بلند وپست پہ اس کی نظر تھی۔ شہر کے چپّے چپّے کا حال اسے معلوم تھا۔ رعایا کی حالت، ان کے مزاج کی افتاد، زندگی کا کوئی پہلو اُن سے پوشیدہ نہ تھا۔

کنگ کوٹھی میں غریبوں کی فریاد اور بےکسوں کی آہ وزاری، اہلِ علم وکمال کے مطالبے سب منظور کیے جاتے تھے۔ کوئی آستانِ عثمان سے محروم نہیں جاتا تھا۔

میر عثمان علی خاں کی زندگی، بلند نظری اور انسان دوستی کا نمونہ تھی۔ تاجدارِ دکن کی شوکت وعظمت اور سادگی سے متاثر ہو کر جوشؔ ملیح آبادی نے کہا تھا:

دوسروں کو نعمتیں اور آپ کو نانِ شعیر

اور خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا:

"بڑے بڑے قوی دل لوگ رعبِ شاہی سے مرعوب ہو جاتے تھے۔"

یہ غیر معمولی انسان ۸۲ ہزار مربع میل کے وسیع رقبے میں بسنے والے ایک کروڑ تیئس لاکھ افراد کے جان و مال کی حفاظت اور ان کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ رعایا اپنے فرض شناس بادشاہ پر تصدق تھی اور حقِ نمک ادا کرتی تھی۔

سلطنتِ آصفیہ کے درخشاں مستقبل، اعلیٰ و ارفع مقام اور امن و امان، خوش حالی اور نیک نامی کے لیے بادشاہ شبانہ روز مصروف رہتے تھے۔ منصوبے سوچتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے دکن کو دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے مقابل لاکھڑا کیا۔ رعایا سر اٹھا کر چل سکتی تھی۔ جذبۂ خود داری سے معمور تھی۔ حقوق و فرائض کے سبق سبھی کو یاد تھے۔ سب کو مذہبی آزادی تھی اور سارے مذاہب پیار اور انسانیت کے رشتے میں منسلک تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ بلا لحاظ مذہب و ملت مسلم، ہندو، پارسی، سکھ، عیسائی اپنے روادار، بے تعصب، خوش خلق بادشاہ کے مطیع و فرماں بردار اور جاں نثار تھے۔ حیدرآباد نہ صرف دارالامن اور دارالسلام تھا بلکہ دارالرحمت تھا۔ اللہ کی رحمتیں اور اولیائے اللہ کی کرامتیں اس سرزمینِ دکن پہ اپنا سایہ کیے ہوئے تھیں۔

اس خود مختار بادشاہ کا اپنا پرچم، اپنا سکہ، اپنا ٹپہ تھا، اپنی ریلیں، اپنی فوج اور پولیس تھی۔ اپنی نشرگاہ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسر دربارِ شاہی میں ادنیٰ غلام و خادم کی حیثیت سے حاضر ہوتے تھے۔ حکومتِ برطانیہ سلطنتِ آصفیہ کی مربیانہ سرپرستی کی رہینِ منت تھی۔ شہنشاہِ برطانیہ جارج پنجم نے دورانِ جنگ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں "یارِ وفادارِ حکومتِ برطانیہ" کے نام سے موسوم کیا اور "ہز اکزالٹیڈ ہائی نس" کا اعزازی لقب دیا تھا۔

سلطنتِ آصفیہ کے صاف ستھرے اعلیٰ نظم و نسق میں مفت خوروں یا رشوت خوروں اور غریبوں کا خون چوسنے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ حکومت کے ہر شعبے میں صحیح معیار

اور انتظام قائم کر کے، بے معنی کھیل تماشوں کو ممنوع قرار دے کر، عوام کی دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں کی طرف پلٹا دیا گیا تھا۔ انھوں نے فرسودہ اور بے ہودہ رسم و رواج اور فضول خرچیوں کی روک تھام کر کے اپنی رعایا کو کفایت شعاری کا سبق سکھایا۔ سلطنت کی معیشت اور خزانے میں اضافہ کیا۔ خود اپنی سادہ زندگی کی مثال دے کر عوام کو سادہ اور پاکیزہ زندگی گزارنے کی ترغیب دی۔

میر عثمان علی خان کے پاس کروڑوں کی دولت تھی لیکن اس دولت کو انھوں نے اپنی ذات پر ہرگز خرچ نہیں کیا۔ اکثر کا خیال ہے کہ بادشاہ تنگ دل اور خسیس تھے لیکن حقیقت اس سے مختلف تھی۔ انھوں نے دولت جمع کی تو اپنی سلطنت کی سربلندی کے لیے۔ ان کی جود و عطا اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک عام تھی۔ ان کی فیاضی بے پایاں تھی۔ اگر وہ کفایت شعاری کے اصول کو پیشِ نظر رکھتے تھے تو اس لیے کہ زمانے کے بڑھتے ہوئے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سرکشیوں اور شورشوں سے ملک کی حفاظت و مدافعت کر سکیں۔ وہ خزانے بھرتے تھے تو اپنی رعایا کی خوش حالی کے لیے، ملک اور ملت کی بہتری کے لیے۔ سلطنت کے اقتدار و وقار، نیک نامی اور شہرت کو قائم رکھنے کے لیے اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ کارہائے نمایاں جو زندگی کے ہر شعبے میں، سلطنت کے ہر محکمے اور سررشتے میں نظر آتے ہیں، نہ ہو سکتے تھے۔ ان کے فیوض و برکات ہر خاص و عام کو نصیب تھے۔ عدلیہ اور انتظامیہ پر وہ کڑی نظر رکھتے تھے کہ کسی فرد کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ ان کی غیر معمولی ذہانت اور سوجھ بوجھ ان کی محنت اور تدبر کو دیکھ کر حکومتِ ہند کے بڑے بڑے مدبّر، سیاسی لیڈر اور انگریز بھی ان کی فرض شناسی، خلوص اور جدّ و جہد کے معترف تھے۔ عہدِ عثمانی کی تمام ترقیوں کا راز ان کی یہی شبانہ روز محنت تھی۔

میر عثمان علی خاں ایک روشن خیال اور روشن دماغ حکمران تھے۔ اپنی رعایا کی ذہنی تربیت اور تعلیم کے لیے انھوں نے درس گاہیں، جامعات اور دینی مدرسے کھولے۔ جامعۂ عثمانیہ

کے قیام سے انھوں نے نہ صرف اردو زبان کی ناقابلِ فراموش خدمت کی بلکہ اپنے ملک کے اور بیرونِ ملک کے نوجوانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ نوجوان ادیب، انشا پرداز اور شاعر بن کر ابھرنے لگے۔ شعر و سخن کی محفلیں جمنے لگیں تو بیرونی شعرا آ کر سلطنت کی سرپرستی حاصل کرنے لگے۔ خود بادشاہ شعر کہتے تھے اور مشاعروں سے محظوظ ہوتے تھے۔ اردو زبان دکنی تہذیب کا سرچشمہ تھی۔ سب کی مشترکہ میراث تھی۔ اتحاد و قوت کا منبع تھی۔ دکن کی یہ گنگا جمنی تہذیب اور باہمی اتحاد و خلوص دورِ عثمانیہ کا قابلِ قدر ورثہ تھا۔

مختصر یہ کہ دکنی تہذیب و تمدن مغلیہ سلطنت کی تہذیب و تمدن کی وارث بنی اور پھر دکنی روایات کو لے کر یہی قومی تہذیب بن گئی جو نہ اسلامی تھی نہ ہندوانی، بلکہ دونوں کے امتزاج کا نتیجہ تھی۔ تہذیب کسی مذہب سے وابستہ نہیں ہوتی۔ تہذیب قوموں سے بنتی ہے لہٰذا اردو زبان اور اردو تہذیب دکن کی مشترکہ میراث رہی۔ حیدرآباد علم و فن، زبان و ادب کا گہوارہ اور تاریخ کا ایک اہم ورق تھا۔

تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے وقت لکھنو اور دہلی کے شاعر اور ادیب حیدرآباد کا رخ کرنے لگے اور عثمان علی خاں نے ان کے لیے اپنی حکومت کے خزانے کھول دیے۔ اس سے قبل مغلیہ سلطنت کے خاتمے پر دلی کے امرا، دانش ور، مفکرین شاعر اور ادیبوں کے لیے سلطنتِ آصفیہ ہی آخری پناہ گاہ بن گئی تھی اور سلطنتِ آصفیہ نے ان پناہ گزینوں کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا تھا۔ یوں دہلی کا علم و ادب حیدرآباد میں سمٹ آیا۔ داغ، فانی، جلیل مانک پوری، جوش ملیح آبادی وہ چند بیرونی شعرا تھے جنھوں نے حیدرآباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

اردو زبان کو دفتری، عدالتی اور سرکاری زبان کا رتبہ دے کر اس کے دامن کو ہیرے موتیوں سے سجا دیا اور دنیا نے دیکھا کہ اردو زبان ہر قسم کی بولی کو اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

میر عثمان علی خاں کی علمی سرپرستی کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کا وجود میں آنا اور نوجوانانِ حیدرآباد کی

خفتہ صلاحیتوں کا ابھارنا حیدر آباد کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔

عہدِ عثمانی کی ضیاپاشیاں دُور دُور تک پہنچ گئی تھیں۔ اس کی دلبریوں کے چرچے کونے میں چھپے تھے۔

بادشاہ کے تدبر و فراست نے انھیں "حکیم السیاست" کا لقب عطا کیا۔ رعایا کی خوش حالی نے انھیں "ظلّ اللہ" بنایا۔ علم پروری نے جامعۂ عثمانیہ سے "سلطان العلوم" کی اعزازی ڈگری دلائی۔ اہم اسلامی خدمات کے پیشِ نظر مسلمانانِ دکن نے انھیں "محی الملت والدین" کا لقب عطا کیا۔

حیدر آباد دکن ہند و مسلم طرزِ تعمیر کے لحاظ سے شاہ جہاں کے دہلی و آگرہ کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ اس کی صاف و شفاف سڑکیں اور ان پر روشنی کا بہترین انتظام، ہر طرف سرسبز باغات، راحت افزا مناظر، شہر کے بیچ بہتی ہوئی پُرسکون موسیٰ ندی اس کے پُرسکون ماحول، اس کی سطوت کے گن گاتی رہتی تھی۔ سربلند خوبصورت عمارتیں رشکِ آگرہ بنی رہیں۔ دکن ایک دیدہ زیب جنت تھی۔

حیدر آباد ایک تہذیب کا نام تھا جو تہذیبِ عثمانی کا ایک حصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کی سلطنت کی آغوش میں فکر و تہذیب کی انجمنیں سجتی رہیں۔ علم و فن کے مینار بلند ہوتے رہے اور یک جہتی کے چراغ ہر بام و در میں جلتے نظر آئے۔

سچ پوچھیے تو سرزمینِ دکن دورِ اسلامی کی نہ بھولی جانے والی یادگار تھی جو قابلِ فخر شہ پاروں کا گہوارہ بنی رہی۔ آج بھی ان کے کارنامے زندہ ہیں۔ ان کی تخلیقات قائم ہیں لیکن وہ خلوص و محبت، وہ رواداری اور بھائی چارگی، وہ امن و امان، وہ خوشی وہ راحت و آسودگی، وہ دبدبہ و سربلندی جو دورِ عثمانی کا طرۂ امتیاز تھی، میر عثمان علی خاں کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔

سلطنتیں بنتی اور بگڑتی ہیں شہنشاہیاں بامِ عروج پر پہنچتی اور فنا ہوجاتی ہیں۔

بستیاں بستی اور اجڑتی ہیں لیکن ان کے تاثرات و روایات، ان کا تہذیب و تمدن، ان کے نقوش اور جلوے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سینوں سے محو نہیں ہو سکتے۔ اور "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" کے مصداق تصور گزرے ہوئے ایام میں پہنچ جاتا ہے۔

کائنات کا نظام محبّت کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ وفا شعاری اہلِ دکن کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اسی محبّت و وفا شعاری کا تقاضا ہے کہ اس ذی شان، اعلیٰ مرتبت، فقیر منش بادشاہ کی خدمت میں گُل ہائے عقیدت پیش کروں۔ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ وابستہ وہ کہانیاں، نظروں میں تھاں وہ جلوے اور یادوں میں بسی وہ عطر بیز داستانیں سُناؤں کہ خموشی زباں ہو جائے۔ کھوئی ہوئی منزلیں مل جائیں۔ بے چین روحوں کو قرار آجائے اور بقولِ عثمانؔ:

> زبانِ شمع سے سنتا ہوں قصّہ سوزِ الفت کا
> شب آخر ہو گئی لیکن ابھی ہے داستاں باقی
> گُل و ریحان و سُنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
> مگر بلبل کے لب پہ رہ گئی آہ و فغاں باقی
> سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثمانؔ
> مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

دورِ عثمانی کا آغاز جس قدر درخشاں تھا، انجام اسی قدر حوصلہ شکن۔ اختر ذی جاہ آسمان سلطنت پر ۱۹۱۱ء میں اُبھرا لیکن ۱۹۴۸ء کی چلچلاتی دھوپ اور تلاطمِ حوادث کے تیز و تند جھکڑوں نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا۔

اس اُبھرنے اور ڈوبنے کے درمیان کیسی کیسی روشنی بکھری، کیسی کیسی تاریکی چھائی، کیا کیا نہیں ہوا اور کیا کیا ہو گیا!!

سرسیّد احمد خاں نے کہا تھا:

"وہ قوم بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے کارناموں کو، جو یاد رکھنے کے قابل ہیں، بھلا دے یا اُن سے واقف نہ ہو"۔

آج میر عثمان علی خان کی یاد آتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ تیرگی میں کہیں چنگاریاں پھیل گئی ہیں۔ کیوں نہ ان چنگاریوں کو شعلے بنادیں۔ یادوں کے کانپتے اوراق سے اِن کی سیاہی چرالیں۔!!

سیاسی و سماجی پس منظر

رشکِ فردوس دکن ہے
حیدر آباد وطن ہے

جب دکن میں بہمنی سلطنت نے دم توڑا تو پانچ ریاستوں نے جنم لیا۔

۱۔ بیجاپور میں یوسف عادل خان صوبہ دار تھا۔ اس نے اپنے نام پر عادل شاہی حکومت قائم کی اور خود مختار بادشاہ بن گیا۔

۲۔ احمد نگر (دولت آباد) کا صوبہ دار حسن نظام الملک تھا جس کا دادا برار میں پٹواری تھا جو مغل بادشاہ محمد شاہ کے پاس گرفتار ہو کر آیا تھا۔ بادشاہ نے اس کو راجمندری کا صوبہ دار مقرر کیا۔ حسن کے بیٹے احمد نظام الملک نے اپنے بنائے ہوئے نئے شہر کو احمد نگر کا نام دے کر نظام شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

۳۔ فتح اللہ عماد الملک برار کا صوبہ تھا جو خواجہ محمود گاواں کی سفارش پر مقرر ہوا تھا۔ برار دکن کا ایک زرخیز علاقہ تھا۔ فتح اللہ نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور عماد شاہی حکومت قائم کی۔

۴۔ بیدر میں قاسم برید شہر کا ایک کوتوال تھا۔ بادشاہِ وقت کی کمزوری سے اس نے فائدہ اٹھایا اور بیدر اور آس پاس کے علاقوں پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ یوں برید شاہی حکومت کی ابتدا ہوئی۔

۵۔ محمود شاہ بہمنی نے محمد قلی قطب الملک کو گولکنڈے کا صوبہ دار مقرر کیا تھا یکے بعد دیگرے جب سب صوبے خود مختار ہو گئے اور سبھی صوبہ داروں نے اپنی اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرلیں تو محمد قلی نے بھی اپنے نام سے گولکنڈے میں قطب شاہی حکومت قائم کرلی۔ اور سلطان بننے کے بعد سلطان قلی قطب شاہ کا لقب اختیار کرلیا۔ گولکنڈہ قطب شاہی بادشاہوں کا دارالسلطنت تھا۔

آج جس شہر کا نام حیدرآباد ہے وہ ان ہی قطب شاہی بادشاہوں کے ذوق کا آئینہ دار ہے اور جو قلعۂ گولکنڈہ سے پانچ میل کے فاصلے پر آباد ہے بیچوں بیچ موسیٰ ندی قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کی داستاں زبانِ حال سے سناتی بہتی رہتی ہے۔

چوں کہ حیدرآباد کا وجود، اس کی شہرت، اس کی تہذیب و تمدّن، زبان تاریخی آثار ہر چیز کا تعلق گولکنڈے اور والیانِ گولکنڈہ سے وابستہ ہے اس لئے ذکر گولکنڈے کے پس منظر میں کرتی چلیں تو بے جا نہ ہوگا بلکہ عین دلچسپی کا باعث ہوگا۔

گولکنڈہ جس کے آثار جس کا بالاحصار، جس کی دیواریں آج بھی باقی ہیں آج بھی لوگ حیات بخشی بیگم اور حیدر محل کے محلات، قلی قطب شاہ کی آرام گاہ عبدالرزاق لاری کے آہنی عزم کو سراہنے والا آہنی دروازہ، قلعہ، اس کی چاردیواری اور ابدی نیند سونے والے اس قلعے کے سلطانوں کے شاہی مقبروں کو دیکھنے جوق در جوق چلے آتے ہیں۔

یہاں آج بھی عشق و محبت کی داستانیں دہرائی جاتی ہیں۔ بہادری کے چرچے ہوتے ہیں۔ یہاں کے نظم و نسق کی باریکیوں کے قصّے بیان ہوتے ہیں۔ یہاں

آج بھی اُردو شعر و شاعری کی محفلیں سجتی ہیں ۔ یہاں ہندو مسلم آج بھی اپنے ملے جُلے کلچر اور تہذیب کے قصے سناتے ہیں ۔

دکن کی اس سرزمین پر بہمنی بادشاہوں نے جن ادبی، تہذیبی اور سماجی روایات کی شمع جلائی تھی اور قطب شاہی سلطانوں نے جس کی لو بڑھائی تھی ۔ فیروز شاہ بہمنی نے ہندو مسلمانوں کے درمیان جو "اتحاد" "اخوت" اور یگانگت کا پایہ رکھا تھا، جس پر مغل بادشاہ اکبر اعظم اور پھر عادل شاہی بادشاہ اور قطب شاہی حکمرانوں نے ایک نہ مٹنے والی عمارت کھڑی کی تھی ۔ آج صدیوں بعد بھی زندہ و سلامت ہے ۔

گولکنڈے ہی نے "کوہِ نور" جیسا ہیرا دیا جو راجہ مہاراجوں، ڈاکو لٹیروں کے ہاتھوں ہوتا ہوا برطانیہ کے تاج میں جلوہ فگن ہے ۔

یہاں سانولی سلونی تلنگی رقاصہ بھاگ متی کے گھنگھروؤں نے عاشق مزاج ملک زادہ کے جذبات بھڑکائے ۔ موسیٰ ندی کی سرکش لہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے گھوڑے پر سوار عشق نے حسن کی چوکھٹ پر سجدے کیے تو فورِ محبت سے باپ نے موسیٰ ندی پر پُل بندھوا دیا ۔ بھاگ متی کے بھاگ جاگے اور "حیدر محل" بن کر وہ محل میں آئی اور حیدر آباد شہر آباد ہوا ۔

دکنی تاریخ کے صفحات کو ہم اُلٹ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ قطب شاہی ثقافت اور تہذیب و تمدن ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتی ہے ۔

سلطان قلی تلنگانہ کے علاقے میں گورنر ہی نہیں بلکہ سپہ سالار بھی تھا ۔ صاحب قلم بھی ۔ اسی وجہ سے محمود شاہ بہمنی نے اسے "صاحب سیف و قلم" کا خطاب دیا تھا ۔ وہ عوام میں "بڑے ملک" کے نام سے مشہور تھا ۔ اس کے بیٹے جمشید قلی نے بھی باپ

کے ورثے یعنی شعر و ادب کو تخت و تاج کے ساتھ قبول کیا۔ ابراہیم قلی نے جب سبحان قلی سے تخت حاصل کیا تو گولکنڈے کا درخشاں باب کھلا۔ شاعروں، ادیبوں، علماء و فضلاء نہ صرف اس کے دربار میں ہر وقت موجود رہتے بلکہ سفر میں بھی وہ کتابوں کے صندوق ساتھ رکھتا۔ تلنگانہ میں رہنے بسنے کی وجہ سے وہ تلنگی زبان سے اچھی طرح واقف تھا۔ تلنگی میں شعر کہتا تھا۔ عربی فارسی کے علاوہ تلنگی شاعر بھی اس کے دربار میں باریاب تھے۔ اسی بادشاہ نے گولکنڈے میں پہلی بار اردو شعر و ادب کی شمع جلائی اور فیروز، سید محمود اور ملا خیالی جیسے نامور شاعر اردو ادب کو بخشے۔

علم و ہنر اور تہذیب و تمدن کے اس گہوارے کو سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ابدی شہرت بخشی اور دکنی تہذیب اور دکنی اردو کو گھر گھر پہنچایا۔ عوام کے دلوں پر حکمرانی کی اور خوب صورت شہر حیدرآباد وجود میں آیا۔

اسی عاشق مزاج سلطان کے دم سے موسیٰ ندی پر پل تعمیر ہوا جو آج بھی پرانا پل کے نام سے مشہور ہے اور عوام اس خوب صورت داستان کو ہر سال اپنے ذہنوں میں تازہ کرتے ہیں۔ جب گولکنڈے کے کھنڈر بقعۂ نور بن جاتے ہیں۔ جب شاعر خراجِ تحسین ادا کرنے جمع ہوتے ہیں اور ادیب اپنے قلم کے ذریعے اس بادشاہ کی نذر میں عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں تب یہ بادشاہ پھر زندہ ہو جاتا ہے۔

اسی سلطان نے دل نواز عمارتیں تعمیر کروائیں۔ شہر کے مرکزی مقام پر بلند "چار مینار" بنوایا۔ شاہی محل کھڑے ہوئے۔ چوڑی سڑکیں چاروں طرف بنیں جو چار مینار سے چار کمانوں سے ہو کر گزرتیں۔ عاشور خانے اور دار الشفا بنوائے۔

"گلزار حوض" شاہراہوں کے درمیان بنوایا۔ شہر کو نہایت سلیقے سے سجایا متمدن زندگی کی ضروریات کے لیے دکانیں، خانقاہیں بنوائیں۔ مہمان خانے اور لنگر خانے، کاروان سرائے بنائے۔ مسجدیں بنیں۔ خوش نما باغ اور تالاب سے شہر کو بارونق بنایا۔

سلطان قلی قطب شاہ نے قدیم اردو یا دکنی زبان کو جلا دی اور دکن میں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہلایا۔ اپنے کلام میں فارسی، عربی، ہندی اور تلنگی زبان کے الفاظ استعمال کر کے اسے ہر خاص و عام میں مقبول کروایا۔ اس آمیزش سے قلی قطب شاہ کی زبان و کلام میں ایک لوچ اور دل نوازی پیدا ہوگئی۔ قلی قطب شاہ نے اردو زبان کو شیرینی اور شائستگی دی اور ادبی زبان کا درجہ بخشا۔ شیخ احمد گجراتی، ملک الشعراء ملا وجہی اور غواصی اسی دور سے وابستہ رہے ہیں۔

سلطان قلی قطب شاہ کے بعد محمد قلی قطب شاہ نے تخت سنبھالا۔ یہ بھی علم دوست بادشاہ تھا۔ اعلیٰ کردار اور اخلاق کا مالک اور مذہب کا پرستار تھا۔ فلسفہ، تاریخ اور مذہبی علوم سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس نے کئی کتابوں پر مقدمے تحریر کیے۔ اس کے شاہی کتب خانے میں فلسفہ و حکمت، تاریخ و مذہبیات کی سینکڑوں کتابیں جمع تھیں۔ اردو میں شعر کہے اور عربی اور فارسی علماء کی سرپرستی بھی کی۔ اسی بادشاہ نے "مکہ مسجد" کا سنگِ بنیاد رکھا۔ "امان محل" جیسا محل تعمیر کروایا۔

اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ بادشاہ بنا جو قلی قطب شاہ کی طرح عیش پسند تھا لیکن علم و ہنر کا قدردان بھی تھا۔ اس نے بھی اپنا ایک دیوان چھوڑا ہے۔ اس نے محمد قلی قطب شاہ کے دور کی ادبی اور تہذیبی روایات کو دوبارہ زندگی بخشی۔

ملّا وجہی کو دوبارہ دربار میں باریابی حاصل ہوئی ۔ وجہی، غواصی اور ابنِ نشاطی اس کے دور کے مقبول شاعر گزرے ہیں ۔

سلطان عبداللہ کے طویل عہد میں تلنگی، دکنی اور فارسی کو مساویانہ مقبولیت اور ترقی حاصل ہوئی ۔ ہندوانی رسم و رواج مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں گھلنے ملنے لگے تو ہندوؤں نے مسلمانوں کی روایات کو اپنایا ۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شہادت اور کربلا کے واقعات مقامی اثرات اور جذبات کے ساتھ تلگو گیتوں میں رچنے لگے جنھیں کسان، جولاہے، کمھار بھی گاتے رہے ۔

سلطان ابوالحسن تاناشاہ، عبداللہ قطب شاہ کا داماد اور گولکنڈے کا آخری تاج دار تھا ۔ اس کے دور میں مغلوں اور مرہٹوں نے اتنی یورشیں کیں کہ امن و چین ختم ہوگیا ۔ دکن کی سیاسی تاریخ میں ابوالحسن نے اپنے تدبر سے اندرونی اور بیرونی معاملات میں بڑی کامیابی حاصل کی ۔

ابوالحسن صوفی منش بادشاہ تھا اور شاہ راجو قتالؒ سے اُسے بے حد عقیدت تھی ۔ اس نے اخلاقی جراُت سے کام لے کر بڑی بڑی سازشوں کو ناکام کیا ۔ آخر کار مغل بادشاہ اورنگ زیب کی فوج ایک غدار سپاہی کی مدد سے گولکنڈے میں داخل ہوگئی۔ اور سپہ سالار عبدالرزاق لاری کی بہادری اور جاں بازی کے باوجود گولکنڈہ مغلوں کے ہاتھوں میں چلا گیا ۔

گولکنڈے کا ایک روشن باب، اس کے بادشاہوں کی بے شمار خدمات، علم و ادب کے چراغ، طبعی اور فائز جیسے شعرا جو ابوالحسن کے دور سے وابستہ تھے، سب اس دور کے ساتھ آخری ہچکیاں لیتے دم توڑ گئے ۔

گولکنڈے کی دولت، علم وادب کے خزانے اور اس کا ادبی ماحول اور شعر و سخن کی محفلیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

چار مینار کے بانی سے خطاب

قابلِ عزت ہے تری ذات اے شاہ دکن
کیوں کہ تو نے اس دکن کو کر دیا رشکِ چمن
قدردانِ شعر تھا اے دکن کے حکمراں
عندلیبانِ سخن سے پُر تھا ترا گلستاں
کیا کروں تعریف تری اے قطب شاہِ دکن
فیض سے تیرے ہوئی پیدا یہ اُردو انجمن
تُو نہیں دُنیا میں لیکن اب بھی ترا نام ہے
اور دکن میں آج تک جاری یہ فیضِ عام ہے
عشق کی جولانیوں کی یہ دکن ہے یادگار
حشر تک باقی رہے گا یہ گلستانِ بہار

"مرقعِ دکن" سالگرہ نمبر (۱۹۳۹ء)
(مظفر الدین مظفر)

دکنی کلچر

قطب شاہی سلطنت میں ہندو مسلمانوں کے میل جول نے جس تہذیب اور کلچر کی آبیاری کی وہ اس خانوادے کے آخری سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے دورِ حکومت میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پروان چڑھتا نظر آتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ، حکومت کا کوئی محکمہ ایسا نہ تھا جس میں ہندو مسلمان دوش بدوش کام نہ کرتے ہوں۔ دونوں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ دونوں کو برابر کا مرتبہ حاصل تھا۔ مادنا برہمن وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھا۔ یہی زمانہ شیواجی کے عروج کا زمانہ تھا اور اس نے ابوالحسن سے مدد لی تھی۔

گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت کو اس بات میں امتیاز حاصل تھا کہ یہاں مسلمان اور ہندو دونوں اونچے عہدوں پر مامور تھے۔ خود بادشاہ اپنی ہندو رعایا کے مختلف تہواروں میں دلچسپی لیتے تھے۔ دکنی کلچر میں عوام کی یکجہتی کو ایک خاص مقام حاصل رہا۔

قلی قطب شاہ کو دکنی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس نے اپنی نظموں میں اپنی رعایا کے ہر دکھ سکھ، ان کے تہوار، ان کے رسم و رواج کا ذکر کیا ہے۔ اس کے کلام میں دکنی کے ساتھ تلنگی، عربی اور فارسی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ تلنگی زبان کی اس نے سرپرستی بھی کی اور تلگو شاعر پٹنا مٹا کوی اس کی سلطنت کا ملک الشعرا بنا دیا گیا۔

گولکنڈے کے سبھی بادشاہوں نے عوام کی خوشنودی کا خیال رکھا۔ دکنی اور تلنگی کی سرپرستی کے ساتھ انھوں نے سرکاری زبان فارسی کو بھی مقبولِ عام بنایا۔

مساویانہ مقبولیت اور ترقی ہر زبان کو حاصل ہوتی رہی ۔لیکن اُردو کو یہ فخر حاصل تھا کہ اُردو دکن کی مشترکہ زبان تھی ۔ دکن کے ہندو مسلمانوں میں' ان کی بات چیت' لباس اور پہناوے میں کوئی فرق نہیں تھا ۔ ہر پڑھا لکھا آدمی اپنی اپنی مادری زبان کے ساتھ اُردو زبان نہایت فصاحت سے بولتا اور پڑھتا لکھتا تھا ۔

شادی بیاہ کی رسمیں بھی دکنی چھاپ لیے ہوئے تھیں ۔ ہندوانی رسموں کو مسلمانوں نے بھی اپنا لیا تھا ۔ مثلاً منگنی' رت جگا' مانجھا' چوتھی' زیارت' چہلم' برسی کا تعلق اسلام کے ساتھ نہیں تھا لیکن "دکنی کلچر" کا جزو بن گئے تھے اور بلا لحاظِ مذہب و ملت یہ رسمیں منائی جاتی تھیں ۔

دکن میں اردو کے فروغ اور ترقی میں ہندو مسلمان دونوں نے برابر حصّہ لیا ۔ آصف جاہی حکمرانوں نے اس زبان کو ترقی دے کر علمی وقار بخشا ۔ قطب شاہوں کی طرح آصف جاہوں نے بھی شعرا اور ادیبوں کی بھرپور سرپرستی کی ۔ آصف جاہ اوّل جب دہلی سے اورنگ آباد آئے تو ان کے ہمراہ کئی شاعر اور ادیب بھی چلے آئے ۔ آصف جاہ دوم نے اورنگ آباد سے جب حیدرآباد کو پایہ تخت بنایا تو بہت سے شاعر اور ادیب حیدرآباد آ بسے ۔ ہندو شعرا میں چندو لال شاداں کا نام سرِفہرست ہے ۔ راجہ لکھمن لال نے عمر خیام کی فارسی رباعیات کو اُردو کا جامہ پہنایا ۔ ہیم چند نے "شاہ نامہ" کا اُردو ترجمہ کیا ۔ رائے گلاب چند ہمدم سے لے کر راجہ کرن پرشاد کرن تک جن شعرا نے دکن میں اپنی شاعری کے جھنڈے گاڑے ۔ ان میں ممتاز نام مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا ہے جو نہ صرف وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے بلکہ اپنی نظموں اور نثر' اپنے خطوں اور تحریروں کے ذریعے انھوں نے اُردو کی بھی خدمت کی ۔

قطب شاہی عہد کے شعرا وجہی، غواصی، ابن نشاطی، فیروز اور محمود کا کلام جس طرح دکنی اردو میں اپنی آب و تاب رکھتا ہے۔ آصف جاہی دور کے ہندو مسلم شاعروں اور ادیبوں نے اس روایت کو برقرار رکھا اور آج بھی اردو زبان ان شاعروں کی احسان مند ہے۔ ولی دکنی سے لے کر امیر مینائی اور داغ سے لے کر جلیل تک اور پھر آصف جاہ اول سے آخری تاج دارِ دکن میر عثمان علی خاں عثمان نے اردو زبان و شاعری کو بام عروج پر پہونچا دیا۔

زمانے کے اونچ نیچ نے دکن کے تخت و تاج کو تاراج کر دیا۔ لیکن دکنی کلچر جس پر ہندو مسلمانوں کی سوجھ بوجھ، محبت، یگانگت، بھائی چارہ اور یک جہتی کی گہری چھاپ اور آمیزش تھی، آج بھی دکن میں باقی ہے۔

سبھی مانتے ہیں کہ دکن کی تہذیب و تمدن میں ایک رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا۔ دکن تہذیب کا گہوارہ تھا۔ دہلی اور لکھنو کے اجڑنے کے بعد شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں نے حیدرآباد دکن کو اپنا مسکن بنایا۔ یہ بیرونی شعرا اور فن کار اپنے ساتھ لکھنو اور دہلی کی تہذیب لے آئے اور اس پر حیدرآبادی تہذیب کا رنگ چڑھا تو اس میں چار چاند لگ گئے۔

سب کی عام زبان اردو ہی تھی اور آج بھی اردو ہی ہے جو ایک شیریں اور مہذب زبان ہے اور اردو شاعری یہاں کا طرۂ امتیاز ہے گویا حیدرآباد کی تہذیب اردو تہذیب ہی کا دوسرا نام ہے۔

دکنی رواداری

دکن میں صدیوں سے مسلمان بادشاہوں نے حکمرانی کی ہے۔ عادل شاہی بادشاہوں کے عدل و انصاف اور بریدشاہوں کے حسنِ سلوک سے کسی کو انکار نہیں۔ بہمنی تاج داروں کی رواداری اس سلطنت کے بادشاہ حسن گنگو بہمنی کے لقب ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ قطب شاہی عہدِ حکومت میں نہ صرف اکنّا مادنّا بادشاہ کے بہت قریب تھے بلکہ ہندو خواتین شہزادوں کے محل کی زینت بنی ہوئی تھیں۔

دولتِ آصفیہ کی رواداری بے مثل رہی ہے۔ مساوات کا جو برتاؤ آصف جاہی حکومت نے برتا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہاں ہر کسی کو مذہبی آزادی تھی مسجد، مندر گردوارے، کلیسا، آتش کدہ سبھی کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جہاں صدائے ناقوس بلند ہوتی وہیں اذان بھی سنائی دیتی۔ آتش کدوں میں آگ دہکتی اور گرجاؤں میں گھنٹے بجتے۔

حیدرآباد میں جہاں ایک طرف پائیگاہوں، نوابوں کے خاندان امرائے تزک و احتشام کے ساتھ رہتے تھے تو دوسری طرف چھتریوں، برہمنوں اور کائستوں کے خاندان باسطوت زندگی گزارتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے والی بھی آصف جاہی امرا میں داخل تھے اور جاگیریں اور مناصب حاصل کرتے تھے۔ پارسیوں، عیسائیوں اور سکھوں بلکہ بعض انگریزوں اور فرانسیسیوں کو بھی پشت ہا پشت سے مناصب ملتے رہے ہیں۔

محکمہ امورِ مذہبی کا بنیادی مقصد ہی مختلف فرقوں اور طبقوں کی مذہبی اور روحانی ترقی کے لیے سہولتیں پہنچانا تھا۔ ایسے قاعدے قانون مرتب کیے گئے تھے کہ کسی کے مذہبی جذبات نہ بھڑکیں اور مملکت میں ہر طرف صلح و آشتی کا ماحول بنا رہے۔ آصف جاہ اوّل نے ملکی معاملات میں بھی ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ مساویانہ مواقع دیے۔ بے تعصبی اور رواداری کی جو مثال انھوں نے قائم کی اس کا پرتو ۲۰ ویں صدی کے اختتام تک نظر آتا ہے۔

دورِ عثمانی میں حیدرآباد میں ۲۷ مساجد، ۱۰ عاشور خانے، ۱۲ الاوے، ۲۷ درگاہیں، ۱۳ تکیے، ۲۱ دیول، ۱۲ مٹھ، ۲ گردوارے، ۱۱ کلیسائیں اور ۴ آتش کدے تھے۔

آصف جاہی حکومت کی بنیاد

وقت کی گھڑی کو ذرا پیچھے کرکے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جب بادشاہ محمد تغلق نے انتقال کیا تو دو ہندو بھائیوں نے وجیانگر سلطنت کی بنیاد رکھی۔ محمد تغلق کے صوبے دار ظفر خاں نے اسی دوران ایک مسلم سلطنت قائم کی اور علاؤالدین حسن گنگو بہمنی کا لقب اختیار کرکے اپنی سلطنت کو "بہمنی سلطنت" کا نام دیا اور دولت آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔

بہمنی خاندان کے نویں بادشاہ احمد شاہ نے بیدر کو اپنا پایۂ تخت منتخب کیا۔ اس کے عہد میں بہمنی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ محمد شاہ کے زمانے میں بیدر کا وزیر محمود گاواں تھا جس نے بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دور دور سے عالموں کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ محمود کی شہرت نے اس کے دشمن بھی پیدا کردیے جنھوں نے آخرکار اسے قتل کروادیا۔ یہیں سے بہمنی سلطنت کا خاتمہ اور پانچ نئی سلطنتوں کا آغاز ہوتا ہے۔

۱. بیجاپور میں عادل شاہی سلطنت

۲. احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت

۳. برار میں عماد شاہی سلطنت

۴۔ گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت

۵۔ بیدر میں برید شاہی سلطنت

لیکن جب احمد نگر کی سلطنت نے برار کی سلطنت پر اور بیجاپور کی سلطنت نے بیدر کی سلطنت پر تسلط جمالیا تو صرف تین سلطنتیں باقی رہ گئیں یعنی

۱۔ احمد نگر ۲۔ بیجاپور اور ۳۔ گولکنڈہ کی سلطنت

تاریخ بتاتی ہے کہ ان تین سلطنتوں اور وجیانگر کی سلطنت میں برابر کشمکش اور کشاکش چلتی رہی۔ ویسے یہ زمانہ دکن کی تاریخ میں علم و ادب کی ترقی کے لحاظ سے شاندار زمانہ تھا اور ان سلطنتوں کے بادشاہوں نے ہر طرح سے علم و ادب کی سرپرستی کی۔

مغلوں نے ۱۶ ویں صدی میں دکن پر حملے شروع کیے۔

اکبر اعظم نے احمد نگر پر حملہ کیا تو قلی قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ کی بہن چاند سلطانہ نے جو عادل شاہی خاندان میں بیاہی گئی تھی، بڑی بہادری سے ان مغل فوجوں کا مقابلہ کیا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب نے بھی دکن پر حملے کیے بعد دیگرے کیے۔ چاند سلطانہ کے بعد ملک عنبر نے بیجاپور کی سلطنت کی مدافعت کی اور کھرکی یا کوکی کی بنیاد رکھی۔ جب اورنگ زیب نے دکن پر حملہ کیا تو کھرکی کا نام بدل کر اپنے نام پر اورنگ آباد رکھ دیا۔ گولکنڈے کے بادشاہ محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کی جائے رہائش چچلم پر جو گولکنڈے سے کچھ میل دور واقع تھا ۱۵۹۱ء میں ایک نیا شہر بسایا اور اپنی محبوبہ کے نام پر پہلے بھاگ نگر اور پھر حیدر آباد کا نام دیا[1]

۱۔ بھاگ متی جب محمد قلی قطب شاہ کی رانی بنی تو "حیدر محل" کہلائی اور اسی مناسبت سے

سلسلہ اگلے صفحہ پر ....

۱۶۵۸ء میں عہدِ شاہجہانی میں خواجہ عابد قلی خان سمرقند و بخارا سے ہندوستان آئے ۔ جدِ امجد عبدالرحمٰن شیخ عزیزاں صاحبِ ارشاد تھے اور زہد و تقویٰ کے لیے مشہور تھے ۔ ایک بلند پایہ عالم تھے جو شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد سے تھے ۔ شیخ سہروردی خاندانِ آصفیہ کے بزرگوں میں سے تھے ۔ حضرت خواجہ اسمٰعیل اپنے زمانے کے ممتاز عالم اور زاہد تھے اور اولیاءُ اللہ میں ان کا شمار ہوتا تھا ۔ یہ جلیل القدر عالی النسل قریشی خاندان سنو سال تک سمرقند و بخارا میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا اور مذہبی پیشوا مانا جاتا تھا ۔ عبدالرحمٰن شیخ عزیزاں کے پوتے عالم شیخ والیِ بخارا کے ہم عصر تھے اور سمرقند کے علما میں ممتاز درجہ رکھتے تھے ۔

عالم شیخ کے دو بیٹے تھے ۔ ۱ ۔ خواجہ بہاء الدین خاں

۲ ۔ خواجہ عابد علی محمد قلی خان

خواجہ بہاؤالدین کے بیٹے محمد امین خان سمرقند سے ہندوستان آئے ، اور اورنگ زیب نے ان کو صدارتِ کل کے عہدے پر مامور کیا ۔ محمد شاہ کے دور میں وہ عہدۂ وزارت پر مقرر ہوئے اور " وزیر الملک اعتماد الدولہ " کا خطاب پایا [1]

محمد امین کے دو بیٹے تھے ۱ ۔ محمد فاضل ۲ ۔ معین الملک

بقیہ حاشیہ ص ۳۵ سے ... حیدر آباد کا نام تجویز ہوا ۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علی حیدر کرار کے نام سے حیدر آباد کو موسوم کیا ۔ سلطنتِ گولکنڈہ کے زوال پر آصف جاہی شاہی محل نے حیدر آباد کے افق پر سنہری اور تابندہ حروف میں اپنا نام لکھ دیا جس کی ضیا پاشیاں ۱۹۴۸ء تک مطلع منور کرتی رہیں

[1] سید مراد علی طالع ۔ نظام الملک آصف جاہ ص ۱۵

محمّد فاضل نے سلاطینِ مغلیہ کے دربار میں جگہ پائی اور معین الملک پنجاب کے صوبہ دار بنائے گئے جنھوں نے لاہور میں احمد شاہ درّانی کو شکست دی تھی ۔

عالم شیخ کے دوسرے بیٹے خواجہ عابد محمد قلی خان اپنے خاندانی علم و فضل دیانت داری کی وجہ سے عزّت و احترام کے ساتھ دربارِ شاہجہانی میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے ۔ پانچ ہزار روپیہ اور خلعت عطا ہوا اور شاہ جہاں کے ذاتی اسٹاف میں ان کو ایک معزز عہدہ دیا گیا ۔

شاہجہاں کی وفات کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے انھیں ۱۶۶۰ء میں اپنے وزرا میں شامل کیا اور ۱۶۶۶ء میں وہ اجمیر کے صوبہ دار مقرر ہوئے خواجہ عابد، عالم و فاضل ہونے کے علاوہ بہترین سپاہی، بہترین جج، بہترین گورنر اور مدبّر بھی تھے ۔ ۱۶۷۹ء میں ملتان کے گورنر بنائے گئے ۔ انھوں نے سولہ سال مغلیہ سلطنت کی شان دار خدمات انجام دیں اور ۱۶۷۴ء میں حجِ بیت اللہ کے لیے مکّہ معظمہ تشریف لے گئے جہاں سے واپسی پر اورنگ زیب نے انھیں "قلیج خان" کا خطاب عطا کیا اور ۱۶۸۱ء میں اپنا وزیرِ اعظم منتخب کیا ۔ ۱۶۸۲ء میں شہزادہ اعظم شاہ کے ساتھ دکن گئے جہاں ان کی اور ان کے خاندان کے عروج کا آغاز ہوا اور دکن میں دولتِ آصفیہ کی بنیاد پڑی ۔

نواب میر قمر الدین علی خان نظام الملک آصف جاہ اوّل کے دادا یہی عابد قلی خان بن عالم شیخ بن الہ داد بن عبدالرحمٰن شیخ عزیزاں تھے ۔

۱۶۸۷ء میں دورانِ محاصرۂ گولکنڈہ خواجہ عابد محمد قلی خان جب فوج کے کی کمانداری کر رہے تھے، قلعہ سے ایک گولہ آ گرا جس سے ان کا دایاں بازو

کٹ گیا۔ زخم شدید تھا لیکن عالی ہمت خواجہ نے ضبطِ نفس کا اظہار کیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو عمدۃ الملک اسد خان کو مزاج پرسی کے لیے بھیجا گیا۔ جرّاح ٹوٹے ہوئے بازو کو جسم سے الگ کر رہے تھے۔ زخم مہلک تھا۔ جاں بر نہ ہو سکے۔ گولکنڈے کے قریب پیوندِ خاک ہوئے اور دکن کی سرزمین سلطنتِ آصفیہ کے استقبال اور شاہانِ آصف جاہی کو سرخ رو اور کامگار کرنے کے لیے چشم براہ ہو گئی۔ یہی عالی ہمت عابد محمد قلیچ خان کو تاریخی حیثیت سے دولتِ آصفیہ کا مورثِ اوّل گردانا جاتا ہے[1]

خواجہ عابد محمد قلیچ خان کے فرزند میر شہاب الدین اپنے جلیل القدر باپ کے انتقال کے بعد ان کے تمام اعزازات کے وارث ہو کر اورنگ زیب کے دربار میں خدمات انجام دیتے رہے اور اس قدر اثر و رسوخ پایا کہ "فرزندِ دلبند" کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ ان ہی کو ۱۶۹۵ء میں اپنی بہادری کے لیے بادشاہ نے غازی الدین خان فیروز جنگ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

۱۶۷۱ء کے شروع میں ان کی شادی شاہجہاں کے وزیرِ اعظم نواب سعد اللہ خاں کی صاحبزادی سعید النسا بیگم سے ہوئی تھی اور اسی سال نواب قمر الدین علی خان پیدا ہوئے جو آصف جاہِ اوّل کے نام سے مشہور ہوئے[2]۔

غازی الدین خاں فیروز جنگ نے اپنی بہادری اور وفاداری سے مغل خاندان کی ہر نازک موقع پر مدد کی۔ جو کچھ انھیں بادشاہ کی جانب سے عنایت ہوتا وہ اپنے

۱۔ یعقوب علی عرفانی ۔ حیاتِ عثمانی
۲۔ سید مراد علی طالع ۔ نظام الملک آصف جاہ

شاہ اور ملک کی خدمت میں صرف کر دیتے تھے ۔ مختلف بغاوتوں کو کامیابی سے سر کیا اور جدھر کا رُخ کرتے اپنی اطاعت منواتے چلے جاتے ۔ غرض انھوں نے اس خاندانِ تیموریہ کی ہر وقت عزت بچائی ۔ ۱۷۰۵ء میں انھیں برار کا صوبہ دار مقرر کیا گیا ۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد تخت نشینی کا جھگڑا ہوا اور شہزادہ معظم کی جیت اور شہزادہ اعظم کی ہار ہوئی تو بہادر شاہ کے لقب سے شہزادہ معظم تخت نشین ہوا اور فیروز جنگ کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا اور انتقال تک وہ اسی عہدے پر قائم رہے ۔
۱۷۱۰ء میں احمد آباد میں وفات پائی ۔[۱]

ریاست حیدر آباد کے والی نواب میر قمر الدین علی خاں نظام الملک آصف جاہ اوّل ان ہی غازی الدین خاں فیروز جنگ کے فرزند تھے جنھیں اورنگ زیب نے " چین قلیچ خاں " کے خطاب سے نوازا اور منصب پنج ہزاری سے سرفراز کیا ۔ ۱۷۰۱ء میں کرناٹک کے فوجدار مقرر ہوئے ۔ ۱۷۰۳ء میں بیجاپور کی صوبہ داری عطا کی گئی ۔ اورنگ زیب کی وفات پر ان کے شہزادوں، شہزادہ اعظم اور شہزادہ معظم میں تخت نشینی کی جنگ چھڑی تو چین قلیچ خاں اور فیروز جنگ نے شہزادہ اعظم کی رفاقت کا فیصلہ کیا شہزادہ اعظم کو فتح ہوئی ۔ اور چین قلیچ خاں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا منصب ششش ہزاری کر دیا — اور " خانِ دوراں " کا خطاب دے کر برہان پور کی صوبہ داری عطا کی لیکن دوبارہ

---

۱. حیاتِ عثمانی
مرتبہ دکنی ۔ ادارہ ادبیاتِ اردو

دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی اور شہزادہ معظم کو شہنشاہ بنایا گیا جو بہادر شاہ کے لقب سے بادشاہ بنا۔ نظام الملک کے نام اودھ کی صوبہ داری لکھی گئی اور لکھنو کی فوجداری بھی عطا کی گئی[1]

فرخ سیر نے انھیں "نظام الملک بہادر فتح جنگ" کے خطاب اور منصب ہفت ہزاری سے سرفراز کیا اور دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا اور کرناٹک کا فوجدار مقرر کیا۔ یہیں سے سلطنت آصفیہ کی بنیاد پڑتی ہے[2]

محمد شاہ کے عہد میں بادشاہ نے مالوہ کی صوبہ داری اور دکن کی صوبہ داری کو بحال رکھا اور وزیر سلطنت بنا دیا[3]

کچھ عرصہ دہلی میں رہ کر وہ دکن روانہ ہوئے۔ جہاں مرہٹوں کی شورش برپا تھی۔ مبارز خان کی بغاوت کو فرو کر کے وہ پھر دہلی آئے۔ یہاں حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ آصف جاہ نے تیموری سلطنت کو زوال سے بچانے کی کوشش کی جس کے اعتراف میں مغل بادشاہ نے انھیں ایک ہاتھی اور جواہرات مرحمت کیے اور "آصف جاہ" کا خطاب عنایت کیا۔ نادری حملوں کے دوران اپنی بردباری اور سمجھ بوجھ سے انھوں نے قتل عام بند کروایا۔ دکن کی واپسی پر احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملے کی اطلاع ملی تو انھوں نے برہان پور کا عزم کیا۔ ابدالی کا حملہ ہوا اور اس نے آصف جاہ

۱۔ حیاتِ عثمانی ص ص ۱۹ تا ۲۱

۲۔ تذکرہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری، مرقعِ دکن

۳۔ حیاتِ عثمانی ص ص ۵۰، ۵۱

کو منصب وزارت پیش کیا جسے آپ نے قبول نہیں کیا ۔ وہیں بیمار رہے اور ۱۹ جون ۱۷۴۸ء کو انتقال کیا ۔ سید برہان الدین کے روضہ میں دفن ہوئے ۔ بیالیس سال تک انھوں نے دکن میں نظم و نسق قائم رکھتے ہوئے حکومت کی ۔ انتقال کے وقت دکن کے بیش تر علاقے ان کی سلطنت میں شامل تھے[۱]۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر راجگان بھوسلہ آصف جاہ سے مال گزاری حاصل کرتے رہے لیکن برار کا صوبہ سلطنت آصفیہ کے قبضہ میں ہی رہا ۔ ۱۸۰۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے برار پر آصف جاہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا[۲]۔

آصف جاہ اوّل کے انتقال کے بعد ان کے دوسرے صاحبزادے ناصر جنگ تخت نشین ہوئے ۔ آصف جاہ نے دولت آصفیہ کی حفاظت کی خاطر اپنے نواسے مظفر جنگ کو بالا گھاٹ کا ناظم اور بیجاپور کا صوبہ دار بنا دیا اور سراج الدولہ نواب انور الدین خاں کو کرناٹک کا ناظم مقرر کیا ۔ رائچور اور ادھونی کے علاقے اپنے فرزند نواب بسالت جنگ کو جاگیر میں عطا کیے تھے[۳]۔

ہدایت محی الدین نواب مظفر جنگ تخت و تاج کی ہوس میں اپنے ماموں

۱۔ حیاتِ عثمانی ص ص ۵۰ ، ۵۱

۲۔ آصف جاہ کی شادی گلبرگہ کی سیدانی سیدۃ النسا بیگم سے ہوئی جن کی بیاری اولادیں ہوئیں ۔ ان کے بڑے فرزند محمد شاہ غازی الدین کو محمد شاہ نے میر بخشی اور احمد شاہ نے امیر الامرا کے عہدے سے نوازا تھا ۔ دوسرے ، تیسرے اور چوتھے فرزندان میر احمد خان ناصر جنگ ، میر محمد خان صلابت جنگ اور نظام علی خان نظام الملک ثانی تھے جو آصف جاہ کے بعد دکن میں حکومت کرتے رہے ۔ پانچویں فرزند محمد شریف خان شجاع الملک بسالت جاہ کو رائچور کی صوبہ داری اور چھٹے فرزند میر مغل علی خان ہمایوں جاہ کو بیجاپور کی صوبہ داری عطا ہوئی ۔ (حیاتِ عثمانی و مرقع دکن)

۳۔ حیاتِ عثمانی ص ۵۰

ناصر جنگ شہید کے خلاف فرانسیسوں سے مل کر جنگ کرتے رہے۔ فرانسیسی اور انگریز یورپ کی یہ دو بڑی قومیں اس وقت دکن میں زور آزمائی کر رہی تھیں اور اپنا اقتدار قائم کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ انگریزوں نے ناصر جنگ اور فرانسیسوں نے مظفر جنگ کی طرفداری کی۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب نے کرناٹک پر حملہ کر دیا۔ انورالدین خان مارا گیا۔ اس فتنے کی سرکوبی کے لیے ناصر جنگ بہ نفسِ نفیس ایک لشکر لے کر نکل پڑے۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب کی متحدہ فوج کا سپہ سالار فرانسیسی جنرل ڈوپلے تھا۔ لڑائی سے قبل ان دونوں میں پھوٹ پڑی۔ چندا صاحب فرانسیسی افسروں سے مل کر پانڈی چری چلا گیا اور مظفر جنگ اکیلے رہ گئے۔ ماموں نے بھانجے کو معاف کر کے اپنی فیاضی اور عفو کاری کا مظاہرہ کیا۔ لیکن چند افغان غداروں نے فرانسیسوں سے مل کر انھیں شب خون پر آمادہ کیا۔ آخر کار ہمت خان نواب کرنول اور اس کے رفیقوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے (۱۷۵۰ء) اور فرانسیسوں نے مظفر جنگ کی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ مگر دو ماہ بعد کڑپہ کے افغان نواب نے مظفر جنگ کی فوج پر حملہ کر دیا۔ بدلے کی آگ نے مظفر جنگ اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑا [۱]۔ فرانسیسوں نے فوراً ناصر جنگ کے بھائی صلابت جنگ کی نوابی کا اعلان کر دیا۔

یہ خبر جب دہلی پہنچی تو آصف جاہ اوّل کے بڑے بیٹے غازی الدین بہادر فیروز جنگ ثانی دکن کی صوبہ داری کا فرمان لے کر دکن پہنچے۔ صلابت جنگ اور

۱۔ حیاتِ عثمانی ص ص ۶۲ تا ۶۸

فرانسیسوں نے اپنے لیے خطرہ محسوس کیا اور اورنگ آباد کے مقام پر انھیں روکنے کے لیے چلے لیکن فیروز جنگ ثانی نے مرہٹہ پیشوا سے معاہدہ کرلیا جس کی رُو سے بالاجی راؤ نے اورنگ آباد پر حملہ کردیا۔ صلابت جنگ اور فرانسیسی کمانڈر نے پیشوا کا مقابلہ کیا۔ جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر کار پانچ مہینے بعد صلح ہوگئی۔ غازی الدّین فیروز جنگ ثانی بہر حال اورنگ آباد پہنچ گئے لیکن وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

اسی کے بعد انگریزی اقتدار کا آغاز ہوا اور فرانسیسی اقتدار زوال پذیر ہونے لگا۔ اسی دوران نواب نظام علی خان نظام الملک ثانی صلابت جنگ کے چھوٹے بھائی نے حیدرآباد پر حملہ کردیا۔ اور دولتِ آصفیہ کے آبائی تخت و تاج کی حفاظت کی خاطر انھوں نے نااہل صلابت جنگ کو معزول کرکے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی اور یہی حقیقی معنوں میں دولتِ آصفیہ کے بانی کہلانے کے مستحق ٹھیرے اور آصف جاہ ثانی کہلائے۔ نظام علی خان آصف جاہ اوّل کے چوتھے صاحبزادے تھے۔ ۱۷۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی دور اندیشی اور فراست اور جرأت نے سلطنتِ آصفیہ کو فنا ہونے سے بچالیا۔ یہ زمانہ دکن کے لیے بہت نازک تھا۔ میسور میں ٹیپو سلطان، شمال میں مرہٹے، اڑلیہ اور کرناٹک میں انگریز اور فرانسیسی سب اپنی قسمت آزمائی کررہے تھے۔ ہر طرف انتشار اور قتل و غارت گری کا دور دورہ تھا۔ میر نظام علی خان نے تدبّر و حکمت سے کام لے کر پونا پر حملہ کردیا۔ مرہٹہ سردار نے بہت بڑا علاقہ دے کر نظام سے صلح کرلی۔ (۱۷۶۲ء)

۱۷۶۵ء میں دہلی دربار نے شمالی سرکار کا علاقہ انگریزوں کو دے دیا اور دکن بھیج دیا اور یوں دکن کا ایک قیمتی حصہ دولت آصفیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میر نظام علی خان نے کوشش کی کہ اس علاقے کو واپس لے لیں۔ چنانچہ ۱۷۶۶ء میں حملہ کی تیاری لیکن انگریزوں نے حکومت مدراس کی طرف سے وفد بھجوایا اور صلح کی پیش کش کی جس کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور دولت آصفیہ کے درمیان ایک معاہدہ ۱۲ نومبر ۱۷۶۶ء کو ہوا جس کے رو سے ایلور، راج مندری، سکاکول، مصطفےٰ نگر اور مرتضیٰ نگر کے علاقے انگریزوں کے حوالے کیے گئے جس کے معاوضے میں کمپنی نے فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا[1] لیکن کمپنی نے عہدنامے کی شرائط کی پابندی نہیں کی۔ نہ خراج کی رقم ادا کی نہ فوجی امداد دی۔ اسی طرح دوسرے معاہدے ۱۷۶۸ء کی رو سے کمپنی نے نظام کو ۷ لاکھ سالانہ خراج دینا منظور کیا اور اس کے بدلے میں کمپنی کو بالاگھاٹ کرناٹک کی تسخیر میں مدد دینے کا وعدہ کیا[2] لیکن انگریزوں نے اس کی بھی خلاف ورزی کی۔

اپنی ۳۵ سالہ حکومت میں نظام علی خان۔ فسادوں اور بغاوتوں کو ختم کرنے میں مصروف رہے۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے امدادی فوج کے ذریعے شیرِ میسور سلطان ٹیپو والیٔ میسور کو شہید کیا۔ میسور کی ریاست سابق راجاؤں کے حوالے کرکے باقی علاقے کو نظام کے ساتھ تقسیم کر لیا۔ اس طرح

۱۔ حیاتِ عثمانی ص ۸۲

۲۔ تاریخِ برگس ج ۱ ص ۷۱

نظام علی خان کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے اپنا اقتدار مضبوط تر کرلیا۔ مختلف سیاسی چالوں کا نظام علی خان نے حتی المقدور مقابلہ کیا اور سلجھایا آخر دولتِ آصفیہ کا یہ معمار ۷ اگسٹ ۱۸۰۲ء میں دنیا سے رخصت ہوگیا[۱]

نواب میر اکبر علی خان سکندر جاہ کا دورِ حکومت افراتفری اور سیاسی پیچیدگیوں کا دور تھا وہ میر نظام علی خان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے دور کا اہم واقعہ مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ ہے جس میں سکندر جاہ نے انگریزوں کی مدد کی اور جس کے معاوضے میں دولت آباد کے علاقے واپس کردیے گئے۔ لیکن مہاراجہ چندو لال پیش کار کے ہاتھ مضبوط ہوگئے اور ۲۰ سال تک ریاست میں انہی کا عمل دخل رہا۔ رزیڈنٹ رسل کی ریاستی اور فوجی معاملات میں مداخلت انگریزوں سے چندو لال کی رفاقت اور پامیر کمپنی سے سودی قرضے کا لین دین یہ وہ حالات تھے جن کے سبب ریاست حیدرآباد کی مالی اور انتظامی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور ریاست کے خزانے پر بہت بار پڑتا رہا۔

سکندرآباد کا شہر انہی کی یادگار ہے۔ ۲۱ مئی ۱۸۹۲ء کو سکندر جاہ نے وفات پائی[۲]

نواب میر فرخندہ علی خان بہادر نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع جو سکندر جاہ کے بڑے بیٹے تھے تخت نشین ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام فضیلت النساء

۱۔ حیاتِ عثمانی ص ص ۹۱ تا ۹۳

۲۔ مرقعِ دکن و حیاتِ عثمانی

بیگم چاندنی بیگم تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے ملکی انتظامات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ رزیڈنسی کے اثرات کو کم کیا اور مہاراجہ چندو لال کو مستعفی کر دیا جب انگریز گورنر جنرل ڈلہوزی نے بڑھتے ہوئے قرضے کے معاوضے اور فوجی اخراجات کے لیے چند اضلاع انگریزوں کے حوالے کیے جانے کا مطالبہ کیا تو ۱۸۵۳ء کے معاہدے کی رو سے رائچور کا دوآبہ اور برار کا علاقہ عارضی ٹھیکے پر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ ملک کے حصے بخرے ہو گئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی زمینات سرمایہ داروں اور عرب جمعداروں کے پاس رہن رکھی تھیں۔ مدار المہام میر تراب علی خاں سالار جنگ اوّل نے علاقوں کو بحال کروایا۔ ۲۸ سال حکومت کرنے کے بعد ناصر الدّولہ نے انتقال فرمایا اور صحنِ مکہ مسجد کے شاہی قبرستان میں دفن ہوئے۔

نواب میر تہنیت علی خان بہادر افضل الدّولہ نواب ناصر الدّولہ کے بڑے بیٹے تھے۔ حویلی قدیم[1] میں پیدا ہوئے۔ ماں کا نام حضرت دلاور النسا بیگم تھا۔ ۱۸۵۷ء میں شمالی ہند میں غدر کی آگ پھیلی تھی۔ ہندوستانی افواج انگریزوں کے ساتھ سرکشی پر اُتر آئی تھیں۔ افضل الدولہ بہادر نے ایسے نازک وقت میں نہ صرف حیدرآباد بلکہ جنوبی ہند میں غدر اور بغاوت کے شعلوں کو بھڑکنے سے بچا لیا اور انگریزوں کی اعانت کی۔ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمے پر ہندوستان کی حکومت شہنشاہ انگلستان کے ہاتھ میں آئی تو افضل الدّولہ کی خدمات کے اعتراف میں شورا پور اور رائچور کا دوآبہ حیدرآباد کو واپس کر دیا گیا اور ۵۰ لاکھ کا قرض بھی معاف کر دیا۔ اس عہد سے ہی حیدرآباد

۱۔ آصف جاہی خاندان کا شاہی محل

جدید کا آغاز ہوا ۔ وزیر سالار جنگ اوّل سلطنت کی اصلاح اور ترقی میں منہمک ہو گئے ۔ کئی عمارتیں جیسے افضل گنج، افضل گنج کا پُل، مسجد افضل گنج اور چو محلہ پیلس اسی عہد کی یادگار ہیں ۔ افضل الدّولہ نے بارہ ۱۲ برس حکومت کی لیکن حکومتِ آصفیہ کے موجودہ نظام حکومت کا آغاز اسی عہد میں ہوا تھا ۔ ملک کی پیمائش کے بعد مال گزاری مقرر ہوئی اور ملک کو ۵ صوبوں، ۱۷ ضلعوں اور بہت سے تعلقوں میں تقسیم کیا گیا ۔ صوبہ دار، تعلقدار اور تحصیلدار مقرر ہوئے ۔ سررشتۂ عدالت اور پولیس کی تنظیم عمل میں آئی اور نیا سکّہ جاری ہوا ۔ علمی اور مادّی ترقی کے لیے تعلیم، طبابت اور تعمیرات کے محکمے قائم ہوئے ۔ اضلاع میں مدارس قائم کیے گئے اور شہر حیدرآباد میں دارالعلوم اور مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا ۔ اس طرح ریاست حیدرآباد ایک بار پھر امن و اتفاق کا مسکن بن گیا ۔ ۱۸۶۱ء میں گورنر جنرل نے آپ کی خدمت میں دس ہزار پونڈ کے تحائف پیش کیے اور ملکہ وکٹوریہ نے آپ کو جی. سی ۔ ایس. آئی کا خطاب بھی دیا ۔[1]

۱۸۶۹ء میں افضل الدّولہ کے بیٹے نواب میر محبوب علی خان ۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے ۔ والدہ کا نام واحد النساء بیگم ۔ کم عمر شہزادے کی اعانت کے لیے نواب سالار جنگ اوّل اور نواب شمس الامراء مقرر ہوئے تاکہ حکومت کے کاروبار سنبھال سکیں ۔ سالار جنگ نے برار کی واپسی کا مسئلہ اٹھایا اور انگلستان گئے ۔ ۱۸۷۷ء میں انھوں نے نوعمر بادشاہ کے ساتھ دہلی میں دربار میں شرکت کی ۔ ۱۸۸۳ء میں سالار جنگ جیسے وفادار اور مدبّر

---

۱ ۔ مرقّعِ دکن اور حیاتِ عثمانی

وزیر کا انتقال ہو گیا۔ سالار جنگ اوّل نے ناصر الدّولہ، افضل الدّولہ اور میر محبوب علی خان تینوں بادشاہوں کے زمانے میں ۳۰ سال تک وفاداری سے اپنے فرائض نبھائے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سالار جنگ ثانی، سر وقار الامرا اور مہاراجہ کشن پرشاد ایک کے بعد ایک مدار المہام مقرر ہوئے۔

میر محبوب علی خان کے زمانے میں انگریزوں سے دوستانہ تعلقات زیادہ استوار ہوئے۔ ہر وائسرائے حیدر آباد آتا رہا۔ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے حیدر آباد آ کر برار کے دوامی پٹے کا مطالبہ کیا اور نظام سادس کے دستخط بھی لے لیے جس کی رُو سے برار تو نظام ہی کے پاس رہے گا لیکن اس پر قبضہ انگریزی حکومت کا ہوگا۔ اور نظام کو اس کے عوض ۲۵ لاکھ سالانہ کی رقم دی جائے گی۔

محبوب علی خاں کے عہد میں بہت سی سیاسی اصلاحیں ہوئی۔ سکۂ محبوبیہ جاری ہوا۔ کیبنیٹ کونسل اور لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ شفاخانے اور ٹاؤن ہال اور مدارس قائم ہوئے۔ مختلف محکموں کی اصلاح ہوئی اور ان کی ترقیات کے ضمن میں مختلف اسکیمیں بنیں۔ ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی میں ہزاروں جانیں گئیں لاکھوں بے سہارا ہوئے۔ اس وقت نظام سادس نے اپنی رعایا کی عدیم المثال مدد فرمائی۔ شاہی محلات مصیبت زدوں کے لیے کھول دیئے گئے تاکہ وہاں وہ پناہ لے سکیں۔ کھانے کپڑوں کے لیے لنگر خانے بٹھائے دفاتر کو ۱۰ دن تعطیل دی گئی۔ ملازمین کو پیشگی تنخواہیں جاری کیں اور خزانۂ ریاست

سے ۵ لاکھ روپیے عنایت کیے کہ تباہ شدہ لوگوں کی اصلاح ہو سکے۔

بادشاہ فلک نما میں مقیم تھے۔ رمضان کے مہینے میں دفعتاً آپ پر غشی طاری ہوئی۔ حالت خراب ہوتی گئی۔ حکماء اور ڈاکٹر بلائے گئے لیکن افاقہ نہیں ہوا اور یہ محبوب بادشاہ چل بسا۔ تاریخ رحلت ۱۹۱۱ء تھی[1]۔

آصف سابع میر عثمان علی خاں کا دورِ حکومت تاریخِ دکن میں عہدِ زرّین کا درجہ رکھتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں آپ تخت نشین ہوئے۔ ارکانِ سلطنت کے علاوہ رزیڈنٹ حیدرآباد نے اپنی اور برطانوی حکومت کی جانب سے مبارک باد پیش کی۔ چومحلہ پیلس میں دربارِ مسند نشینی منعقد ہوئی۔ خاندانی روایات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے حکومتِ برطانیہ کی ایسی مالی امداد کی کہ ان کی جذبۂ وفاداری سے متاثر ہو کر انھیں "ہز اگزالٹیڈ ہائنس" کے القاب کے ساتھ "یارِ وفادار سلطنت برطانیہ" کے خطاب سے نوازا گیا۔ عہدِ عثمانی میں پھر برار کا مسئلہ اٹھایا گیا۔ خط و کتابت جاری رہی۔ ۱۷۶۶ء کے معاہدہ کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے نظام سے وقتِ ضرورت فوجی امداد دینے کا جو وعدہ کیا تھا، اس کی تصدیق کی گئی۔ ۱۷۹۸ء میں رزیڈنٹ کرک پیٹرک[2] نے اس معاہدہ کی کارروائی کی اور ۶ ہزار فوج دینے کا وعدہ کیا جس کے نتیجے کے طور پر دکن میں فرانسیسی اثر ختم ہو گیا اور انگریزوں نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔

آصف جاہ سابع نے جب عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تو مختلف نزاعیں ختم ہو چکی تھیں اور حالات میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ چنانچہ اندھیرے

۱۔ مرقعِ دکن۔ حیاتِ عثمانی

۲۔ کرک پیٹرک کو حکومت سرکارِ عالی کی جانب سے حشمت جنگ کا خطاب نوازا گیا تھا۔ حشمت گنج ان کے نام سے موسوم ہے۔ میر عالم کے خاندان کی ایک رئیس لڑکی خیر النساء بیگم کے ساتھ شادی ہوئی اور اپنی بیگم کے لیے "رنگین محل" رزیڈنسی کے علاقے میں تعمیر کروایا۔

(جشنِ عثمانی سلور جوبلی آصف سابع)

دور ہو گئے تھے اور مطلع صاف تھا جس کی بنا پر سلطانِ دکن کو کارہائے نمایاں انجام دینے میں مدد ملی۔ آپ کے عہد میں علمی، اقتصادی، اخلاقی اور ادبی ترقیات ہوئیں اور حیدرآباد جدید اصولوں اور اصلاحوں کے ساتھ جنوبی ہند کی طاقتور اور مستحکم سلطنت بن کر صفحۂ ہستی پر چھا گئی۔ اس رفیع المرتبت سلطان کی اولوالعزمی، قوتِ فیصلہ، جفاکشی اور تدبر کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جاتا۔

اے شہِ عثماں علی درویش سیرت بادشاہ
سجدہ گاہِ صاحبانِ دل ہے تیری بارگاہ
تیرے ہر لب سے نکلتی ہے صدائے لا الٰہ
کج ہے تیرے فرقِ دولت پر مودّت کی کلاہ

جوشؔ ملیح آبادی

آصف جاہی سلطنت میں ادبی ماحول، تعلیمی ترقیات و اصلاحات

میر نظام علی خاں اور سکندر جاہ کا دور سیاسی الجھنوں کے باوجود علمی اور ادبی دنیا میں ترقی کرتا رہا۔ اسی دوران تاریخ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ لچھمی نارائن شفیق اور قادر خاں اس دور کے مشہور مورخ گزرے ہیں۔

اسی دور میں اردو شعرا مرزا علی لطف (مصنف گلشنِ ہند) شاہ نصیر دہلوی، حسن علی ایما، ذو الفقار علی خاں صفا حیدر آباد آئے اور دربار سے تعلق قائم کیا۔

میر محبوب علی خان تخت نشین ہوئے تو سالار جنگ اول ان کے وزیر مقرر ہوئے۔ یہ دور جدید اصلاحات کا حامل رہا۔ ملک میں جدید تعلیم کا رواج ہوا اور سرکاری مدارس کھلے۔ زمینات کا بندوبست ہوا۔ مالیات کی از سر نو تنظیم ہوئی۔ عدالتوں کا قیام عمل میں آیا اور آئین و قوانین ترتیب دیے گئے۔

جن ممتاز شخصیتوں نے ملک کے جدید نظم و نسق میں حصہ لیا۔ وہ تھے محسن الملک، سید مہدی علی خاں، وقار الملک، عماد الملک سید حسین بلگرامی، ڈاکٹر سید علی بلگرامی، مولوی چراغ علی، آغا مرزا اور خود سر سالار جنگ بہادر۔

۱۔ سلطنت ہفتہ وار ۱۹۴۵ء، رہبرِ دکن جشن سیمین نمبر ۱۳۵۷ھ، مرقعِ دکن سال گرہ نمبر۔ حیاتِ عثمانی

میر عثمان علی خان کا عہدِ حکومت دکن کا زرین دور کہلایا جاسکتا ہے۔
اسی دور میں دستوری حکومت کی بنیاد پڑی۔ ۱۹۱۹ئ میں باب حکومت قائم ہوا اور سلطنت کا انتظام اس باب حکومت کے حوالے کیا گیا۔ مختلف سررشتوں میں اصلاحات ہوئیں۔ نوجوانوں کو مادری زبان اردو کی درس گاہ "جامعہ عثمانیہ" مرحمت کی گئی۔ کروڑہا روپیوں کے خرچ سے اس جامعہ کی عمارت تیار ہوئی۔ نصاب تعلیم کے لیے سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم ہوا جسے 'دار الترجمہ' سے موسوم کیا گیا۔

اس کے علاوہ شہر میں عالی شان محل، پبلک عمارتیں، تالاب، نہریں، مدرسے، سرائے، شفاخانے، چمن، کشادہ سڑکیں اور دواخانے تعمیر ہوئے۔ عدالت العالیہ، سٹی کالج، لائبریریاں اور بے شمار ادارے قائم ہوئے۔ پینے کے پانی کے لیے عثمان ساگر اور حمایت ساگر جیسے بڑے تالاب بنائے گئے اور موسیٰ ندی کی تباہ کاریوں سے شہر کو محفوظ کیا گیا۔ عہدِ عثمانی کی تعلیمی ترقی، سررشتوں کی تنظیم، اور بہترین انتظامی طریق کار کی بدولت حیدرآباد ایک مثالی شہر بن گیا۔ عہد عثمانی کی عمارتیں عہد شاہجہاں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

شاعری کے میدان میں بھی آصف جاہی بادشاہ پیش پیش تھے۔
آصف جاہ اول فارسی کے شاعر تھے۔ حضرت بیدل کے شاگرد تھے اور شاکر تخلص کرتے تھے۔

ناصر جنگ کو شاعری کے ساتھ مصوری اور موسیقی میں کمال حاصل تھا۔

میر نظام علی خاں اور سکندر جاہ نے بھی علمی اور ادبی ماحول کے پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

میر محبوب علی خاں کے دورِ حکومت میں دہلی کے معروف شاعر حیدرآباد میں جمع ہوئے۔ میر محبوب علی خان کا تخلص آصف تھا اور وہ استاد جلیل سے اصلاح لیتے تھے۔

میر عثمان علی خان عثمان نے جلیل کی شاگردی کی اور اپنا ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا۔ کئی شعرا کی سرپرستی بھی کی اور اردو شعر و ادب کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

آصفی پرچم

آصف جاہ اوّل جنھیں مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن کا صوبہ دار
کیا تھا اور جنھوں نے آگے چل کر حیدرآباد پر اپنی خود مختاری کا اعلا
صوفی حضرت نظام الدین قطبِ دکن کے مرید تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آصف جاہ اول حضرت نظام الدین
باریابی حاصل کرتے اس وقت ان کے پاس پہنچے جب وہ کھانا کھا رہے تھے۔ حضرت
نے آصف جاہ کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنے اور کھانا کھانے پر اصرار کیا۔
آصف جاہ انکار نہ کر سکے۔

دسترخوان پر کُلچے رکھے تھے۔ حضرت نے وہی انھیں پیش کئے۔
آصف جاہ نے دو تین کُلچے کھا کر ہاتھ روک لیا۔ حضرت نے کہا جس قدر چاہے
کھالو۔ چنانچہ آصف جاہ نے ان کے اصرار پر سات کُلچے کھائے اور کہا کہ اور
نہیں کھائے جاتے۔

حضرت نے کہا" تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ تم اور تمہاری اولاد سات پیڑی
تک دکن پر حکومت کرے گی"۔

حضرت کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ ۲۲۴ سال تک آصف جاہی

بادشاہوں نے سلطنتِ حیدرآباد پر حکمرانی کی۔

میر عثمان علی خاں حیدرآباد کے ساتویں نظام تھے جنھوں نے حیدرآباد پر ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۸ء تک حکومت کی اور جدید حیدرآباد کے معمار کہلائے۔

آصفی پرچم پر اس واقعہ کی یادگار کے طور پر درمیان میں کلچے کا نشان بنایا گیا تھا۔

ایک اور روایت ہے کہ ایک بزرگ نے نظام الملک کو سات روٹیاں زرد شال میں لپیٹ کر بہ طور زادِ راہ عطا کیں اور پیشن گوئی کی کہ نظام الملک کا خاندان سات پشتوں تک دکن پر بادشاہت کرے گا۔ بعض مورخین نے بزرگ کا نام نظام الدین قطب دکن اورنگ آبادی بتایا اور بعض نے شاہ عنایت جن کا وصال ۱۷۰۶ء میں ہوا۔

حوالہ (غلیم الدین محیت - مملکت آصفیہ ص ۲۳۹)

محمد اشرف انجنیر کے بیان کے مطابق ایک بار حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے آستانے پر نظام الملک نے حاضری دی سجادہ نشین نے عام رواج کے مطابق سر پر زرد رنگ کی پگڑی باندھی جو نظامیہ رنگ ہے۔ آصف جاہ نے اعلان خود مختاری کے بعد اس زرد رنگ کو اپنے پرچم، اپنی دستار، اور عماری کے لیے مقرر کیا۔ انھوں نے عقیدت کے طور پر پرچم کا رنگ زرد رکھا اور درمیان میں روٹی کا نشان بھی بنایا جو اس کلچے کی یادگار تھا جسے انھوں نے بزرگ شاہ عنایت کے گھر تناول کیا تھا۔ پرچم پر سبز اور سفید دھاریاں بنیں اور درمیان میں دائرہ اور دائرے کے اوپر آصفی دستار جس کے اوپر العظمت اللہ لکھا ہوتا تھا۔ میر

محبوب علی خاں کے عہد میں نیچے "یا محبوب" لکھا ہوتا تھا اور میر عثمان علی خان کے دور میں "یا عثمان" لکھا ہوتا تھا۔

لیکن عبد المجید صاحب شعبۂ سیاسیات جامعہ عثمانیہ کے بیان کے بموجب درویش بزرگ کے کلچے[1] کی یاد میں سفید دائرہ نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ چاند کا عکس ظاہر کرتا تھا۔ نظام الملک کا نام قمرالدین تھا اور اسی مناسبت سے قمر یعنی چاند کی تصویر اس پر بنائی گئی تھی۔

یہ پرچم آصفی ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء تک آصف جاہی مملکت ... ۲۴ فبروری ۱۹۶۷ء تک راج پرمکھ کی حیثیت سے نظام ... کنگ کوٹھی میں کس مپرسی کی حالت میں گزاری لیکن پرچم ... دیا۔ دارِ فانی سے رخصت ہوئے تو یہی آصفی پرچم میر عثمان ... سے چمٹا ہوا تھا۔

حوالہ (عبدالجبار ملکاپوری "تذکرہ اولیا...

۱۹۴۸ء میں سلطنت حیدرآباد انڈین یونین میں ضم کرلی گئی اور نظام ہفتم کو "راج پرمکھ" کی حیثیت سے برائے نام برقرار رکھا گیا۔

یوں آصفی پرچم کی جگہ انڈین یونین کا جھنڈا لہراتا نظر آیا۔

۱۔ کلچے۔ ایک طرح کا شیرمال

حیدرآباد کا موقف تاریخِ ہند میں

ڈاکٹر آرتھر ہوپ، نیو یارک کے ناظم نے جب حیدرآباد کا دورہ کیا تھا تو اپنے صحافتی بیان میں کہا تھا "دنیا کو حیدرآباد کے متعلق مزید معلومات اور واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ ہندوستان کے افق پر درخشندہ ترین ستارہ ہے"[۱]۔ اس بیان سے ہی ہندوستان میں حیدرآباد کی اہمیت، اس کے وجود اور اس کے موقف کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کی مسلم ریاستوں میں سب سے اہم حیدرآباد، بھوپال، بھاول پور، خیر پور، رام پور اور جوناگڑھ تھیں جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد عالم وجود میں آئیں۔ حیدرآباد دکن کی سلطنت آصفیہ ان پر آشوب حالات کا نتیجہ تھی جو ۱۸ ویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہندوستان میں وقوع پذیر تھے۔ حیدرآباد کے بانی آصف جاہ اول جو سلطنت مغلیہ کے بڑے مدبر اور زبردست سپہ سالار تھے، ۱۷۲۵ء میں عملاً خود مختار ہو چکے تھے۔ کرنول سے لے کر ترچناپلی تک سارے مسلمان علاقوں نے ان کی سیادت اور اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا۔[۲]

۱۔ روزنامہ نظام گزٹ ۱۲ فبروری ۱۹۴۷ء

۲۔ روزنامہ رہبر دکن سالگرہ نمبر رجب ۵۳ھ (؟) ادیب ام ا ے ریاست ہائے ہند ص ص ۱۵ - ۱۷

خانوادۂ آصفی کے ہر حکمران نے کوشش کی کہ اس سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنادیں اور ہر مخالف کاروائیوں کا انھوں نے مقابلہ بھی کیا۔ آصف جاہ اوّل سے لے کر آصف جاہ سابع تک اس سلطنت نے ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا جو تاریخِ ہند کا نہایت ہی روشن باب رہا ہے۔ اس سلطنت نے زبردست اقتدار حاصل کرلیا تھا۔ یہاں تک کہ مغربی اقوام کو ہندوستان میں قدم جمانے اور سیاسی گٹھ جوڑ کے لیے حیدرآباد سے اتحاد اور اس کی امداد کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ وارن ہیسٹنگز اور ویلزلی کے دور میں حیدرآباد نے اس اتحاد کی گتھیوں کو آخرکار سلجھادیا تھا۔ غدر کے زمانے میں اسی سلطنت کی کوششوں نے ہوا کا رخ بدل دیا تھا جس کا اعتراف حکمرانِ ہند کرچکے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس سلطنت نے ہندوستان کی شان اور عزت بڑھائی۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی امور میں اس کی دستگیری کی۔ علمی اور ادبی میدان میں شعر و ادب میں اس چمن کے سدابہار پھول بن کر سارے ہندوستان کو مہکاتے رہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے انگریزی ماحول میں اردو کے وقار کو قائم رکھا۔ اس جامعہ کی ہندوستان کے گوشے گوشے میں ستائش کی گئی اور دور دور سے نوجوان اپنی علم کی پیاس بجھانے چلے آئے۔ مشرقی علوم کی بھی اس جامعہ نے سرپرستی کی۔ علماء و فضلا قدردانی کی نظر سے دیکھے گئے۔ شاعر اور ادیب محفلوں کو گرماتے رہے۔ ایک ایسا پُرسکون، مہذب ماحول جس میں دلوں میں محبت،

اخوت اور بھائی چارے کے جذبات جاگزیں تھے کسی زمانے کسی عہد میں تاریخ نے نہ دیکھے تھے نہ سُنے تھے جس میں قومی یک جہتی اور رواداری جلی حروف میں نمایاں نظر آتے تھے۔ حیدرآباد میں اسلامی حکومت ہونے کے باوجود غیر مسلم اقوام سے آصف جاہی بادشاہوں نے قانونی مساوات اور عدل و انصاف کا ہر دور میں لحاظ رکھا کسی نے مسلمان رعایا کو ہندو رعایا سے الگ نہیں سمجھا۔ جہاں مسجدوں کا احترام تھا وہیں منادر، آتش کدوں، گردواروں اور گرجاؤں کی حُرمت بھی ملحوظ تھی۔ درباروں میں ہندو مسلم پارسی عیسائی سکھ سبھی کو مراتب و مناصب دیے گئے تھے۔ منصف مزاج اور فرض شناس بادشاہوں نے اپنی اعلیٰ روایات سے حیدرآباد کو دارالامن بنا رکھا تھا حیدرآبادی تہذیب و تمدّن آصف جاہی عہد میں ایک امتیازی درجہ رکھتی تھی جو ہر حیدرآبادی فرد کی پہچان بن گئی تھی۔ غرض حیدرآباد نے اپنے عظیم روایات اور جاہ و حشمت کا ایک درخشاں باب تاریخِ ہند کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے مہر بند کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ حیدرآباد، مالیر کوٹلہ، پٹیالہ یا کپور تھلہ جیسی ریاست نہیں تھی بلکہ ایک عظیم مملکت تھی جو اپنے رقبے، وسائل اور آبادی کے لحاظ سے اقوام متحدہ کے رکن ممالک میں بہتوں سے مملکت کہلانے کا مستحق تھا۔ اس مملکت کا رقبہ ۸۲ ہزار مربع میل تھا یعنی انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے مجموعی رقبے سے زیادہ تھا۔ کل آبادی ایک کروڑ چھ لاکھ

کے لگ بھگ تھی۔ اس کی سالانہ آمدنی ۳۲ کروڑ کے قریب تھی۔[1]

جنوبی ہند کے دریا کرشنا اور گوداوری اس علاقے سے گزرتے تھے۔ پانی کی فراوانی تھی۔ اور اناج کے بارے میں حیدرآباد خود کفیل تھا۔ قدرتی وسائل کی فراوانی کی وجہ سے یہاں چھوٹی بڑی صنعتیں تھیں۔ سات ہزار میل سے زیادہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ سمنٹ کی صاف ستھری سڑکیں تمام ہند میں مشہور تھیں۔ ریل اور ٹرانسپورٹ کو ہندوستان بھر میں برتری حاصل تھی اور تجارتی مال کے حمل و نقل میں آسانیاں حاصل تھیں۔ دکن ایرویز کی کامیاب سروس تھی جو بمبئی، بنگلور، مدراس اور دہلی جیسے بڑے شہروں سے حیدرآباد کا فضائی رابطہ مہیا کرتی تھی۔ حیدرآباد کی اپنی ڈاک[2] اپنا مخصوص سکہ تھا[3] جو قومی زبان میں چھاپا جاتا تھا اور سکے

---

[1] عبد الرشکیب، حیدرآباد کا عروج و زوال ص ۱۰۔ مملکت آصفیہ جلد اول ص ۱۵

[2] سررشتہ ڈاک ۱۸۶۹ء میں قائم ہوا اور ۱۹۱۲ء میں ۱۳۱ ڈاک خانے مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۶۹۸ ہوگئی۔ (یادگار سلور جوبلی آصف سابع نمبر ص ۲۴۸)

[3] آثار قدیمہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ہندوستان میں دہلی کے شہنشاہوں کے سکے رائج تھے، دکن میں مختلف ٹکسالوں کے سکے مروج تھے جن کو بنانے والے مختلف ٹھیکہ دار ہوا کرتے تھے جیسے متین شاہی سکے، بہادر شاہی سکے، اکبری، عالمگیری، شاہ جہانی، سکندر جلنی، ناصر جلنی وغیرہ۔ ان کے علاوہ مختلف علامات کے سکے بھی چلتے تھے جیسے سری سکہ، طرہ، توکا، ذرکا، کمہ، چہرہ شاہی، کلمہ، ذوالفقاری وغیرہ۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد جب دہلی کی سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ ۱۹ محرم [illegible] نظام نے سکوں کا نقش بدل کر ایک رخ پر اپنا نام اور دوسرے پر ضرب فرخندہ بنیاد حیدرآباد منقوش کر دیا جس کو سکہ حالی سے موسوم کیا گیا۔ سلطان شاہی محلے میں دارالضرب قائم تھا۔ سکہ محبوبیہ کا نقش اسی طرح قائم رکھا اور عثمانیہ سکے اور نوٹ رائج ہوئے۔ عہد عثمانی کے سکے ۱۹۴۸ء کے بعد کم یاب ہوگئے اور حکومت ہند کے سکے رائج الوقت ہوئے۔ حوالہ: یادگار سلور جوبلی آصف سابع خصوصی نمبر ص ۲۱۰ - ۲۱۱

کی بڑی ٹکسال تھی۔ اس کا اپنا قومی پرچم تھا جو علاوہ سرکاری عمارتوں پر لہرانے کے مختلف قومی تہواروں پر بھی لہرایا جاتا تھا۔ حیدرآباد کی اپنی فوج تھی جو ایک آزاد مملکت کا اہم تقاضا پورا کرتی تھی ٹیلیفون اور لاسلکی کی بھی سہولتیں تھیں۔ یہ مملکتِ اسلامی تین حصوں پر مشتمل تھی۔ دیوانی کا علاقہ جو اصل ریاست کا علاقہ تھا۔ صرفِ خاص جو نظام کی ملکیت تھی اور پائیگاہ جاگیرات ہندستان کے علاقے تھے جو ہندوستان کی دوسری بڑی بڑی ریاستوں سے بھی بڑے تھے۔ وہاں ہندو مسلمانوں کی جاگیریں تھیں جن کی آمدنی ۱۵ سے ۵۰ لاکھ سالانہ تھی اس سے کم وسعت اور کم آمدنی والے علاقے دار ہندوستان میں ہزہائی نس کے لقب سے مخاطب کیے جاتے تھے۔ ہزہائی نس مہاراجہ اندور حیدرآباد کے ایک موضع کے موروثی پٹیل تھے۔ ہزہائی نس سلطانِ مکلّہ عرب کے ایک خودمختار حکمران تھے جنھیں برطانوی ہند میں سلامی دی جاتی تھی۔ لیکن حیدرآباد میں وہ فوجِ بے قاعدہ کے ایک جمعدار تھے۔ راجہ میسور اور راجہ بروڈہ حیدرآباد کے بعض مواضعات کے زمین دار تھے[1]

کہتے ہیں کہ سلطان العلوم آصف جاہ سابع کے عہد میں تعلیم کے لیے چھ ہزار مدارس تھے جن میں ۶۵ ہزار مدرس تھے۔ تعلیم کے ساتھ اخلاقی اقدار پر زور دیا جاتا تھا اور نظم و نسق کے اعتبار سے یہاں

---

[1] مشتاق احمد خاں، حیدرآباد کی اَن کہی داستان ص ص ۹، ۱۰

کا معیار برطانوی ہند سے کم نہیں تھا بلکہ بعض شعبوں میں اس سے کہیں بہتر انتظام تھا۔ عدلیہ آزاد اور خود مختار تھی۔

چنانچہ حیدرآباد کی خود مختاری کو برطانوی حکومت نے بھی تسلیم کیا تھا کہ "حیدرآباد کو اپنی ممتاز سیاسی حیثیت کی بنا پر اختیار ہوگا کہ وہ کل ہند مرکز سے علاحدہ رہے گا۔" حیدرآباد ایک خود مختار مملکت کی بنا پر تاجِ برطانیہ کا دوست رہا اور اپنی دولت اور طاقت سے دورانِ جنگ اس نے برطانوی حکومت کی مدد بھی کی جس کی ستائش میں نظام سابع کو "یارِ وفادار" اور "ہز اکزالیٹڈ ہائی نس" کا خطاب دیا گیا تھا۔

۲۷ مئی ۱۸۵۱ء کو لارڈ ڈلہوزی وائسرے ہند نے حیدرآباد دکن کو خود مختار سلطنت تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا "نظام خود مختار ہیں اور ان سے کیے ہوئے سارے معاہدات کے ذریعے ہم پابند ہیں کہ ان کی حفاظت کریں" اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو حکومتِ برطانیہ نے سلطنتِ حیدرآباد کے اقتدارِ اعلیٰ کو قانونی طور پر تسلیم بھی کر لیا تھا۔ چنانچہ جب ہندوستان سے برطانوی اقتدار برخواست ہوا تو آصف جاہ سابع نے اپنے موقف و مقام کا ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو یوں فرمان کے ذریعے اعلان کیا کہ بھارت اور پاکستان جس طرح آزاد اور خود مختار مملکتیں ہیں، حیدرآباد بھی ایک آزاد اور خود مختار مملکت ہے جو کسی بھی ڈومینین میں شرکت نہیں کرے گا۔[۱]

مشتاق احمد خان نے لکھتے ہیں کہ "جب نظام نے مملکت آصفیہ کی آزادی کا اعلان کیا تو اس وقت ان کا یہ موقف تھا کہ چوں کہ مملکتِ حیدرآباد

۱۔ مشتاق احمد خان۔ حیدرآباد کی ان کہی داستان ص ۹، ۱۰

کی رعایا ہندو مسلم دونوں طبقوں پر مشتمل ہے اس لیے مملکت اور رعایا دونوں کے مفاد اور روایتی یک جہتی کا تقاضا تھا کہ وہ بھارت اور پاکستان کسی سے بھی الحاق نہ کریں اور دونوں مملکتوں سے تعلقات استوار کرتے ہوئے ایک آزاد مملکت کی بنیاد ڈالیں۔ اس اعلانِ آزادی کے بعد انھوں نے نمائندۂ تاجِ برطانیہ کو ایک خط بھی بھیجا جس میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے برطانیہ سے اپنے تاریخی دوستانہ تعلقات اور معاہدوں کی یاد دہانی کرائی (خط مورخہ ۹ جولائی ۱۹۴۷ء) کہ ان تاریخی حقایق کے پیشِ نظر مملکتِ حیدرآباد کی حیثیت دوسری ریاستوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ انھوں نے شکایت کی کہ کیبنٹ مشن نے جو یقین دہانی کرائی تھی اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے جو سراسر زیادتی اور وعدہ خلافی ہے اور مطالبہ کیا کہ حیدرآباد کو نوآبادیاتی درجہ دیا جائے۔ اپنے اس موقف کے اظہار کے ساتھ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا گیا کہ یہ مکتوب شاہ برطانیہ کو روانہ کر دیا جائے۔ لیکن کئی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مکتوب نہیں بھیجا گیا۔ چناں چہ سر والٹر مانکٹن نے اس خط کی نقل وائسرائے کے پرائیوٹ سکرٹری کو بھیج کر درخواست کی کہ اسے فوری طور پر بھیج دیا جائے[1]۔ اس کے بعد ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان "معاہدہ انتظام جاریہ" ہوا اگرچہ مفاد پرستوں نے ریاست کے اندر سازشوں کا جال بچھا دیا کہ اس کے

۱۔ مشتاق احمد خاں۔ حیدرآباد کی ان کہی داستان ص ص ۵۹، ۶۰

اقتدار کو پامال کر کے اس کو انڈین یونین میں شامل کر دیں۔ اس معاہدہ پر دستخط ہوتے کے بعد میر لائق علی صدر اعظم، معین نواز جنگ اور سروالٹر مانکٹن پر مشتمل ایک وفد وجود میں آیا۔

معاہدۂ انتظام جاریہ کی پانچ دفعات تھیں :

۱۔ دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کا سارا انتظام ان ہی بنیادوں پر قائم رہے گا جو ۱۵ اگسٹ ۱۹۴۷ء سے پہلے رائج تھا۔ حیدرآباد میں اندرونی شورش کی صورت میں بھارت فوجی امداد دینے کا پابند نہ ہوگا اور نہ ہی اسے اس کا اختیار ہوگا۔ بجز زمانۂ جنگ بھارت کو حیدرآباد میں کوئی فوج رکھنے کا حق نہ ہوگا اور ناگہانی حالات میں اگر فوج رکھی بھی جائے تو وہ جنگ کے خاتمے کے بعد چھ ماہ کے اندر واپس بلالی جائے گی۔

۲۔ حیدرآباد اور دہلی میں ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کے حق کو تسلیم کر لیا جائے۔

۳۔ بھارت نے اقتدار اعلیٰ کے اختیارات کو استعمال نہ کرنے کی یقین دہانی کرائی۔

۴۔ معاہدے سے متعلق تنازعہ کی صورت میں فریقین کو ثالثی کے سپرد کرنے پر اتفاق کیا گیا۔

۵۔ معاہدہ کی مدت ایک سال مقرر کی گئی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھارتی حکومت کی طرف سے یقین دہانی کرائی کہ اسے حیدرآباد کے لندن یا کسی اور ملک میں اپنا نمائندہ مقرر کرنے پر

کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن یہ ضروری ہوگا کہ ان کی کاروائیاں بھارتی نمائندوں سے مربوط ہوں اور ایسی کاروائیوں کا دائرہ صرف تجارت تک محدود ہوگا۔[۱]

چناں چہ اس معاہدے کے تحت حیدرآباد کا بیرونی ممالک میں اپنا ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ ایک مہا بھائی کے۔ ایم۔ منشی کو اپنا نمائندہ بناکر حیدرآباد روانہ کیا گیا جس نے اپنی سفارت کا آغاز مملکت کے کارپردازوں کے جذبۂ وفاداری کو ختم کرکے انھیں اپنی جاسوسی کا ذریعہ بنالیا اور امن وامان کو تہہ وبالا کرڈالا۔[۲]

دہلی میں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل کے عہدے کے لیے جناب زین یار جنگ کا انتخاب ہوا جنھیں حیدرآباد کی نمائندگی کا اعزاز دیا گیا۔ لندن میں پہلے ہی سے حیدرآباد کا سفارت خانہ موجود تھا۔ پاکستان میں حیدرآباد ایجنسی پر جناب مشتاق احمد خاں کا تقرر عمل میں آیا۔ آسٹریلیا ممالکِ متحدہ امریکہ اور مصر میں بھی ایجنٹ جنرل مقرر کیے گئے۔[۳]

لیکن اس معاہدے کی پابندی نہیں کی گئی اور حیدرآباد پر مسلسل دباؤ ڈالے گئے کہ وہ انڈین یونین میں شامل ہوجائے۔ چناں چہ سیاسی حلقوں

۱۔ مشتاق احمد خاں۔ زوالِ حیدرآباد کی اَن کہی داستان ص ۷۵

۲۔ —— ایضاً —— ایضاً ص ۹۳

۳۔ —— ایضاً —— ۔ رر ۔ ص ۹۶

میں ناراضگی کا اظہار ہونے لگا کہ انڈین یونین حیدرآباد کے داخلی مسائل میں مداخلت کرنا چاہتی ہے۔

انجمن پست اقوام کے ایک جلسے کو مخاطب کر کے صدر المہام بی۔ ایس۔ وینکٹ راؤ نے حیدرآباد میں کہا کہ "دولتِ آصفیہ ایک خود مختار سیاسی وحدت ہے۔ مملکت حیدرآباد کا دستوری موقف کسی بیرونی تسلط اور اقتدار اعلیٰ کا اپنی پچھلی ۱/۲ ۲سو سالہ تاریخ میں کبھی بھی تابع نہیں رہا۔ اگرچہ کہ برطانوی عہد کے دوران خود ساختہ پیرامونٹسی حیدرآبادی سرزمین پر نشو و نما پا رہی تھی لیکن اس نام نہاد اقتدارِ اعلیٰ کی وجہ سے ہماری داخلی اور خارجی حکمتِ عملی میں کوئی قابلِ لحاظ اثر اندازی نہ ہو سکی۔ ۱۵ اگسٹ کے بعد سے ہندوستان میں حیدرآباد نے بالخصوص جو سیاسی صورت اختیار کر لی ہے اس کے بعد سے ہندوستان میں دولتِ آصفیہ کی سیاسی وحدت کا مسئلہ بڑی وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اب حیدرآباد ایک کامل الاقتدار اور مطلق الحنان نظم و نسق کا حامل ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں ہم اپنے جائز مطالبہ آزادی کے خلاف کسی ہمسایہ اور مساوی مملکت کے غیر آئینی دباؤ اور ناجائز خواہشات کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے۔ حیدرآباد آزاد رہا ہے اور مستقبل میں بھی اس کی آزادی مضبوط ہو جائے گی۔ بعض دشمن گوشوں سے حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام اور انڈین یونین میں اس کی شمولیت کا نعرہ لگایا جا رہا ہے وہ محض موقع پرست

اور نام نہاد قائدین کی مجرمانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔[۱]

۲۱ فبروری ۱۹۴۸ء دکن نیوز کی ایک سرخی " انڈین یونین اور حیدرآباد کی گفت و شنید۔ ہندوستان میں شمولیت کے لیے بے جا اصرار ۔ سردار پٹیل کی جانب سے انتہائی دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ حیدرآباد انڈین یونین میں شامل ہو جائے بصورتِ ثانی مخالفانہ کارروائیوں کی دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ حیدرآباد پر بے بنیاد اور فرضی الزامات عائد کر کے اصل مسائل سے توجہ ہٹانے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جن مسائل کو سردار پٹیل نے اپنی جانب سے ایجنڈے میں شریک کیا ان میں مجلس کے رضاکاروں کا مسئلہ، بستہ حالی کے چلن کا قانون اور پاکستان سے تمسکات ہے حالاں کہ ان ہر سہ مسائل سے متعلق سابقہ گفتگو میں صورتِ حال کو اچھی طرح واضح کردیا گیا ہے۔ یہ مسائل ایسے نہیں جن میں انڈین یونین مداخلت کرسکتی ہے"۔ لیکن کے۔ ایم۔ منشی کے مشورے پر سردار پٹیل کو اصرار ہے کہ ان مسائل کو دوبارہ کھڑا کیا جائے تاکہ حیدرآباد اپنے جائز مطالبات کو منوانے کے موقف میں نہ رہے"۔

۲۷ فبروری ۱۹۴۸ء کی ایک خبر نے بتایا کہ مولوی لائق علی صدر اعظم حیدرآباد نے کہا کہ حیدرآباد صرف اپنی خودداری قائم رکھنا چاہتا ہے ہندوستانی یونین کے مہیب مسائل میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔[۲]

۱۔ روزنامہ نظام گزٹ ۱۲ فبروری ۱۹۴۸ء

۲۔ ـــــ ـــــ ایضاً ۔ ۲۷ فبروری ۱۹۴۸ء

۲۵ فروری ۱۹۴۸ء کو ڈومنین پارلیمنٹ میں سردار پٹیل کی تقریر کے اس حصے پر کہ "جب تک ذمہ دارانہ حکومت قائم نہ ہو حیدرآباد میں ہنگامہ ناگزیر ہے"۔ دکن نیوز نے استفسار کیا جس پر قاسم رضوی نے کہا کہ "ایسے وقت جب کہ سلطنت حیدرآباد اور حکومتِ ہند کے مابین ایک طویل المدت معاہدہ کی تیاری ہو رہی ہے نائب وزیر اعظم سردار پٹیل کا ڈومنین پارلیمنٹ میں حیدرآباد کے متعلق کچھ کہنا ان کے احساسِ ذمہ داری کے نقدان کی دلیل ہے جب کہ حکومتِ حیدرآباد نے مستقل اور غیر متزلزل ارادے کے ساتھ یہ طے کر لیا ہے کہ وہ بہر حال اور ہر قیمت پر آزاد رہے گی تو پھر اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تقریروں کے بعد کوئی گفت و شنید تضیعِ اوقات کے سوا کچھ نہیں[1]۔

مسٹر والٹر مانکٹن معاہدہ انتظامِ جاریہ کی بعض خلاف ورزیوں پر جو انڈین یونین کی جانب سے ہو رہی تھیں بہت مایوس اور ناراض تھے۔ اور تبادلہ خیال کے لیے دہلی گئے۔ مسٹر پٹیل نے حیدرآباد کے اندرونی معاملات پر رائے زنی کر کے معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ سر والٹر مانکٹن نے دہلی جا کر اسلحہ کی فراہمی اور حیدرآباد کی رزیڈنسی کی عمارت کو نئی دہلی کی جانب سے نقصان پہنچانے کی تلافی کے لیے بھی ماؤنٹ بیٹن سے بات چیت کی اور تلافی کے لیے ۲۰ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ انھیں اس کا پورا علم تھا کہ انڈین یونین معاہدہ انتظامِ جاریہ پر کاربند نہیں ہے اور اس کی خلاف ورزی

---

[1] روزنامہ نظام گزٹ ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء

کر رہی ہے۔ سر والٹر کو انڈین یونین کے معاہدہ انتظام جاریہ کی پابندی سے انحراف، حیدرآباد پر دباؤ اور اس کی مرضی کے خلاف شرکت کرنے کی دھمکیوں پر اعتراض تھا۔

لیکن ۱۶ مارچ ۱۹۴۸ء کے نظام گزٹ میں یہ خبر چھپی کہ "پنڈت نہرو نے کہا ہے کہ حیدرآباد کی صورت حال بڑی پیچیدہ ہے۔ ہم نے انتظام جاریہ کا ایک سالہ معاہدہ کیا ہے لیکن اس معاہدے کی تکمیل نہیں ہو رہی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی پیش آئی ہیں جن سے اس راضی نامے کے شرائط اور اسپرٹ کو بہ مشکل باقی رہ سکتی ہے۔ باوجود اس کے ہم صبر و تحمل سے کام لے رہے ہیں۔ ہم حیدرآباد کے مسئلے کو پُرامن طریقے سے حل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ اس میں ہمارا فائدہ ہے اور حیدرآبادی عوام اور حیدرآباد کی موجودہ حکومت کا بھی فائدہ ہے کہ اس مسئلے کو پُرامن طور پر طے کرے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ممکن ہے کہ حیدرآبادیوں کو اس کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ پُرامن سمجھوتے کی توقع باقی ہے ممکن ہے اس وقت حیدرآبادی عوام یا پولیس کی طرف سے تشدد ہو رہا ہے لیکن اس تشدد کا مقابلہ ہماری طرف سے بھی تشدد کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ حیدرآباد کی طرف سے سرکاری یا نیم سرکاری تشدد ہو تو ایک غیر معمولی انتشار ہوگا اور اس وقت یہ کہنا قطعاً ناممکن ہوگا کہ کون موردِ الزام ہے"

"نذرِ اہلِ حیدرآباد کی اَن کہی داستان" کے حصہ سوم، دوسرے باب میں مشتاق احمد خاں صاحب نے "حیدرآباد پر فوجی حملے" کے ضمن میں بتایا کہ

نہرو اور پٹیل نے نظام کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں۔ سخت ترین معاشی ناکہ بندی کر دی جس کی وجہ سے پٹرول اور تیل نایاب ہو گیا۔ پینے کے پانی کے لیے کلورین کی قلت کی وجہ سے شہروں میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور دوائیوں کی رکاوٹ کی وجہ سے علاج معالجہ دشوار ہو گیا۔ اس طرح روزمرّہ کی بنیادی ضروریات پوری نہ ہونے کی وجہ سے بے چینی پھیل گئی۔ معاشی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی گئی اور خفیہ طور پر کثیر تعداد میں ملک میں شر پسند عناصر بھیجے گئے تاکہ دونوں فرقوں کی روایتی یک جہتی ختم کر دیں اور تخریبی کارروائیوں سے نظم و نسق میں دشواریاں پیدا ہوں[۵]۔ ساتھ ہی بھارتی فوجی دستوں نے سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ضلع عثمان آباد کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ اور کوڈداڈ اور فاضل پور کے علاقوں میں خون خرابہ کیا۔ لیکن باقاعدہ فوجی کارروائی میں تاخیر کا۔ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں فرقہ وارانہ فسادات نہ پھوٹ پڑیں۔ یہ بھی خوف تھا کہ پاکستان کی طرف سے کوئی اقدام نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ فوجی تیاریاں مکمل نہ ہو سکی تھیں اس لیے حیدرآباد کو عمداً مذاکرات میں الجھائے رکھا۔

میجر جنرل چودھری نے اپنی خفیہ ڈائری میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۴۸ء ہی میں بھارتی جنرل اسٹاف کو حملے کا منصوبہ بنانے کی ہدایت کر دی گئی تھی اور مارچ ۱۹۴۸ء میں تیار شدہ منصوبے کو منظوری بھی دے دی گئی تھی۔ جنرل چودھری اور بریگیڈیر ورما کو اس مہم کے لیے نامزد بھی کر دیا گیا تھا۔ جون ۱۹۴۸ء میں حملے کے ساتھ انتظامی معاملات کو سلجھانے کے لیے سول ٹیم کا بھی انتخاب ہو چکا

۵۔ "زوالِ حیدرآباد کی ان کہی داستان" ص ۲۰۱

تھا اور فوجی حملے کا نام "آپریشن پولو" بھی تجویز کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ خطرہ لاحق تھا کہ حیدر آباد کی ایر فورس کہیں بھارت کے بڑے شہروں پر بمباری نہ کر دے۔ کمانڈر العیدروس کی طاقت کا بھی انھیں علم تھا۔ سب سے بڑی قوت جس کی وجہ سے حملے میں تاخیر ہوئی وہ قائد اعظم کی ذات تھی۔

جنرل چودھری نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب قائد اعظم انتقال کر گئے تو بھارتی افسروں نے اسے ایک فال نیک سمجھا۔[۱]

بھارتی دو عملی کی حد یہ تھی کہ ادھر تو ساری تیاریاں جاری تھیں اور ادھر نظام کو یقین دلایا جا رہا تھا کہ نہرو اور اس کی کابینہ کے وزرا نظام پر کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے۔

نظام کی فوج میں اسلحہ اور گولہ بارود کی کمی، ٹینکوں اور دبابوں کا نہ ہونا، فوجی افسروں میں جدید جنگ لڑنے کی تربیت اور فقدانِ تجربہ، یہ وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر بھارتی افواج کا پلہ بھاری رہا۔

العیدروس نے نظام اور صدرِ اعظم کو بارہا یقین دلایا کہ وہ بھارتی افواج کو حیدر آباد میں اندر آنے سے ۳ ماہ تک روک سکتے ہیں لیکن مایوسی اور افسردگی کی فضا اس وقت چھا گئی جب انھیں تصویر کا دوسرا رخ نظر آیا۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم نے وفات پائی اور بھارت کے ناپاک عزائم تکمیل پا گئے۔ ۱۳ ستمبر کو صبح ۴½ بجے بھارت نے اچانک بیک

۱۔ جنرل چودھری۔ ڈائری ص ۲۹

وقت ۲۲ سمتوں سے حیدرآباد پر حملہ کر دیا۔ صحیح قیادت کے نہ ملنے پر حیدرآباد میں سراسیمگی چھا گئی۔ ۱۵ - ۱۶ ستمبر کو ورنگل، بیدر اور اورنگ آباد پر اندھا دھند بمباری شروع ہوئی۔ پربھنی، اورنگ آباد جالنہ اور ہنگولی پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ تھوڑی بہت مدافعت ہوئی لیکن حملہ آور فوج کے لیے راستہ کھلا تھا۔ جب بھارتی فوج دارالخلافہ حیدرآباد سے ۲۰ میل دور رہ گئی تو ۱۵ ستمبر کو صدرِ اعظم نے نہرو سے اپیل کی کہ وہ مناسب اور منصفانہ سمجھوتہ کریں لیکن اس اپیل کا جواب نہیں ملا۔ آخرکار بھارتی فوج نے بزورِ شمشیر حیدرآباد پر قبضہ جما لیا۔ شاہِ برطانیہ اور وزیرِ اعظم ایٹلی نے اس "یارِ وفادار" کی بروقت مدد بھی نہیں کی حالاں کہ احسان مندی اور شرافت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ حیدرآباد کے اس نازک موقف میں کام آئے اور اس کی حفاظت کرے۔"

بالآخر ۱۷ ستمبر کی منحوس تاریخ کو دکن میں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ اقتدار ختم ہو گیا۔[1]

۱۔ مشتاق احمد خاں۔ زوالِ حیدرآباد کی اَن کہی داستان ص ۲۶

میر عثمان علی خاں کے حالاتِ زندگی

ولادت

یکم رجب ۱۳۰۲ھ — ۵ اپریل ۱۸۸۶ء کو بطنِ پاک اُمتہ الزہرا سے پرانی حویلی میں ہوئی ۔ ۲۴ سال کی عمر میں میر محبوب علی خاں آصف جاہِ سادس کے جانشین اور ملکِ دکن کے ساتویں فرماں روا ہوئے ۔

تعلیم و تربیت ۔ پرانے مشرقی طریقے پر تعلیم دی گئی ۔ پانچویں برس سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا ۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی ۔ مولانا انوار اللہ خاں دینی اور عربی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے جو علومِ اسلامیہ کے عالم تھے ۔ نواب عماد الملک بہادر (سید حسین بلگرامی) اور آغا حیدر علی شوستری فارسی تعلیم کے لیے متعین کیے گئے ۔ یہ دونوں اپنی علمی قابلیت کے لیے مشہور تھے ۔ مسٹر ایجرٹن انگریزی تعلیم پر مامور ہوئے ۔ فنونِ سپہ گری اور شہ سواری کے لیے سر افسر الملک منتخب کیے گئے جو افواجِ آصفیہ کے کمانڈر تھے ۔

میر عثمان علی خان زبان اور قلم دونوں پر حاوی تھے ۔ نثر اور نظم دونوں میں کمال تھا ۔ عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی پر یکساں عبور حاصل تھا ۔ اُردو اور فارسی میں اپنا دیوان شائع کیا ۔ اُردو زبان کے اسلوبِ تحریر اور اندازِ بیان

میں منفرد تھے۔ شاعری آپ کو ورثے میں ملی تھی اور عثمانؔ تخلص کرتے تھے۔

بچپن ہی سے مخصوص شاہانہ آداب کی تربیت کے لیے اقبال یار جنگ کی اتالیقی ملی جو میر محبوب علی خاں کے بھی اتالیق رہ چکے تھے۔ آپ کی تربیت میں خاص لحاظ رکھا گیا تھا۔ ہر قسم کے لہو و لعب سے دور تھے۔ ولی عہدی کے دور ہی میں جہاں بینی اور جہاں بانی کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی تھی اور شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ غور و فکر کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بلند ہمت و باحوصلہ پُر وقار و پُر جلال تھے۔

غرض حیدر آباد کے ہونے والے اس بادشاہ کی تربیت میں کوئی کسر نہیں رکھی گئی تھی۔ عالم و فاضل، اعلیٰ مرتبت اساتذہ کی نگرانی میں خوب سے خوب تعلیم اور اچھی سے اچھی تربیت دی گئی۔ ملک کے نظم و نسق، رعایا کی اصلاح و فلاح کے لیے غور و فکر کے بعد رائے قائم کرتے اور فرامین جاری کرتے تھے۔

نکاح۔ ۱۳۲۶ھ یعنی ۱۹۱۰ء میں میر عثمان علی خاں کا نکاح نواب جہانگیر جنگ بہادر کی صاحبزادی سے پڑھایا گیا جو دلھن پاشا کے لقب سے مشہور ہوئیں

شاہ نوشاہ نے باندھ کے سر پر سہرا
آج کرے گا زمانے کو مسخر سہرا
(جلیلؔ)

اولاد۔ دو لڑکے شہزادہ میر حمایت علی خاں (اعظم جاہ بہادر) اور

میر شجاعت علی خاں (معظم جاہ بہادر) تھے۔

جانشینی: ۴ رمضان ۱۳۲۹ھ یعنی ۱۹۱۱ء میں ۲۴ سال کی عمر آپ محبوبِ دکن میر محبوب علی خاں کے جانشین مقرر ہوئے اور آصف جاہ ہفتم آپ کا لقب ہوا اور جانشینی کا اعلان ہوا۔ اس طرح آصف جاہ ہفتم کا عہدِ حکومت ۲۹ اگسٹ ۱۹۱۱ء سے شروع ہوا۔

تخت نشینی: تخت نشینی کے موقع پر عثمان علی خاں نے اپنی رعایا کو یقین دلایا کہ "میں ان ذمہ داریوں سے اس وقت تک عہدہ برا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے والدِ محترم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش نہ کروں۔ میں اس امر کی انتہائی کوشش کروں گا کہ اپنے جلیل القدر والد کی طرح ملکِ معظم کے ساتھ دیرینہ تعلقات کو بھی برقرار رکھوں اور ان کو مستحکم کروں"۔

تخت نشینی کے موقع پر اُردو کے مشہور شاعر مولانا الطاف حسین حالیؔ نے فرماں روائے دکن کی خدمت میں یوں مبارکباد پیش کی۔

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں — مبارک تمھیں مسندِ شہریاری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو — جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری
مبارک اب و جد کی تم کو خلافت — مبارک دکن کی تمھیں تاجداری
مہینوں سے ہے جن کی تاریخ رنگیں — زبانوں پہ ہے ذکرِ خیرات جاری
ادا کر گئے وہ تو اپنے فرائض — ہے اب آپ کے عہدِ دولت کی باری
رہے رہتی دنیا تلک وہ سلامت — یہ اقبال فیروزی و کامگاری

سفر۔ میر عثمان علی خاں نے نہ یورپ اور غیر ممالک کا سفر کیا اور نہ ہندوستان

کا البتہ میر محبوب علی خاں کے ساتھ دہلی اور کلکتہ میں بعض تقاریب میں شریک ہوئے لیکن خود اپنے عہد میں انھوں نے اپنے ولی عہد میر حمایت علی خاں شہزادہ اعظم جاہ بہادر کو یورپ اور دوسرے ممالک کے سفر کو ضروری سمجھا۔

عثمان علی خاں کا پہلا سفر کلکتہ کا سفر تھا جب کہ وہ ۱۴ برس کے تھے۔ جب میر محبوب علی خاں وائسرے ہند لارڈ کرزن سے ملنے گئے تھے۔ اس سفر میں نواب وقار الامراء، سر خورشید جاہ، نواب افسر الملک، امرائے دولت آصفیہ ان کے ہم رکاب و ہم سفر تھے۔

اس سفر میں انھوں نے بنارس بھی دیکھا۔ گلبرگہ میں رمضان کا پورا مہینہ گزارا اور پھر حیدرآباد لوٹے۔

دوسرا سفر: میر محبوب علی خاں ایڈورڈ ہفتم بادشاہ برطانیہ کی تاج پوشی کے سلسلے میں جب دہلی گئے تو میر عثمان علی خاں بھی ان کے ساتھ تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد اس وقت وزیر اعظم تھے۔

نظامس اسٹیٹ ریلوے کی خاص ٹرین کے ذریعہ جب وہ دہلی پہنچے تو ان کے ساتھ درباری بھی موجود تھے۔ تاج پوشی میں شرکت کے بعد حیدرآباد واپس لوٹے۔

ان دو سفروں کے ذریعہ میر عثمان علی خاں نے والیانِ ریاست کے ذاتی حالات اور ان کے رہن سہن کا بغور مطالعہ کیا۔ سامانِ عیش و نشاط اور نمود و نمائش کو پرکھا۔ ریاستوں کے رکھ رکھاؤ کو سمجھا اور جانا کہ انسان

کا جوہر اس کی ذاتی صفات و کمالات ہیں۔ جو دین و دنیا میں اس کی عزت و عظمت کا باعث ہوتے ہیں۔ محض لباس ہی باعثِ فخر نہیں ہوتا۔ سلاطین و امرا کا ایک خاص لباس ہوتا تھا لیکن عثمان علی خاں نے خود کو عوام سے نزدیک کرنے کے لیے شان و شوکت کے مقابلے میں سادگی اور کسرِ نفسی کو ترجیح دی اور اپنی مثال سے ملک بھر میں سادگی کا ایسا نمونہ چھوڑا کہ آج بھی لوگ انھیں سراہتے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کی سادگی کا الٹا مطلب نکالا وہ اپنی غلط فہمی کو دور کر دیں۔

ان دو سفروں میں عثمان علی خاں نے انگریزی افسروں کے طور طریقوں کا بھی مطالعہ کیا کہ کس طرح وہ دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور برتتے تھے۔ وہ دخل اندازی نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ صرف ایک ولی عہد تھے لیکن انھوں نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ مستقبل کے لیے کیا لائحۂ عمل استعمال کیا جائے گا۔

۱۳۲۰ھ کو برار جو مملکت آصفیہ کا حصّہ تھا، ایک معاہدے کی رُو سے انگریزی حکومت کو پٹہ پر دے دیا گیا تھا۔ لارڈ کرزن نے مملکت آصفیہ کو مجبور کر دیا تھا کہ پچاس سالہ پرانا مسئلہ یوں حل کر دیا جائے۔ محبوب علی خاں اس معاہدے سے خوش نہیں تھے۔ چناں چہ میر عثمان علی خاں نے تہیّہ کر لیا کہ جب وہ ریاست کے فرماں روا ہوں گے، برار کے علاقے کو انگریزوں کے قبضے سے کسی طرح واپس لے لیں گے۔

شاہِ دکن میر عثمان علی خاں نے دکنی تہذیب کی چھاؤں میں جب اس

سلطنتِ حیدرآباد کی باگ ڈور سنبھالی تو اس کے حدود شمال میں برار اور صوبہ متوسط تھے۔

جنوب میں مدراس

مغرب میں بمبئی

اور مشرق میں مدراس اور صوبہ متوسط دریائے گوداوری اور کرشنا سرزمین دکن کو سیراب کر رہے تھے۔

اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین اس سرزمین پر سایہ فگن تھے جن کی رحمتوں اور برکتوں کے صدقے میں حیدرآباد امن و امان، قومی یکجہتی اور الفت و محبت کا سرچشمہ بنا رہا۔ شعر و ادب اور علم و فضل سے سنورتا رہا۔

آصفِ سابع میر عثمان علی خاں کا ۳۶ سالہ دور، مملکتِ آصفیہ کا سنہرا دور تھا یہاں اردو زبان سب کی من پسند زبان تھی۔ حکومت کی سرکاری زبان بھی اردو ہی تھی۔ رواداری اس کی گھٹی میں تھی۔ بھائی چارہ اور قومی یکجہتی اس کا اصول تھا۔

حیدرآباد دکن تین حصوں پر مشتمل تھا: تلنگانہ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک۔ تلنگانہ میں تلنگی اور مرہٹواڑہ میں مرہٹی بولی جاتی تھی۔ جنوب کا کچھ حصہ کرناٹک کہلاتا تھا جہاں کنڑی بولی جاتی تھی۔ لیکن اردو عوامی زبان تھی اور عام طور پر سبھی اردو بولتے، سمجھتے، پڑھتے اور لکھتے تھے۔

مرہٹوں، تلنگیوں اور کنڑوں کے علاوہ حیدرآباد میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، عرب، پٹھان سبھی شیر و شکر ہو کر رہتے بستے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد، وینکٹ راما ریڈی کوتوال بلدہ، تاراپوروالا مشیرِ مال، راجہ نرسنگ راؤ مہتمم سیونگ بینک نظامت ٹپہ کی خدمات انجام دیتے تھے جو مذہبی رواداری کی زندہ مثال تھی۔

والسرائے ہند: آصف سابع میر عثمان علی خاں کے دورِ حکومت میں چھ والسرائے ہند حیدرآباد آئے تھے۔[1]

۱۔ لارڈ ہارڈنگ	۱۹۱۳ء	۴۔ لارڈ ارون	۱۹۲۹ء
۲۔ لارڈ چمسفورڈ	۱۹۱۹ء	۵۔ لارڈ ولنگٹن	۱۹۳۳ء
۳۔ لارڈ ریڈنگ	۱۹۲۳ء	۶۔ لارڈ لنلتھگو	۱۹۳۶ء

رزیڈنٹس[2]۔ ۵۶ رزیڈنٹس مقرر ہوئے تھے جن میں پہلے رزیڈنٹ

۱۔ یادگار سلور جوبلی آصف سابع نمبر ص ۱۲۹

۲۔ حیدرآباد میں رزیڈنٹوں کی آمد اور رزیڈنسی کی مختصر تاریخ
فرانیسی کمپنی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی باہمی رقابت اور کشمکش کے دوران دربار آصف سابع میں باریابی حاصل کرکے جو نمائندگی کرتے تھے انھیں اس وقت "وکیل" کہا جاتا تھا جو رزیڈنٹوں کے پیشرو تھے۔ ان کی حیثیت ایک سفیر کی سی ہوتی تھی۔ حکومتِ برطانیہ اور سلطنتِ آصفیہ میں ۱۷۶۶ء میں جب مستقل تعلقات پیدا ہوئے تو اس وقت سے ان سفراء کا قیام حیدرآباد میں ہونے لگا۔ موجودہ کوٹھی سلطان بازار میں ان کے ٹھیرنے کا انتظام تھا۔ غدر کے بعد اس کا حصار تعمیر ہوا۔ ان سفراء کی کوٹھی میں مستقل سکونت نہیں ہوتی تھی بلکہ رزیڈنٹ بلارم میں رہا کرتے تھے۔ جب نظام کے دربار میں باریابی حاصل کرنی ہوتی تو یہ بلارم سے کوٹھی میں آکر ٹھیرتے۔ رفتہ رفتہ یہ کوٹھی رزیڈنٹس کی مستقل قیام بن گئی اور رزیڈنسی کہلانے لگی۔ دورِ عثمانی کا یہ بھی ایک زرین کارنامہ تھا کہ ۱۴ مئی ۱۹۳۳ء کو ۵۵ ویں رزیڈنٹ کرنل ٹی۔ ایچ۔ کینرنے ایک مختصر رسمی کاروائی کے بعد یہ رزیڈنسی آصف سابع کو واپس کردی۔ اس رزیڈنسی میں ۵۶ رزیڈنٹس نے قیام کیا تھا۔ (یادگار سلور جوبلی آصف سابع نمبر ص ۱۳۷)

مسٹر ہالینڈ تھے ۔ کرک پیٹرک جنھوں نے خیر النساء بیگم سے شادی کی تھی اور چھپے رزیڈنٹ تھے، یکے بعد دیگرے حیدرآباد میں متعین ہوئے ۔ لارڈ میکلنزی آخری رزیڈنٹ تھے ۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۵ء تک ان رزیڈنس کا قیام حیدرآباد میں تھا۔[۱] لیکن جس رزیڈنسی پر ایک صدی سے برطانوی سفراء کا قبضہ تھا ۔ ۱۹۳۳ء میں میر عثمان علی خاں نے اسے واپس حاصل کرلیا ۔ آس پاس کی سڑک اور بازار جو رزیڈنسی روڈ اور رزیڈنسی بازار کہلاتے تھے، اب شاہ راہِ عثمانی اور سلطان بازار کہلانے لگے ۔

۱۹۳۵ء میں نہایت کرّوفر کے ساتھ میر عثمان علی خاں آصفِ سابع نے جوبلی ہال میں اپنا جشنِ سیمیں منایا ۔ اس تقریب کے بعد سے باغ عامہ میں بنی اس عمارت کو "جوبلی ہال" کا نام دیا گیا ۔

اعزازات ۔ ۲۴ جنوری ۱۹۱۸ء میں جارج پنجم کی جانب سے آپ کو "ہز اکزالٹیڈ ہائی نس" کا اعزاز ملا اور "یارِ وفادار سلطنتِ برطانیہ" سے موسوم کیا گیا ۔

تاریخ ہند میں راجہ اشوک کا دور زرین دور کہلاتا ہے ۔ دوسرا زرین دور مغلیہ سلطنت کے بادشاہ اکبر اعظم کا کہلاتا ہے تو تیسرا دور آصفیہ سلطنت کے تاجدار میر عثمان علی خاں کا کہیں تو غلط نہ ہوگا ۔

آصفِ سابع میر عثمان علی خاں ایک ایسے فقیر منش انسان تھے جو دولت و

---

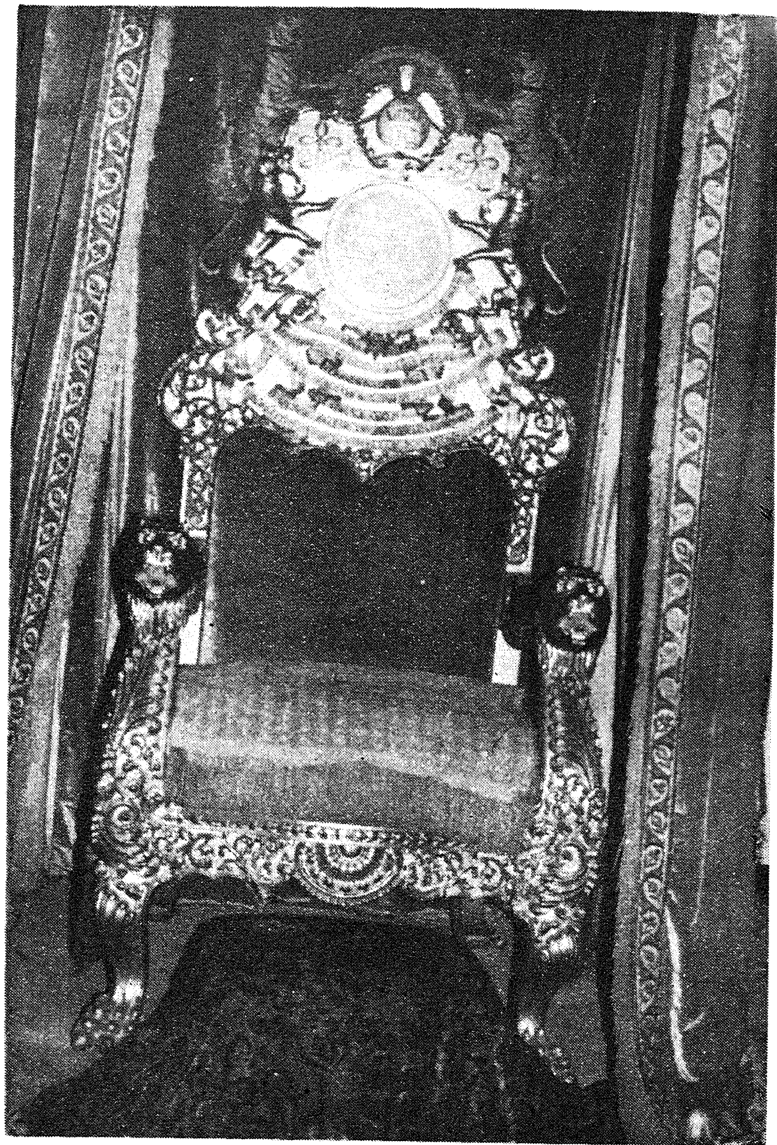
۱ ۔ یادگار سلور جوبلی ۔ آصفِ سابع نمبر ص ۱۲۴



اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں
آصف سابع
۱۹۳۲ء



میر عثمان علی خاں آصف سابع
شہزادے اعظم جاہ اور شہزادے معظم جاہ کے ساتھ



آصف سابع کی شاہی گدی شاہی نشان کے ساتھ
جو دربار خاص کے لیے استعمال کی جاتی تھی



آصف سابع کی شاہی گدی جو خانگی نشست کے لیے
استعمال ہوتی تھی۔

مسلطوت کے سائے میں بھی فقیرانہ زندگی بسر کرتے رہے ۔ اپنی دولت سے
پورے برِاعظم کی ملی تحریکوں اور اداروں کو فیض پہنچایا ۔ ملک اور اہلِ ملک
کی خدمت کی ۔ ٹرسٹ قائم کیے جن سے ان کی رعایا مستفید ہوتی رہی اور
ہورہی ہے ۔ غریبوں کی پرورش، ملک کی خوش حالی اور ایک مہذب
تمدن، ملک کی ترقی ان کا مطمحِ نظر تھا ۔ آخری سانس تک انھوں نے
عوام کی خدمت کی ۔ غریبوں کے دکھ درد، ریگینوں اور بچھڑے ہوئے طبقوں
کی فلاح و بہبودی کی ایسی شاندار مثال چھوڑی جس پر تاریخِ دکن
ہمیشہ ناز کرے گی ۔

میر عثمان علی خاں عالم اور علم پرور تھے ۔ اپنی ریاست میں انھوں نے
علم و فن کی سرپرستی کی ۔ جس فراخ دلی سے انھوں نے اردو زبان کی خدمت کی
رہتی دنیا تک اردو دنیا اور تاریخ اردو ادب انھیں خراجِ تحسین ادا کرتی
رہے گی ۔ آصفِ سابع مسلمانانِ ہند اور خصوصاً مسلمانانِ دکن کی عظمت
کے علم بردار اور آصفی سلطوت و مرتبت کی آخری یادگار تھے ۔ ان کی وفات سے
ہندوستان میں اسلامی ثقافت، تہذیب و تمدن اور اقدار ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئے ۔
ان کی فرماں روائی کا ۳۷ سالہ دورِ تاریخ کا ایک یادگار باب ہے
جو ہمیشہ دلوں کو گرماتا رہے گا ۔
حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب، قومی یک جہتی دورِ عثمانی کا ایک قابلِ قدر
ورثہ ہے ۔
۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء وہ ستم گر دن تھا جس کا شب گزیدہ سورج اپنے جلو میں سیاہی

چھپا لیا۔ کنگ کوٹھی میں اندھیرا چھا گیا۔

ایک پُرعظمت انسان کو عام انسان کی طرح اپنی چار دیواری میں زندگی کے آخری ایام کس مپرسی میں گزارنے پر مجبور کر دیا گیا —— وہ کروفر، وہ عظمت و دبدبہ سب ختم ہو گیا —— مغل تہذیب کے نقوش مٹ گئے۔ آصفی پرچم سرنگوں ہو گیا۔ مسلم اقتدار کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم ہو گیا۔

پولیس ایکشن یا فوجی حملہ۔ یہ ایک ایسا المناک واقعہ ہے جس نے حیدرآباد دکن کے آٹھ سو سالہ اقتدار کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ آصفیہ حشمت و دبدبہ جس کا دور دور تک شہرہ تھا، چند ہندوستانی لیڈروں کو خار کی طرح کھٹکنے لگا تھا۔ اپنی دولت و حشمت کے اعتبار سے ہند کی ساری ریاستوں میں سلطنتِ آصفیہ بلند و بالا مقام رکھتی تھی۔ یہاں کا کلچر، یہاں کی تہذیب و ثقافت سب سے مختلف تھی۔ پرچم آصفی جب لہراتا تو "العظمت اللہ" کے سائے میں "یا عثمان" کے نقوش ابھرتے تھے۔ چند متعصب لیڈروں نے دونوں ہی نشان مٹا دینے چاہے —— ستمبر کا مہینہ کہتے ہیں حیدرآباد کے لیے منحوس رہا ہے۔ موسیٰ ندی میں طغیانی بھی اسی مہینے میں آئی تھی اور لاکھوں کو برباد کر کے چلی گئی[1]۔

۱۔ میر عثمان علی خاں کے عہد کا سب سے دردناک واقعہ ۱۹۰۸ء کی طغیانی تھی۔ حیدرآباد کی تاریخ میں موسیٰ ندی میں طغیانی ۱۰۴۱ھ میں اس وقت آئی جب کہ عبداللہ قطب شاہ حکمران تھا۔ یہ پہلی طغیانی تھی۔ دولتِ آصفیہ میں ۷ ربیع الاول ۱۱۵۰ھ میں آئی۔ پھر ۱۱۸۰ھ، ۱۱۵۸ھ اور ۱۲۲۴ھ میں جبکہ نواب سکندر جاہ کی حکمرانی تھی۔ ۱۲۳۷ھ میں دوبارہ اور سنہ ۱۲۶۷ھ میں اس سے دوچار ہونا پڑا۔ نواب افضل الدولہ کے زمانے میں ۱۲۷۵ھ کو طغیانی آئی۔ اس طرح مسلسل تین سو سال سے اس ندی میں طغیانی آتی رہی۔ میر محبوب علی خاں کے زمانے میں رجب ۱۳۲۱ھ رات کے وقت زبردست طغیانی آئی۔ اور آخر بلا جو طغیانی آئی وہ رمضان ۱۳۲۶ھ ستمبر ۱۹۰۸ء کو آئی جو قیامت خیز تھی۔
(عرفانی حیاتِ عثمانی۔ ص ۱۲۱)

۱۹۴۸ء کا ستمبر بھی ہزاروں گھروں کے چراغ بجھانے آیا۔ کم سن بچوں نے ٹینکوں کی زد میں ہنستے ہنستے جام شہادت پی لیا۔ ہزاروں ماؤں کی گود اجڑی، ہزاروں عورتوں کی عصمت لٹی، ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹیں، بال بکھرے اور وہ سفید پوش ہوگئیں۔

۱۷ ستمبر کو اطلاع ملی کہ لائق علی وزارت نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ افواج آصفی کے کمانڈر نے اعلان کیا کہ بھارتی فوج کی طاقت کی تاب نہ لاکر ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ایک شکست خوردہ حکمران جس نے کبھی اپنا سر نگوں نہیں کیا تھا، اپنے آصفی پرچم کے ساتھ خود بھی سرنگوں ہوگیا اور بھارتی گورنر جنرل کو بتانا پڑا کہ خدا کو یہی منظور تھا۔

حیدرآباد کی دنیا بدل گئی۔ ہر آنکھ پرنم اور ہر دل سوگوار ہوگیا۔ ریڈیو نے غمگین دھن بجائے۔ لاکھوں شہری روتے ہوئے گھروں سے نکل پڑے۔ زندگی میں پہلی بار ایک خود مختار سلطنت کا عظیم والی حیدرآباد نشرگاہ سے بھارتی ایجنٹ جنرل منشی کی تیار کی ہوئی تقریر پڑھنے پر مجبور کردیا گیا۔

"میری حکومت نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا ہے اور مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں پوری سیاسی صورتِ حال کو اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ میں نے گورنر جنرل ہند کو مطلع کردیا ہے کہ مجھے افسوس ہے کہ یہ صورتِ حال جنگ سے پہلے اختیار نہیں کی گئی اور اس نازک وقت میں میرے لیے کچھ کرنے کے لیے بہت تاخیر ہوگئی ہے اور کچھ کرنا میرے لیے مشکل ہے"[1]

۱۔ مشتاق احمد خان۔ زوالِ حیدرآباد کی ان کہی داستان

یہ اعلانِ شکست گویا کروڑہا مسلمانوں کی آرزوؤں، تمناؤں کا قتل نامہ تھا ایک سیاہ اور تاریک مستقبل کا پیام بر تھا۔
میر عثمان علی خاں، ایک مجبور و لاچار انسان۔ اپنی رعایا سے شرم سار اپنی ہی کوٹھی کی چار دیواری میں قید کر دیا گیا۔
بھارتی فوجی گاڑیاں اور ٹینک شہر میں شہریوں کے دلوں کو دھڑکاتے ہوئے ان کی غیرت و حمیت کو روندتے ہوئے فوجی ہیڈکوارٹرس کا محاصرہ کرنے لگے اور لائق علی کو حراست میں لے لیا گیا۔ جنرل چودھری نے ملٹری گورنر کی حیثیت سے نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لائق علی وزارت کے اختیارات ضبط کر لیے گئے ــــ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ کھیل کس نے کھیلا؟ کون اس شرم ساری کا، اس بربادی کا ذمہ دار تھا؟ رعایا جیسے اپنے پالن ہار سے پوچھ رہی تھی یہ کس نے ہمیں دھوکا دیا؟ کس نے ملک و قوم کے ساتھ غداری کی؟ کس نے ہمارا سر جھکایا؟ کس نے ہمارا لہراتا پرچم ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیا؟
آج ۴۲ برس بعد بھی اگر عوام کو دھوکے میں رکھا جائے تو ستم ہوگا۔ ناانصافی ہوگی۔ حیدرآباد کی تاریخ لکھی جا چکی ہے۔ پولیس ایکشن یا فوجی حملے کی داستان قلم بند ہو چکی ہے۔ راز بھی افشا ہو چکے ہیں۔
شہیدوں کا خون پکار پکار کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ داستانِ پارینہ سنانا چاہتا ہے۔ آخر یہ کس قوم نے ہچکی لی، کس بادشاہ نے بے کسی کی حالت میں دم توڑا ہے؟ یہ لاکھوں نم ناک آنکھوں سے پوچھیے، جنھوں نے دیواروں سے لپٹ لپٹ کر آنسو بہائے ہیں۔ ان خطوں سے پوچھیے۔۔

جنھوں نے کتنے گھر سیاہ پوش کر دیے اور ان گھروں سے پوچھیے جو ماتم کدہ بن گئے؟
کسی نہ کسی کے تھرتھراتے ہوئے قلم کی جنبش آپ کو بتائے گی کہ کیا ہوا
تھا، کیوں ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا؟

راج پرمکھ۔

ستمبر ۱۹۴۸ء کے پولیس ایکشن کے بعد سلطنتِ آصفی کے والی نظام ہفتم
سے سارے شاہی اختیارات چھین کر نہ صرف ایک سیاسی مجرم کی طرح انھیں
کنگ کوٹھی میں نظر بند کر دیا گیا بلکہ ان کے قیمتی خاندانی جواہرات اور خزانے
رزرو بنک آف انڈیا منتقل کر دیے گئے۔ ایک عام آدمی کی طرح ان پر انکم ٹیکس،
ویلتھ ٹیکس اور سوپر ٹیکس لازم کر دیے گئے۔ ایک آزاد مملکت کے آزاد حکمران کو اس کے
مقام اور رتبے سے گرا کر اس کی عزت و حمیت کو روند کر ۱۹۵۰ء میں "راج پرمکھ"
کی حیثیت سے برائے نام کنگ کوٹھی میں شرم و ندامت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔
ا نومبر ۱۹۵۶ء کو آندھرا پردیش کا قیام عمل میں آیا تو حیدرآباد کو اس کا دارالسلطنت
مقرر کیا گیا اور نظام ہفتم کو راج پرمکھ کے عہدے سے سبکدوش کر کے حکومتِ ہند کے
وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے انھیں گورنری کی پیش کش کی جسے نظام نے ٹھکرا دیا۔
دولت و اقتدار سے محروم اس بادشاہِ بے تاج نے ۱۴ برس تک گوشہ نشینی کی
زندگی گزار کر ۱۹۶۷ء میں جہانِ فانی کو خیرباد کہہ دیا۔

اور ع ایک پھول تھا جو ٹوٹ کے مرجھا کے رہ گیا (عثمان)

وفات: میر عثمان علی خاں آصف سابع نے ۲۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو وفات پائی
اور مسجد جودی میں مدفون ہوئے۔

میر عثمان علی خاں کا شاہی نسب نامہ

۱. نواب خواجہ عابد قلیچ خان

۲. نواب فیروز جنگ

۳. نواب چین قلیچ خاں نظام الملک آصف جاہ اوّل ۱۱۳۶ھ / ۱۷۲۴ء تا ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء

۴. نواب ناصر جنگ شہید

۱۰. نواب افضل الدولہ نظام الملک آصف جاہ خامس [illegible] / ۱۸۵۷ء تا [illegible] / ۱۸۶۹ء

۱۱. نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سادس ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ تا ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء

۱۲. نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء تا ۱۴۰۳ھ / ۱۹۶۷ء

وفات (۲۴ فروری ۱۹۶۷ء)

میر عثمان علی خاں کی شخصیت، اخلاق و عادات

عثمان علی خاں کی تخت نشینی یعنی ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک عہدِ عثمانی کے پُر عظمت ۳۷ سالوں میں حیدرآباد کو ہندوستان بھر میں جو مقام اہمیت شہرت اور نیک نامی حاصل رہی اور تہذیب و تمدن کا مرکز مانا گیا اس کی اصل اور سب سے بڑی وجہ خود سلطنتِ آصفیہ کے اس بلند مرتبت، شریف النفس روشن دل و روشن دماغ مدبّر میر عثمان علی خاں کی اپنی شخصیت تھی۔

انھوں نے اپنے بزرگوں کی عالی شان روایات کو نظر میں رکھتے ہوئے حال کو لائقِ تقلید و احترام بنایا اور مستقبل کو سنوارنے کی فکر میں ہمہ وقت مصروف رہے۔ اس نیک دل، ہمدرد، سادگی پسند انسان نے بلندی پر پہنچ کر پستی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی نظر ریاست کے ہر بلند و پست پر امراء سے لے کر غرباء تک پر رہتی تھی۔ رعایا کے دکھ درد کو وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ عوام کی ضروریات کا انھیں پورا احساس تھا۔ وہ ریاست بھر کے مسلمانوں بلکہ ریاست کے باہر بھی ان کا ایسا ہی سہارا تھے جیسا کہ ہندوؤں کے۔ انھوں نے خود کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دیا تھا۔ حیدرآباد کو صحیح معنوں میں انھوں نے لائقِ رشک بنا دیا تھا۔ جب انھوں نے اپنے والد

محبوبِ دکن سے تخت و تاج حاصل کیا حکومت کا خزانہ تقریباً خالی تھا اور جب اقتدار سے محروم ہوئے تو حیدرآباد برِّصغیر کی سب سے ترقی یافتہ اور خوش حال ریاست تھی۔

(۱ ½) ڈیڑھ کروڑ رعایا کی آنکھوں نے اپنے بادشاہ کی کسرنفسی، سادگی رواداری، بے تعصبی اور جفاکشی کو دیکھا۔ سبھی کو اعتراف تھا کہ عثمان علی خاں جیسا عالی دماغ، دُور بین اور باوقار سلطان، سلاطینِ آصفیہ کی روایات کو زندہ رکھنے والا فرض شناس، مدبّر، ترقی پسند، حکمراں سارے خانزادہ آصفیہ میں سب سے زیادہ لائقِ احترام اور سب سے زیادہ عظیم تھا۔

عثمان علی خاں نے اپنے خاندانی وجاہت کا ہمیشہ پاس و لحاظ کیا۔ اسلامی اصول اور تعلیمات، شائستگی، تہذیب و اخلاق کے اس پیکر نے دولت و حشمت کی چوکھٹ پر فقیری کی شان تانہ لگی۔

سلطنت آصفیہ کے وقار و عظمت، اقتدار اور نیک نامی اور عوام کی خوش حالی کے لیے انھوں نے دولت جمع کی اور ہمیشہ اسے عوام ہی کی امانت سمجھا۔ لاکھوں کروڑوں روپے ملک و ملت کی بھلائی کے لیے صرف کر دیے لیکن اپنی ذات کے لیے انھوں نے فقیرانہ زندگی ہی کو منتخب کیا۔ اپنی بے مثال شخصیت سے دوسروں کی زندگی کو سادہ اور پاکیزہ بنانے کی کوشش کی۔ ملک اور رعایا کو سیدھے سادے مگر سچے اصولوں پر چلنے کی راہ بتائی۔ بُرے رسوم و رواج توہمات، لہو و لعب اور فضول خرچیوں سے دُور رہنے کی ترغیب دی۔

حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب، ہم آہنگی اور یکجہتی، رواداری اور

خلوص و محبت کا ناقابلِ فراموش ورثہ عثمان علی خاں کی محترم ذات میں ہم نے بدرجۂ اتم پایا۔ بلالحاظِ مذہب و ملت انھوں نے عوام کی خدمت کو اپنا مقصد اور مطمحِ نظر مانا۔ ان کی باخبری کا یہ عالم تھا کہ شہر کے ہر چھوٹے بڑے فقیر و رئیس کی حالت سے وہ واقف تھے! اربابِ مقتدر اور ارکینِ سلطنت کے مرتبے، شخصیت، علمی قابلیت اور لیاقت اور سمجھ بوجھ سے باخبر تھے اور ان کو اسی حیثیت سے شرف ہم کلامی بخشتے۔ عزت و احترام ملحوظ رکھتے[1] ان کی خوبیوں کو سراہتے اور کمزوریوں پر سرزنش کرتے۔ راست بازی اور حق گوئی سے خوش ہوتے اور بیش قیمت انعامات سے نوازتے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ انسان کے ذاتی جوہر اور اعلیٰ کرداری اس کی عزت و عظمت کا باعث ہوتے ہیں۔ اپنے استادوں کا ادب اور ان کے مقام کا احترام کرتے چھوٹوں کا لحاظ کرتے۔

ان کی تربیت میں خاص آداب و ضوابط کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ علومِ دینی سے واقف کرانا میر محبوب علی خاں نے ضروری سمجھا تھا کیوں کہ اخلاق اور جہاں بانی کے صحیح اصولوں کی بنیاد مذہب ہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عثمان علی خاں اسلامی آداب اور شائستگی کی زندہ مثال تھے۔ ہر قسم کے لہو و لعب سے دور تھے، زیادہ تر وقت مطالعۂ کتب میں مصروف پائے جاتے تھے۔ غور و فکر کے عادی تھے۔ اسلامی کلچر پر گہری نظر رکھتے تھے۔ دینیات، اسلامیات، فارسی، اور عربی علوم سے واقفیت کی بِنا پر وہ ہر علم کے متعلق مبصرانہ رائے پیش کر سکتے تھے۔

۱۔ یادگار سلور جوبلی آصفِ سابع جشنِ عثمانی ص ۲۹

وہ اپنی ماں کے پرستار اور سعادت مند بیٹے تھے ۔ روز کا معمول تھا کہ ساڑھے چار بجے وہ اپنی والدہ کے خدمت میں حاضر ہو جاتے ۔ گھنٹہ بھر تک ان کے قریب رہتے، ان کے پیر دباتے ۔ اپنی ماں کے آگے مودبانہ پیش ہوتے ۔ ان کے حضور میں وہ تخت و تاج کے مالک کی حیثیت سے نہیں ایک عام انسان اور ایک ذمہ دار بیٹے کی طرح رہتے ۔ ان کی ضروریات، ان کی غذا کا خیال کرتے ۔

وہ ایک شفیق باپ تھے ۔ امور سلطنت کے فرائض کے ساتھ فرائض پدری سے منہ نہ پھیرتے ۔ بچوں کو خودداری، اعتماد اور ضبط نفس جیسی خوبیوں کی تعلیم دیتے کہ وہ اپنے مقام اور مرتبے کو پہچانیں اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں ۔ سادگی سے محبت اور شان و شوکت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ۔ بذات خود ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرتے ۔ حالاں کہ ان کا تعلیم و تربیت کا خاص انتظام تھا ۔ اپنی مثال سے ان کی دینی اور اخلاقی تربیت کرتے ۔ اپنے ساتھ جمعہ کی نماز میں ضرور شریک رکھتے ۔ مذہبی تقاریب میں بھی شامل کرتے ۔ ان میں غرور و تکبر، شان اور اکڑ پیدا نہ ہونے دیتے ۔ بلکہ سادہ زندگی، انسانیت اور انکساری پر زور دیتے ۔ مہاراجہ کشن پرشاد کہتے تھے "حضور نظام کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے ۔ حکومتوں کی تاریخ میں یہ بات بے مثال ہے کیوں کہ اکثر حکومتوں کے لیے اولاد ماں باپ کے اور ماں باپ اولاد کے مخالف ہو جاتے ہیں مگر اعلیٰ حضرت حضور نظام تاریخ میں پہلے شخص ہیں جو اپنی اولاد پر بہت زیادہ مہربان ہیں، اور

ان کی بہتری اور آسائش کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔"

اپنے دونوں صاحب زادوں میر حمایت علی خاں اعظم جاہ اور میر شجاعت علی خاں معظم جاہ شجیع کی تعلیم و تربیت کے لیے قابلِ فخر علما اردو، فارسی، انگریزی اور عربی کے لیے مقرر کیے تھے لیکن خود بھی ذاتی طور پر دلچسپی لیتے اور نگرانی کرتے تھے۔ آصف جاہی خاندان کی وجاہت اور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعظم جاہ کی شادی خلیفہ سلطان عبدالمجید خاں آفندی کی صاحب زادی دردانہ بیگم (درِ شہوار) اور معظم جاہ کی شادی سلطان کی حقیقی بھانجی فرحت بیگم (نیلوفر) سے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو بہ مقام نیس (فرانس) نہایت سادگی سے انجام پائی۔ خود سلطان نے ان کا نکاح پڑھا۔ دردانہ بیگم کا مہر ۲۵ ہزار پونڈ اور فرحت بیگم کا مہر ۱۵ ہزار پونڈ نظام ہفتم نے ادا کر دیا[۱]

۶ر اکتوبر یکم آذر ۱۹۳۳ء کو میر برکت علی خاں کی ولادت ہوئی۔ نانا سلطان عبدالمجید خاں نے "مجیدی پاشا" نام رکھا لیکن دادا نے اپنے اس پوتے کو "مکرم جاہ" کا خطاب عطا کیا اور اپنا جانشین بنایا۔ عثمان علی خاں کے دوسرے پوتے میر کرامت علی خاں کو انھوں نے "مفخم جاہ" کا خطاب دیا۔ ان دونوں پوتوں کی شادیاں بھی ترک خاندان کی قابل لڑکیوں سے انجام پائیں میر برکت علی خاں کے لیے شہزادی اسریٰ کا انتخاب ہوا اور میر کرامت علی خاں کے لیے شہزادی اسین کا ہاتھ مانگا گیا۔

میر عثمان علی خاں کو اپنی بہنوں اور بھائیوں سے بھی بہت محبت تھی اور ہر سفر میں وہ ان کے ساتھ رہتے۔ حکومتوں اور سلطنتوں میں عموماً بھائیوں

۱۔ ارمغانِ عثمانی ص ۲۶۰ - ۲۶۵

سے عداوتیں نظر آتی ہیں لیکن یہ بندۂ خدا اپنے بھائیوں پر اتنی ہی شفقت فرماتا تھا۔ جس قدر کہ بھائی ان کی عزت کرتے اور انھیں باپ کا مقام دیتے تھے۔ اپنے مرحوم بھائی صلابت جاہ کے انتقال پر ان کی آنکھیں بار بار بھر آئیں۔ انھوں نے اپنے بھائی کے عربی اشعار کا مجموعہ انگریزی میں شائع کروانا چاہا کہ ان کی یادگار رہے۔

عثمان علی خاں اپنی راحت و آرام کی پروا نہ کرتے لیکن اپنی محلات اور اولاد کی خواہشیں ضرور پوری کرتے۔ خود ان کی غذا نہایت سادہ معمولی اور مختصر ہوتی لیکن اپنے وابستگان کے لیے بہترین کھانے خوان بھر بھر کے بھجوائے جاتے۔ امراء کے محل بھی ان کی فیاضی اور کرم سے محروم نہیں رہتے چھوٹوں سے شفقت کا برتاؤ کرتے اور بڑوں سے ادب ملحوظ رکھتے۔[۱]

شاہِ دکن ایک رحم دل اور ہمدرد انسان تھے۔ کنگ کوٹھی کے ملازموں سے ان کا سلوک مشفقانہ ہوتا۔ ان کے دکھ درد بیماری میں ان کی کفالت اور تیمارداری کرتے۔ علاج میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھتے۔ کوئی ملازم یا اس کا خاندان بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی مہربانیاں سب پر عام تھیں۔ کوئی نوکر دھوپ میں کھڑا ہوتا تو اسے چھاؤں میں آنے کی ہدایت کرتے۔ ملازموں کی بہتات ہونے کے باوجود وہ اپنا کام خود کرتے اور نوکروں کے آرام کا خیال کرتے۔

بیواؤں، یتیموں کے لیے وظیفے جاری کرتے۔ ان کی شادی بیاہ میں دل کھول کر امداد کرتے۔ مزدوروں، کاشتکاروں، بے سہاروں کے وہ مددگار

۱۔ جشنِ عثمانی۔ سلور جوبلی۔ آصف سابع ص ص ۲۷ - ۲۸

تھے۔ ساہوکاروں، مہاجنوں کے ظلم اور غلامی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی حکومت میں کوئی مظلوم ظالم کے ہاتھ کچلا نہیں جا سکتا تھا۔ ایسے ہمدرد، انسان دوست، حکمران کے ساتھ کون محبت نہ کرتا۔ وہ غریبوں نادروں، مظلوموں کے لیے "ظل اللہ" تھے۔ ایک رعایا پرور بادشاہ تھے۔ روشن ضمیر، روشن دماغ، جفاکش عثمان علی خاں دن رات محنت اور سرگرمی سے کام کرتے تاکہ ان کی ریاست اور ان کی رعایا خوش حال رہ سکے۔ آج کا کام کل پر نہ چھوڑتے خواہ کتنی ہی رات ہو جائے۔ ان کی پیشی میں مثلوں کا انبار کبھی جمع ہونے نہیں پاتا تھا۔ وہ تب تک آرام نہ لیتے جب تک کہ سارا کام ختم نہ ہو جاتا۔ آرام طلبی کو ناپسند کرتے تھے۔ اور وقت کی پابندی ان کی بیش بہا صفت تھی۔ ان کے کام کی کثرت دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ اس مصروفیت کے باوجود وہ اپنی رعایا کی مختلف تقاریب میں شریک ہونے کے لیے وقت ضرور نکال لیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ عثمان علی خاں نے کام کی زیادتی سے گھبرا کر گرمیوں میں بھی کبھی کسی پہاڑ پر جانے کا خیال نہیں کیا۔ نہ طاعون جیسی وبا پھوٹنے پر وہ اپنی رعایا کو چھوڑ کر کنگ کوٹھی سے باہر نہیں گئے۔ انھیں کسی بھی وقت کام کے سوا عیش و عشرت کا خیال نہیں آیا۔ ان کی اسی محنت اور سرگرمی کے باعث ریاست حیدرآباد ایک خوش حال اور متمول ریاست اور بادشاہ دنیا کا سب سے بڑا دولت مند بادشاہ تسلیم کیا گیا۔"[1]

امور سلطنت میں وہ کبھی غفلت اور بے پروائی نہیں کرتے تھے۔ اپنی

۱۔ ارمغان عثمانی

ذمہ داریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہر محکمے اور شعبے کے انتظام کا گہرا مطالعہ کرتے اور کمزوریوں کی اصلاح کرتے تاکہ کہیں بے راہ روی یا کوتاہی نہ ہونے پائے۔

ٹائمز آف انڈیا کے الفاظ میں " اس امر سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریاستِ حیدرآباد سب ریاستوں سے زیادہ متمول اور خوش حال ریاست ہے۔" اور اس خوش حالی کا سبب ریاست کے جفاکش حکمران کی ان تھک محنت تھی۔ عثمان علی خاں کی خصوصیت تھی کہ کبھی بیٹھ کر کام نہیں کرتے تھے۔ کھڑے کھڑے ہی کاغذات دیکھتے اور ان پر پنسل سے لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کی تحریر صاف ہوتی باوجودیکہ وہ جلد جلد لکھ جاتے تھے۔

اپنے خطوط اپنے ہاتھ سے کھولتے اور ہر خط کا جواب اسی خط پر پنسل سے لکھ دیا کرتے۔ ایسے اہم فرامین بھی وہ لفافوں کے پشت پر پنسل سے تحریر کرتے۔ کہتے ہیں کہ دیا سلائی کے ڈبیوں کے اندرونی حصوں پر وہ فرمانِ شاہی تحریر کر دیا کرتے تھے[1]

مہمان نواز تھے اور ہر وقت ریاست میں آنے والے مہمانوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے۔ ان کے قیام و طعام کے لیے بہترین آرام دہ مہمان خانے یا گیسٹ ہاؤس تھے اور مہمان نوازی کے لیے افسران بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ بہ نفسِ نفیس خود ان کی خاطر داری کرتے۔ ان کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ مہمان

۱۔ یعقوب علی عرفانی (مرتب) حیاتِ عثمانی جلد اوّل ص ۳۶۵

کے لیے اپنی ذاتی چیز بھی ان کے آرام کے لیے مرحمت فرما دیتے۔ ایک بار مہاراجہ کے بیٹے خواجہ پاشا ان سے ملاقات کے لیے آئے۔ واپسی کے لیے موٹر نہیں تھی۔ آپ نے فوراً اپنی خاص موٹر انھیں پیش کردی کہ گیسٹ ہاؤس تک پہنچا آئے۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامچے میں عثمان علی خاں سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے "میں ساڑھے تین بجے کنگ کوٹھی پر گیا۔ اور اعلیٰ حضرت سے رخصتی ملاقات چاہی۔ ظلِّ سبحانی کسی بہت ضروری کام میں مصروف تھے مگر فوراً باریابی کی اجازت دے دی اور باتیں کرتے ہوئے باہر صحن میں تشریف لے آئے جہاں بہت تیز دھوپ تھی۔ میں نے کہا "ظلّ اللہ! یہاں بہت دھوپ ہے"، مگر حضرت نے کچھ خیال نہیں فرمایا۔ ان کی ہر ادا میں سپاہیانہ شان تھی۔ وہ دوسرے والیانِ ریاست کی طرح آرام طلب نہیں" [۱]

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ دکن کے مزاج میں کس قدر کسرِ نفسی اور سادگی تھی اور کیسے اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد جنھوں نے میر محبوب علی خاں کے عہد میں اعلیٰ مراتب پائے اور جن کے سامنے عثمان علی خاں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور تخت نشین ہوئے عثمان علی خاں کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھپا نہ تھا۔ انھوں نے ان کے اخلاق اور کمالات کا ذکر یوں کیا ہے "بے خبر لوگ اعلیٰ حضرت کی صفاتِ حسنہ سے واقف ہوں اور ان پر غور کریں۔ میں نے تو اتنی صفتوں کا آج تک کوئی بادشاہ نہیں دیکھا"۔

۱۔ جشنِ عثمانی ۔ ارمغانِ عثمانی

عقل و دانش کے اس پتلے نے اس طرح دوست و دشمن کو ایک گھاٹ پر پانی پلایا کہ دور اندیش تجربہ کاروں نے اکثر آپ کی فراست و فہم کا لوہا مان لیا۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کام میں شہریار کی ذاتی دلچسپی اور شفقت نے سلطنت کی تمام گتھیوں کو یک قلم میں سلجھا دیا۔ یار و اغیار نے سمجھ لیا کہ اب حیدرآباد میں مفت خوروں کا گزارہ نہیں۔ عثمان علی خاں بہ ذات خود ہر کام میں ماہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں حیدرآباد کی آمدنی نے ہمیشہ سے زیادہ ترقی کی۔ روپیے کے معاملے میں تمام باریکیوں کو ایک تجربہ کار کہنہ مشق ماہر سے زیادہ تیزی سمجھ جاتے ہیں"۔[1]

نظام ہفتم کے دل میں انسان تو انسان حیوانوں کے لیے بھی ہمدردانہ جذبات موجزن تھے۔ ایک بار سواری شاہانہ کے ساتھ ایک بکرا ٹکرا گیا' انھوں نے فوراً موٹر روکنے کا حکم دیا اور زخمی بکرے کو اپنی موٹر میں کوٹھی لے آئے اور علاج کروایا۔ مدت تک یہ بکرا ان کی شہ نشین سے قریب بندھا ہوا رہتا تھا۔[2] ولی عہدی کے دور میں ایک گھوڑی ان کی سواری کے لیے مخصوص تھی۔ ایک بار بیمار ہو گئی تو کسی نے تجویز پیش کی کہ اسے بندوق کا نشانہ بنا دیا جائے یہ مہذب دنیا کا دستور تھا کہ جانور کو تڑپتا نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن عثمان علی خاں کے نرم دلی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ قبل از مرگ گھوڑی کے لیے ایسا حکم دیں۔ انھوں نے فرمایا کہ "اپنی عزیز گھوڑی کے لیے قبل از مرگ ایسا حکم دینے سے مجبور ہوں۔ طبعی موت سے اگر وہ مرتی تو یہ قضا و قدر کے احکام ہیں مگر ایک ذی روح حیوان کو اور وہ بھی جس کی عمر نا لائق ولی عہدی کے

۱۔ حیات عثمانی۔ جلد اول ص ۳۶۵
۲۔ حیات عثمانی ۔ // ۔ ص ۳۶۴

ساتھ میری خدمت میں گزری ہے، میرا قلب بندوق کا نشانہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ علاج کے ذریعہ اس کی تکلیف کو کم کرنے کی امکانی کوشش اس وقت تک کی جائے جب تک وہ شاہی اصطبل میں سانس لے رہا ہے[1]۔"

عثمان علی خاں نے اونٹ کی قربانی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک بار انھوں نے دیکھا کہ ایک عرب نے اپنے خنجر سے اس کے گلے پر وار کیا اور اونٹ کی گردن سے خون کے فوارے بہنے لگے تو اس منظر کی وہ تاب نہ لا سکے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کہنے لگے "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اونٹ کی قربانی کا نظارہ اس قدر دل خراش ہوتا تو میں بھولے سے بھی اس کے دیکھنے کی تمنا نہ کرتا۔ گو قربانی سنتِ ابراہیمی ہے مگر میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں جو اس تکلیف کو دیکھنے کی مطلق قوت نہیں رکھتا، اس لیے بہتر ہوگا اس سنت کو کسی دوسرے طریقے سے ادا کیا جائے"[2]۔

قربانی کے دن ایک گائے کے ساتھ اس کا بچھڑا بھی قربان گاہ میں آیا بچے کو دیکھ کر پوچھا کہ "اسے ماں کے ساتھ رکھنے کی ضرورت کیا تھی"؟ خادم نے کہا اس کی بھی قربانی ہوگی اور ماں کے سامنے اسے بھی خنجر کی لذت سے آشنا کیا جائے گا۔" عثمان علی خاں سے برداشت نہ ہو سکا، فرمایا "اگر تیری لڑکی کو تیری بیوی کے سامنے ذبح کیا جائے تو کیا وہ اس کی متحمل ہوگی؟ اس گائے اور بچے کو شاہی گاؤ خانہ بھجوا دیا جائے تاکہ یہ پرورش پا کر اپنی طبعی عمر کو پہنچ سکے[3]۔" اس طرح گائے کشی اور اونٹ کی قربانی کو ممنوع قرار دیا[4]۔

۱۔ حیاتِ عثمانی ۔ جلد اوّل ص ۳۶۵
۲۔ ایضاً ″ ص ۳۶۵
۳۔ ایضاً ″ ص ۳۴۷
۴۔ بستانِ آصفیہ حصہ چہارم ص ۷۴

خدا کی بے زبان مخلوق کے ساتھ رحم دلی کے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل کس قدر نرم تھا کہ کسی حیوان کی تکلیف کو بھی وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

عثمان علی خاں کی سیرت و کردار، بلند ہمتی، اخلاق و آداب، ان کی شخصیت کے وہ نمایاں پہلو ہیں جن کے سامنے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کی جبینیں جھک جاتی تھیں۔ ان کے عظمت و جلال کے پیچھے ہمیں ایک ایسا درد آشنا دل نظر آتا ہے جو کسی کا دکھ درد برداشت نہیں کر سکتا۔ ان کی سیدھی سادی طرز معاشرت، انسان کو سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کرتی ہے عیش و عشرت اور دیگر تماشوں سے۔ بیزار یہ انسانیت کا مجسمہ صرف اسی فکر میں دن رات بسر کرتا کہ انسان کو انسانیت کا پیکر بنا دے۔ اخلاق پاکیزہ اور ضبط نفس راست بازی کا سبق پڑھائے۔ کمخواب و حریر و دیبا کی خلعتوں کے بجائے سادہ ترین لباس اور سادہ غذا کو اپنایا۔ پُرشوکت بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود عثمان علی خاں نے پستیوں کو گلے لگایا اور اسلام کے حقیقی معنی کو دنیائے اسلام پر آشکار کیا۔

سادگی:

سادگی میں آج دنیا بھر میں خالق کی قسم ؛ میر عثمان علی خاں سا کوئی سلطان نہیں

(- میر کاظم علی-)

تکلف و نمائش سے دور نظام ہفتم کی زندگی اپنی سادگی کی آپ نظیر ہے وہ ایک جلیل القدر بادشاہ تھے لیکن اپنی زندگی نہایت سادگی سے بسر کی۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا بھی تکلفات سے بھی احتیاط کرنے لگی ۔ اور فضول خرچیوں سے دُور رہنے لگی ۔ ان کا لباس بادشاہوں کا سا نہ ہوتا تھا۔ بلکہ سادہ کُرتا پاجامہ اور شیروانی پر مشتمل ہوتا ۔ سنت نہال سنگھ جرنلسٹ نے سوچا تھا کہ دولتِ آصفیہ کا تاجدار مغلیہ سلاطین کی طرح تکلفات کا پیکر ہوگا ۔ لیکن جب حاضری ہوئی تو انھوں نے عثمان علی خاں کو سادہ سے لباس میں دیکھا اور حیران رہ گئے ۔

عثمان علی خاں کہتے تھے کہ "میرے آقا سرورِ کائناتؐ کا لباس اس سے بھی زیادہ معمولی ہوتا تھا"[1]

تاجدارِ دکن کو کس بات کی کمی تھی لیکن ان کی پوشاک دیکھ کر ان کی کسرِ نفسی سادگی اور فقیری کے آگے سر جُھک جاتا تھا۔ وہ شاہوں کے شاہ تھے لیکن درویش صفت اور شان و شوکت سے دُور۔ ان کی اس سادگی پر دیکھنے والوں کے دل عقیدت و خلوص سے لبریز ہو جاتے۔ ان کے وقار و عظمت کے سامنے بڑے بڑے کانپ جاتے اور پاسِ ادب سے جُھک جاتے۔ لیکن اپنی خانگی زندگی میں یہ پُر جلال بادشاہ فقیری کا لبادہ اوڑھے رہتا۔ اسے یہ بھی پروا نہ ہوتی کہ لوگ کیا کہیں گے ۔ اکثر لوگ ان کی اس سادہ زندگی کے غلط معنی نکالتے اور انھیں بخیل سمجھتے تھے۔ لیکن یہ غلط تھا۔ دولت جو انھوں نے جمع کی تھی وہ ان کی رعایا کی امانت تھی جسے اپنی ذات پر استعمال کرنا وہ گناہ سمجھتے تھے ۔ لاکھوں روپے انھوں نے اپنی رعایا کے لیے خرچ کر ڈالے لیکن خود ایک عام آدمی کی طرح قناعت سے کام لیتے رہے۔ دین کی خدمت

۱۔ حیاتِ عثمانی ۔ ص ۳۳۲

کے لیے ان کے قریب دولت کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن اپنی ذات کے لیے کفایت شعاری سے کام لیتے رہے۔

ان کے کپڑے بالکل معمولی قسم کے اور کم قیمت کے ہوتے۔ سر پر پُرانی رومی ٹوپی ہوتی جس کا پھندنا غائب ہوتا۔ خلوت میں وہ صرف معمولی سفید کرتا پاجامہ پہنتے لیکن باہر جانا ہوتا تو شیروانی پہن لیتے جس کے اوپر کے بٹن اکثر کھلے ہی رہ جاتے۔ پیروں میں معمولی سلیم شاہی جوتے ہوتے تھے[1]۔ حیدرآباد کی بنی ہوئی چیزوں کو فخر سے استعمال کرتے۔ سگریٹ "چارمینار" کا پیتے اور صابن گولکنڈہ سوپ فیکٹری کا استعمال کرتے۔ انھوں نے صرف اپنی ضمیر کی آواز سنی اور وہی کرتے رہے جو بہتر سمجھتے تھے۔

ان کی غذا بھی نہایت معمولی ہوتی۔ غریبوں کا سا سادہ کھانا کھاتے، غریبوں سا سادہ لباس پہنتے تاکہ رعایا سے قرب محسوس کرسکیں اور رعایا ان سے تکلف نہ برتے۔ مہنگی چیزوں کے استعمال سے انھوں نے ہمیشہ گریز کیا لیکن دین و ملت کی خدمت کے لیے اپنی دولت لٹادی۔ جامع مسجد کے صحن کے ایک چوتھائی فرش کی تعمیر کے لیے امام مسجد نے ۴ لاکھ روپے کی امداد چاہی آپ نے مسجد کا پورا فرش تعمیر کروا دیا اور اپنے شاہی خزانے سے روپیہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کی جامعات، ادارے اسکول اور علمی کاموں کے لیے لاکھوں کروڑوں کی امداد دی[2]۔

کنگ کوٹھی کے سارے نفوس اعلیٰ سے ادنیٰ تک کے لیے ان کی سخاوت عام تھی۔ سطوتِ شاہانہ کے باوجود ان کی سادہ زندگی، فیاضی

۱۔ تحریر خواجہ حسن نظامی ص ۷۸ جشنِ عثمانی
۲۔ [illegible]

فرض شناسی، غربا نوازی اور نیکو کاری بے مثال تھی۔ ان کی سادگی اسلامی سادگی کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کی غریب رعایا اپنے اس غریب پرور، فقیر منش، درویش صفت بادشاہ کی جاں نثار تھی۔

عدل و انصاف: عثمان علی خاں عادل اور منصف مزاج تھے۔ فریادیوں کی فریاد رسی کرتے۔ آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ تقریر، آزادیٔ پریس اور آزادیٔ مذہب کی ہر کسی کو اجازت تھی۔ ہندو رعایا کی دل داری کے لیے انھوں نے گائے کی قربانی کو ممنوع قرار دیا اور مذہبی رواداری کا ثبوت دیا۔ کسی اخبار کے جرنلسٹ نے ایک بار ان سے دریافت کیا کہ "کیا حضور کی سلطنت میں ہندو زیادہ ہیں"؟ آپ نے ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا "مجھ کو اس مذہبی امتیاز کی گفتگو سے سخت نفرت ہے۔ میرے لیے رعایا میں نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔ دونوں میرے بچے ہیں، مجھ کو ان سے الفت ہے اور ان پر فخر ہے۔ میری دلی تمنا ہے کہ اپنی رعایا کو ترقی کرتے دیکھوں"۔ ان کے عہدِ حکومت میں کبھی کسی کو قتل کا حکم نامہ نہیں دیا گیا۔ وہ منصف مزاج تھے لیکن خدا کی عدالت کو سب سے بڑی عدالت سمجھتے تھے۔

مذہبی رواداری اور بے تعصبی: [1] آصفِ سابع کی مذہبی رواداری آج کے زمانے کے لیے عبرت ہے۔ آصف جاہی سلطنت کی یک جہتی، عوام دوستی اور رواداری یوں بھی حیدرآباد کی امتیازی خصوصیت رہی ہے لیکن اپنے دورِ حکومت میں عثمان علی خاں نے غیر مسلموں سے رواداری کی ایسی مثال قائم کی کہ جس سے تنگ دل ہندو بھی انکار نہیں کر سکتے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی

۱۔ جشنِ عثمانی، سلور جوبلی آصفِ سابع ص ۱۰۳
"منشور" سال گرہ نمبر ۱۳۵۲ھ
رہبرِ دکن سال گرہ نمبر ۱۳۴۹ھ

اور خوش حالی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں تھی ۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو قوم کو بھی اعلیٰ مراتب حاصل تھے ۔ جاگیریں اور منصب حاصل تھے ۔ آپ کے دورِ حکومت میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد وزیراعظم تھے ۔ وینکٹ راما ریڈی کوتوالِ بلدہ ۔ مسٹر تاراپور والا مشیر مال حضورِ نظام تھے ۔ راجہ نرسنگ راج بہادر عالی، مہتمم سیونگ بینک نظامت ٹپہ کی خدمت پر مامور تھے ۔ وہ مذہبی تعصب سے بلند تھے اور ساری رعایا پر یکساں شفقت مرحمت فرماتے تھے وہ اسلامی اصول کے پابند تھے لیکن دوسرے مذاہب کا بھی احترام کرتے تھے ۔ کسی طبقے کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ ایک دوسرے سے اجنبی ہیں ۔ جہاں انھوں نے مسجدوں، عاشورخانوں، درگاہوں کی امداد کی، وہیں مندروں، گرودواروں، کلیساؤں اور آتش کدوں کی مالی سرپرستی بھی کی ۔ پارسیوں کو نوروز کی، عیسائیوں کو کرسمس کی، سکھوں کو گرونانک کے جنم دن کی اور ہندوؤں کو دیوالی دسہرہ اور دوسرے تہواروں کی اور مسلمانوں کو عیدوں میلادوں کی تعطیل ملتی تھی ۔ ہر مذہب کے تہوار پر میر عثمان علی خاں اپنے کلام کے ذریعے عوام کو مبارک باد بھجواتے تھے ۔

رعایا کی خوشیوں میں ان کی شادی بیاہ اور مذہبی تقاریب میں کھلے دل سے شریک ہوتے تھے ۔ مسرت و شادمانی کے ساتھ ماتمی اور غمی میں ان کا غم بانٹتے تھے ۔ میت کے ساتھ چند قدم پیدل چلتے تھے ۔ انسانی ہمدردی ان کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا ۔ اکثر یوں بھی ہوا کہ میت کی تجہیز و تکفین کے مراسم بھی خود عثمان علی خاں نے ادا کیے ۔

نہ ہندو مسلم بھائی چارہ کے علمبردار تھے۔ انھوں نے غیر مسلم قوموں کو اطمینان دلایا کہ جہاں تک تمہارے معاملات کا تعلق ہے ہر کو لا مذہب سمجھو اور یقین رکھو کہ تمہارے ساتھ وہی برتاؤ ہوگا جو ہم مسلمانوں کے ساتھ کریں گے۔[1]

پست اقوام سے کہا "میری نظر میں نہ کوئی قوم بلند و پست ہے اور نہ کوئی اچھوت ہے۔ میں سب کو بہ حیثیت بنی نوع ایک طرح سے برابر سمجھتا ہوں" ایک بار ہندوؤں کے مذہبی پیشوا نے انھیں یقین دلایا تھا کہ ہم حکومت کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کے خلاف ہیں جو ریاست میں بدنظمی پھیلانے کے ناپاک ارادے رکھتے ہیں۔ ہم ہمیشہ اپنے عالی قدر حکمران کا ساتھ دیں گے"۔

حضور نے فرمایا "جس طرح ہمارے دل میں ہمارے مذہبی پیشواؤں کی عزت و قدر ہے اسی طرح دوسرے مذاہب کے مذہبی مقتدا ہماری نظر میں عزت کے مستحق ہیں"۔[2] دولت آصفیہ مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں اور ان کے مذہبی رہنماؤں اور رسومات کا برابر احترام کرتی تھی۔

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۵۲ھ کو میر عثمان علی خاں نے اعلان کیا "اس امر کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ میرے بعض ذاتی اعمال اور افعال کی وجہ سے پبلک میں غلط فہمی نہ پیدا ہو یا بعض ناعاقبت اندیش اور نافہم طبقہ اصل واقعات کو رنگ دے کر دوسری شکل میں پیش نہ کرے۔ اس لیے اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا خاندان، میرا مذہب اور ذاتی عقائد جو کچھ

۱۔ فرمان مبارک
۲۔ اخبار منشور سالگرہ نمبر ۱۳۵۲ھ

ہیں ان کی توضیح کی اس جگہ چنداں ضرورت نہیں ہے کہ یہ دو عالم پر آشکار ہیں مگر بہ حیثیت رئیس میں ایک دوسرا مذہب بھی رکھتا ہوں جس کو "صلح کل" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ میرے زیر سایہ مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور ان کے معابد کی نگہداشت میرے آئین سلطنت کا ایک زمانے سے وطیرہ رہا ہے۔ میرا اور میرے بزرگوں کا شعار رہا ہے کہ دنیا کے سب مذاہب کو ایک نظر سے دیکھا جائے۔ اس مشرب پر مجھے اور میرے بزرگوں کو ناز رہا ہے اور رہے گا"[۱]

اپنی بے مثل رواداری سے انھوں نے ہر قوم و فرقے کی امداد کی تاکہ کوئی فرد ان کی نوازشوں سے محروم نہ رہ جائے۔

انھوں نے سکھ رعایا سے کہا "یہ امتیاز اس ریاست کو حاصل ہے کہ سکھوں کے تمام گردواروں کے لیے میری حکومت سے معاش مقرر ہے۔ ان کے مدارس کو میری گورنمنٹ سے امداد ملتی ہے"۔[۱]

عیسائی رعایا سے فرمایا "عیسائیوں کے جتنے مشن ہیں ان کو بھی ہر ایک مذہب کی طرح تبلیغ کی آزادی حاصل ہے۔ ان اکثر مدرسوں کو میری گورنمنٹ سے امداد ملتی ہے"۔[۱]

سلطان دکن کا بہ حیثیت بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ جو تعلق تھا اس سے سبھی واقف تھے۔ ہر فرد اپنے مذہبی عقیدے میں آزاد تھا۔ اور حکومت اپنا فرض سمجھتی تھی کہ ان کی مذہبی آزادی میں دخل انداز نہ ہو۔

۱۔ اخبار منشور۔ سال گرہ نمبر ۱۳۵۲ھ

اسلام "صلح کُل" کا مذہب ہے۔ رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب کے احترام اور حفاظت کا حکم دیتا ہے۔ عثمان علی خاں کے فرمان جو انھوں نے اپنی رعایا کے لیے جاری کیے وہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہیں۔ اپنے عقیدے، اپنے مذہب، اپنے دین و ایمان پر قائم رہتے ہوئے بھی انھوں نے دوسرے مذاہب اور عقاید کا احترام کیا۔ اسلامی مساوات کا سبق انھوں نے کبھی نہیں بھلایا۔ ان کے قلب و نظر میں دنیا کے ساتھ دین بھی شامل تھا۔ اپنی مملکت میں سانس لینے والے ہر قوم و ملّت کے انسان کے حقوق کے وہ محافظ تھے۔ ان کا سلوک سب کے ساتھ یکساں تھا۔ ان کی محبت اپنی رعایا کے ساتھ ایک شفیق باپ کی طرح تھی۔ ہر وقت وہ ان کی تکالیف کو دور کرنے اور آسائش مہیا کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ اپنی وفادار، عقیدت مند رعایا پر انھیں فخر تھا۔

رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے انھوں نے ٹرسٹ قائم کیے جس کے ذریعے غریبوں، محتاجوں، بے سہاروں کی امداد کی جاتی۔ طلبہ کو وظیفے دیے جاتے بیواؤں کو سہارا دیا جاتا۔ ساتھ ہی خانوادۂ آصفی کے صاحب زادوں صاحب زادیوں کو بھی اس سے مستفید ہونے کا موقع ملتا۔ ملک اور بیرونِ ملک مختلف مسلم اور غیر مسلم اداروں، اسکول، جامعات کو لاکھوں روپیوں کے وظائف عطا کیے گئے۔ ملک کی دولت ملک کی رعایا کی فلاح و ترقی کے لیے ہی صَرف کی جاتی رہی۔ ان کی فیاضی کی کوئی حد نہیں تھی۔ برما کے مسلمانوں نے بہادر شاہ ظفر کی یادگار قائم کرنے کا مطالبہ کیا تو نظام دکن کا نام عطیات دینے والوں میں سرِ فہرست تھا۔ بلا امتیازِ مذہب

یا قوم انھوں نے بے شمار اداروں کی سرپرستی کی۔ غیر مسلم مذہبی ادارے جن میں دھرم شالے، گرجا، آتش کدے، گرودوارے شامل ہیں۔ ان کی تعداد ۱۲ ہزار تھی جن کی امداد سرکار سے مقرر تھی۔ اس کے برخلاف مسلم ادارے جن میں مساجد، عاشور خانے، درگاہیں، خانقاہیں تھیں تعداد میں صرف پونے پانچ ہزار تھے جن کی سرکار سے تنخواہ اور آمدنی مقرر تھی۔

عثمان علی خاں کے عہد میں ناقوس کی جھنکار کے ساتھ مسجد میں اذان کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ گرجا کے گھنٹے گونجتے۔ اور آتش کدوں میں آگ سلگتی رہتی تھی۔ آصف جاہی امرا میں کائستھ، چھتری، برہمن، ریڈی، سنی، شیعہ سبھی شامل تھے جنھیں بڑی بڑی جاگیریں اور مناصب حاصل تھے۔ کچھ پارسی، انگریز اور سکھ بھی تھے جو پشت ہا پشت سے منصب حاصل کر رہے تھے۔[۱]

ہندو مسلم حیدرآباد میں اس قدر گھل مل کر رہتے تھے کہ ان میں اجنبیت کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ خاندانی دوستی پیڑھی در پیڑھی چلی آتی تھی۔ بادشاہ کی طرح ان کے دل بھی تعصب سے پاک تھے۔ ایک دوسرے کی تقریبوں میں شریک ہوتے، ایک دوسرے کے رسومات کو اپناتے، لباس بات چیت رہن سہن سب یکساں ہوتا تھا۔

بادشاہ " واحد قومیت " کا تصور رکھتے تھے اس لیے مساوات زندگی کے ہر شعبے، ہر دل، ہر چیز میں داخل تھی۔ عثمان علی خاں کی سال گرہ کی تقریب ہر سال وقت مقررہ پر نمازِ شکرانہ کے بعد منائی جاتی (مغلیہ دور میں بھی یہ دستور تھا) اور پھر اراکینِ سلطنت کو ان کی خدمات کے اعتراف میں خطابات

۱۔ حیاتِ عثمانی

دیے جاتے تھے ۔ اس میں انھوں نے اصلاح کردی ۔ خطابات کی فہرست کم کردی ۔ شاہی خاندان کے لیے "جاہ" کا خطاب مخصوص تھا ۔ جیسے اعظم جاہ ۔ ریاست کے ممتاز عہدہ داروں کو "جنگ" یا پائیگاہ والوں کو "دولہ" اور اس سے کم درجہ رکھنے والوں کو "ملک" جیسے مہدی یار جنگ ، لطف الدولہ سلطان الملک عماد الملک ۔ ہندو عہدہ داروں کے لیے راجہ بہادر کا خطاب دیا جاتا تھا ۔ دولت آصفیہ کے رزیڈنٹس کو بھی خطابات ملتے تھے ۔ کرک پیٹرک کو حشمت جنگ موتمن الملک افتخار الدولہ کا خطاب دیا گیا تھا ۔ مسٹر رسل کو ثابت جنگ اور مسٹر مٹکاف کو منتظم الدولہ کے خطاب سے نوازا تھا ۔ ان کے بعد یہ سلسلہ موقوف کردیا گیا ۔

معاشرتی اصلاحیں : میر عثمان علی خاں ذہنی بیداری چاہتے تھے ۔ پرانے رسم و رواج اور فضول خرچیوں کو دور کرنا چاہتے تھے ۔ جہالت کے اندھیروں سے عوام کو نکالنا چاہتے تھے ۔ تنگ نظری کی جگہ روشن خیالی چاہتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے ریاست کے مختلف بے ہودہ کھیل تماشوں کو اپنے فرمان کے ذریعہ ختم کروادیا ۔ جن میں تیتر بٹیر اور مرغوں کی لڑائیاں بھی شامل تھیں ۔ ناچ گانے جن سے ذہن پراگندہ ہوتے تھے ۔ وہ رکوادیے گئے ۔ ہر طرح کی فضول خرچی کی مخالفت کی ۔

چناں چہ ان کی روشن خیالی کے سبب قدیم رسوم و رواج اور توہمات کا انسداد ہوا ۔ اور لوگوں میں ذہنی اور روحانی بیداری پیدا ہوئی ۔ پستی ، تنگ نظری اور وہم پرستی کے اندھیرے ہٹ گئے اور دکن تعمیری ، علمی اور روحانی

ترقی کے راستوں پر گامزن ہوا۔ دکن کی گلیاں اور شاہراہیں، ملک کے باشندوں کے دل و دماغ، ان کی سوچ اور تخیل سب اس بیدار مغز بادشاہ کی بلند حوصلگی اور ترقی پسندی سے پر نور ہو گئے۔ سال گرہ منانے کا دستور قدیم زمانے سے ہوتا چلا آیا ہے چنانچہ عثمان علی خاں کی سال گرہ کے موقع پر چندہ جمع کر کے رعایا خوشیاں مناتی تھی۔ ناچ گانوں کی محفلیں جمتی تھیں۔ عثمان علی خاں نے اس بے جا صرفے کو ناپسند کیا اور فرمان جاری کیا کہ اس روپیے کو غربا اور مسکینوں کے لیے خرچ کریں۔ انھیں پارچہ اور غلہ فراہم کریں اور وظائف تعلیمی جاری کیے جائیں۔ رقص و سرور کی محفلیں بند کی جائیں جس سے سوسائٹی پر برا اثر پڑتا ہے۔

ایک طرف اپنی غریب رعایا کی بھلائی کا خیال اور دوسری طرف معاشرتی اصلاح۔ جو نذرانے اعظم جاہ اور معظم جاہ کی شادیوں کے موقع پر رعایا کی طرف سے پیش کیے گئے، ان کو انھوں نے رعایا کے مفید کاموں پر خرچ کرنے کا حکم دیا۔ ہر وقت رعایا کے مفاد ہی کا خیال کیا۔

اس علم پرور بادشاہ نے زندگی بھر علم کی ترقی اور سماجی بھلائی اور رعایا کی بہتری کے لیے کام کیا۔ عوام کے ذہنوں کو بیدار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ انھیں علم سے روشناس کروایا جائے۔ چنانچہ لغویات سے روک کر انھوں نے ملک کے گوشے گوشے میں علم کی شمعیں روشن کیں۔ مدارس کھولے گئے، صنعت و حرفت کے ادارے چلائے جانے لگے۔ کالج قائم ہوئے۔ دینی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ ان کی علم نوازی نے دکن کے گوشے گوشے کو علم سے بہرہ ور کر دیا۔

عثمان علی خاں کا ابرِ کرم دکن ہی پر نہیں بلکہ دکن کے باہر بھی برستا رہا۔ اپنے چمن کو سرسبز کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے چمن بھی شاداب کرتے گئے۔ لڑکے لڑکیوں کے علاوہ بالغوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہوا۔ بہرے گونگے بچوں کو سماج میں اپنا مقام دلوانے کے لیے انھوں نے ان کے لیے خاص خاص آلات مہیا کیے تاکہ وہ کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اچھوتوں کو سماج میں اٹھانے کے لیے مختلف اصلاحات کیں۔ بے کار لوگوں کو کام سے لگایا گیا۔ اہلِ ہنر کو ذرائعِ معاش دلوائے گئے۔ شہر اور دیہات میں مختلف تنظیموں کے تحت رعایا کو مختلف مسائل کے حل کرنے کے لیے سہولتیں پیدا کی گئیں۔

پرائمری اسکول اور ہائی اسکول سے نکل کر بچوں نے کالج میں داخلے لینے شروع کیے۔ زنانہ اسکول کھولے گئے تاکہ لڑکیاں لڑکوں کے شانہ بہ شانہ ملک کی ترقی میں حصہ لیتی رہیں۔ مشہور علمی درس گاہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے لاکھوں ملکی اور بیرونی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم مہیا کی گئی۔ جہاں انھیں ان کی مادری زبان اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا گیا۔ سوتے ذہنوں کے دریچے کھلے۔ صاف شفاف ماحول میں صاف ستھری ہوائیں چلیں تو زندگی بھی پنپنے لگی۔ نئے آفاق پیدا ہوئے، نئی راہیں بنتی گئیں اور دکن کے نوجوان تعلیم حاصل کر کے ملک میں اعلیٰ مدارج حاصل کرنے لگے۔ پھر تو حیدرآباد کا ماحول یوں بدلا کہ ہندوستان بھر سے علما، فضلا، دانش وریہاں کا رُخ کرنے لگے جنھیں عثمان علی خاں نے فراخ دلی سے خوش آمدید کہا۔ ان کی فیاضیاں اور نوازشیں سب کے لیے عام تھیں۔ علم کے رسیا تھے، دل لگاتے تھے، شاعر اور ادیب حیدرآباد

اور اس کے علم نوازنہ بادشاہ کی سرپرستی میں آ آکر بسنے لگے۔ شعر و سخن کی محفلیں سجنے لگیں۔ نوجوان ادیب اور شاعر جامعہ عثمانیہ نے پیدا کیے۔ حیدر آباد کے اس ماحول میں وہ رنگ بھرا، وہ نور بکھیرا کہ ہندوستان بھر میں دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے بعد دکن کا دبستان اور اردو زبان و ادب کے لیے اپنا ایک مقام پیدا کر گیا اور آج بھی اس سرزمین دکن کی گود میں شعر و سخن کی محفلیں جمتی ہیں تو لوگ جوق در جوق جمع ہو جاتے ہیں۔

یہ کرشمہ عثمان علی خاں کا ہی تھا۔ اس چشمہ علم نے لاکھوں علم کے پیاسوں کو سیراب کر دیا۔ جامعہ عثمانیہ، اردو زبان، دائرۃ المعارف اور دارالترجمہ علمی دنیا میں ان کے بڑے کارنامے ہیں۔ اردو زبان عثمان علی خاں کی ہمیشہ احسان مند رہے گی کہ انھوں نے اسے دفتری، عدالتی، ڈاکٹری، انجینئری کی زبان بنا کر ثابت کر دکھایا کہ اردو کا دامن کسی دوسری غیر ملکی زبان سے تنگ نہیں۔

عثمان علی خاں ایک مدبر بادشاہ تھے۔ حکیم السیاست تھے۔ روشن دماغ بادشاہ کی اعلیٰ ذہنی اور سیاسی صلاحیتوں کو ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ سراہا جاتا تھا۔ کوئی بھی سیاسی یا ملکی معاملہ ہو، قومی یا مذہبی مسئلہ ہو وہ غور و فکر سے اُسے سلجھا دیتے تھے۔ ان کے قوتِ فیصلہ کے بارے میں خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا "ان کے قوتِ فیصلہ کا یہ عالم تھا کہ ہر بات کا فیصلہ ایک سکنڈ میں کر دیتے تھے۔ میں اعلیٰ حضرت سے بارہا مل چکا ہوں مگر جب ملتا ہوں ان کی شخصیت کا مجھ پر ہمیشہ ایک خاص اور نیا اثر ہوتا ہے۔ ان کی گفتگو کنول

کا پھول ہوتی ہے جو پانی کی سطح پر تیرتا نظر آتا ہے۔ مگر اس کو جڑ پانی کی تہہ کے اندر ہوتی ہے۔ یہ شخص عام انسانوں سے کچھ اونچا ہی معلوم ہوتا ہے۔ گو بشری پیکر ہے مگر حیرت انگیز کیرکٹر ہے"۔

ایک جگہ لکھا ہے "آج اعلیٰ حضرت سے ملنے گیا تھا۔ ان کی شاہانہ اور فلسفیانہ تقریر سے مستفید ہوا۔ فلسفۂ حیات انسانی کے بڑے بڑے سبق اعلیٰ حضرت کی زبانِ مبارک سے سننے میں آئے۔ ہندوستان میں کوئی فرماں روا بھی اس قابلیت کا نہیں ہے"۔[۱]

حکومتِ برطانیہ کے ساتھ انھوں نے آصفیہ روایات اور دوستانہ تعلقات کا ہمیشہ احترام کیا اور ان کی اعانت اور مدد کے لیے سرکاری، غیر سرکاری، مالی اور فوجی امداد دی اور اپنے خزانے کھول دیے۔ اپنی تخت نشینی کے تیسرے سال ہی جب جنگِ عظیم کی آگ بھڑکی تو انھوں نے بڑے تدبر اور فراست سے کام لیا جس کا اعتراف انگریزی حکومت نے "ہز اگزالٹیڈ ہائی نس" کے خطاب اور " یارِ وفادار دولت برطانیہ کا لقب دے کر کیا۔ اور عثمان علی خاں کے پیام مبارک باد پر بادشاہ برطانیہ نے جواب دیا۔

"اس ہولناک جنگ کے خاتمے پر آپ نے جو محبت آمیز پیام بھیجا ہے، میں اس کی بڑی قدر کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ امپائر کو آئندہ بہ توفیق الٰہی دیرپا امن نصیب ہو۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ جنگ میں میری ہندوستانی افواج نے

۱۔ روزنامچہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء

ایسی شان دار خدمات انجام دیں اور یور اکزالٹیڈ ہائی نس اور دیگر والیان و سرداران ہند نے ہمیشہ غیر متزلزل اور موثر طور پر امداد دی۔ ہندوستان اس کے رؤسا اور اس کے اقوام کی شجاعت کی یاد ایمپائر میں تا ابد تازہ رہے گی۔ میری تمنا ہے کہ افواج حیدرآباد کی گراں بہا خدمت پر آپ کو بذاتِ خود مبارک باد دوں۔"

عثمان علی خاں نے اپنی اولو العزمی اور بلند حوصلگی اور اخلاق سے کام لے کر ان کے اعتماد کو قائم رکھا اور اس نازک موقع پر ان کے وعدوں کے پورا کرنے اور حقوق کے طلب کرنے سے احتراز کیا اور ملک کو کسی قسم کی تحریکوں سے دُور رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ آصفیہ روایات وفاداری اور عہد ناموں کا پاس کیا۔ لڑائی کے خاتمے پر اپنی افواج کے مجروح سپاہیوں کو ان کی جاں بازی کے لیے تمغے دیے۔ اراضیات عطا کیے۔ مقتول سپاہیوں کے پس ماندگان کو وظائف جاری کیے۔ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنی حکومت کے حوالے کی، اور ملازمتیں دلوائیں۔[1]

عثمان علی خاں مذہب اسلام کے شیدائی اور رسول اللہ صلعم کے عاشق تھے۔ اہلِ بیت رسول صحابہ کرام اولیا اللہ اور بزرگانِ دین سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ قرآن مجید پڑھتے یا سنتے وقت آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ قرآن کی اشاعت جب گجراتی زبان میں ہونے لگی تو آپ نے مصنّف کو کثیر رقم عطا کی اور ۵۰ روپے ماہوار پنشن کے طور پر مقرر کی۔ گورمکھی ترجمے کے لیے بھی آپ نے امداد کی۔ محمد پکھتال کو قرآن مجید کے انگریزی ترجمے

۱۔ یعقوب علی عرفانی۔ حیاتِ عثمانی

کے لیے ہزار روپے بطور عطیہ کے دیے اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔

سفر ہو کہ حضر وہ قرآن شریف کی تلاوت ضرور کرتے۔ قرآن کی عظمت کو ٹھیس نہ پہنچنے دیتے۔

احکام اسلامی کا انھیں بہت پاس تھا۔ نماز کا بہت احترام کرتے اور اپنی نمازیں مسجد میں ادا کرتے تھے تو اقبال کا شعر صادق آتا:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

ایک مرتبہ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے ایک شاعر نے آپ کی تعریف میں قصیدہ پڑھنا شروع کیا آپ نے فوراً خواجہ حسن نظامی سے کہا "ان کو روک دو۔ یہ خدا کا گھر ہے یہاں بندوں کی تعریف جائز نہیں سوائے ایک بندے کے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے۔ باقی کسی بندے کی تعریف مسجد میں نہیں ہونی چاہیے۔ اسلام نے خدا کے سامنے ہر شاہ و گدا کو مساوی کر دیا ہے"[۱]

عثمان علی خاں کے احکام تھے کہ جب وہ مسجد یا عیدگاہ میں جائیں تو کوئی ان کی تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہو۔ اور شاہی آداب بجا نہ لائے۔ وہ معمولی انسان کی طرح آتے، نماز کے بعد خوش الحان قاری سے قرآن مجید کی تلاوت سنتے۔

رسم چلی آتی تھی کہ سلاطینِ دکن مسجد میں عبادت کے لیے آتے تو لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے اور آداب بجا لاتے۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ آپ بہت متاثر ہوئے کہ اسلامی مساوات اور خدا کے گھر کی توہین ہے یہ امتیاز وہ اپنی ذات

۱۔ حیات عثمانی ص ۳۱۴

کے لیے روا نہیں رکھ سکتے تھے۔ انھوں نے اس دستور کو سختی کے ساتھ روک دیا کہ "خدا کے گھر میں بادشاہ اور فقیر برابر ہیں"۔ آصفِ سابع اور عام مسلمانوں میں قطعاً کوئی تمیز نہیں ہونی چاہیے۔ سب کو ایک رنگ میں خدا تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونا چاہیے[1]

ایک مرتبہ مجلسِ وعظ تھی۔ ایک درباری نے انہیں دیکھتے ہی بگلوس (کمر پٹہ) باندھ لیا۔ حضور نے دیکھ لیا۔ اور پوچھا "یہ کیوں؟" اس نے ادباً جواب دیا "حضور تشریف فرما ہیں"۔ آپ نے جواب دیا۔ "یہ میرا دربار ہے یا رسول اللہؐ کا دربار ہے؟"[2]

مجلسِ وعظ میں واعظ منبر پر بیٹھے تھے۔ جیسے ہی عثمان علی خاں وہاں پہنچے انھوں نے وعظ روک دیا اور سلام بجا لائے۔ عثمان علی خاں بڑے مکدر ہوئے فرمایا "آپ وعظ کر رہے ہیں یا سلام کر رہے ہیں۔ سلام مجھ پر واجب تھا کہ میں اس مجلس میں آیا تھا نہ کہ آپ پر۔ آپ منبرِ نبوی پر کھڑے ہو کر میرے جیسے دنیا دار کی تعظیم کرتے ہیں۔ کیا دوسرے مسلمان جو اس جلسے میں آتے ہیں ان کو بھی اسی طرح سلام کرتے ہو؟"[3]

یہ تھا عثمان علی خاں کا جذبۂ مساوات اور اخوتِ انسانی، خدا اور اس کے رسولؐ اور عبادت گاہ کا احترام اور اپنی بے مائیگی کا احساس!

رسول اللہؐ کی پیدائش اور وفات، صحابۂ کرام کی وفات کے دنوں، ریاست

۱۔ یعقوب علی عرفانی۔ حیاتِ عثمانی جلد اوّل ص ۳۱۰

۲۔ — ایضاً — ایضاً۔ ۳۱۲

۳۔ — — // — // — ۳۱۲

میں تعطیل عام ہوتی ۔ فاتحہ خوانی ہوتی ۔ میلاد میں رسول صلعم کی ولادت کا جشن ہوتا تو مجلسِ عزا میں حسین مظلوم کی صفِ ماتم بچھتی ۔ اپنے مذہبی عقائد کی پابندی کرتے اور خدائے برتر و بالا کے آگے اپنی رعایا کے لیے خود کو جواب دہ تسلیم کرتے ۔

نظام ہفتم کی بے شمار خوبیوں کا احاطہ کرنا، ان کی فیاضیوں، دوراندیشیوں، تدبر، عزم و استقلال، خلوص و محبت کے جذبات کو چند صفحوں میں بیان کرنا کوزے میں دریا کو سمیٹنے کے مصداق ہوگا ۔

میر عثمان علی خاں کی انکساری

۱۹۲۵ میں میر عثمان علی خاں کے فرمانِ خصوصی کے ذریعہ باغ عامہ میں ایک مسجد تیار کروائی گئی تھی جہاں جمعہ کے دن آپ اپنے شہزادوں کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ مغرب کے وقت اچانک وہ مسجد پہنچے ۔ صدر المہام پیشی مبارک سر امین جنگ بھی ہمراہ تھے ۔ امام مسجد غیر حاضر تھے اور موذن پریشان کہ نماز کیسے ادا ہوگی ۔ آپ نے فرمایا "اذاں دیں ۔ حاضرین میں سے کوئی نماز پڑھادے گا " ۔ اذاں ہوئی تو آپ نے امین جنگ کو اشارہ کیا کہ وہ نماز پڑھائیں ۔ امین جنگ نے ادباً عرض کیا کہ " امامت بادشاہ کا فریضہ ہوتا ہے ۔ سرکار امامت فرمائیں ہمیں سرکار کے ساتھ نماز ادا کرنے کا شرف حاصل ہوگا " ۔ چند لمحے توقف کے بعد آپ نے خود مصلّے پر سنبھل سنبھل کر نماز پڑھائی ۔ سلام پھیر کر کہا " جس کو شبہ ہو کہ اس کی نماز نہیں ہوئی ہے وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے " ۔ پھر موٹر میں سوار ہونے کے بعد امین جنگ سے گویا ہوئے " مولوی صاحب ! آپنے سبھوں کی نماز خراب کر دی مجھ کو آگے بڑھا کر " ۔ یہ تھی آصفیہ سلطنت کے خود مختار حکمران اور فرماں روا کی انکساری جس کی مثال ملنی مشکل ہے [1]

۱۔ پاکیزہ آنچل (نئی دہلی) سال گرہ نمبر ۱۹۹۰ء ص ۱۴۲

میر عثمان علی خاں کی شاعری

زبانِ شمع سے سنتا ہوں قصہ سوزِ الفت کا
شب آخر ہو گئی لیکن ابھی ہے داستاں باقی
گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
مگر بلبل کے لب پہ رہ گئی آہ و فغاں باقی
سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یارانِ رفتہ کا
غنیمت ہے جو اب تک ہے نشانِ کارواں باقی

شب آخر ہو گئی لیکن اس دردبھرے نغمے کے خالق آصفِ سابع نواب میر عثمان علی خاں کی داستاں بے شک باقی ہے اور باقی رہے گی۔ گل و ریحان و سنبل کی زباں پر ہو کہ بلبلِ ناشاد کی آہ و فغاں میں یا زبانِ شمع پر، دل کی گہرائیوں سے ہم دکن کے وفاشعار و غمخوار اپنے اس رفیع المرتبت بادشاہ اور نفیر منش انسان کی خدمت میں گل ہائے عقیدت پیش کرتے رہیں گے۔ اس تاریخ ساز عظیم حکمران کے قدموں کے نشان کاروانِ حیات میں اس کی اعلیٰ حوصلگی، سلامت روی، وقار و تمکنت، فراست و تدبر، خلوص و محبت اور سادگی اور رواداری کے قصے ہمیشہ دہراتے رہیں گے۔

سلطنتیں بنتی اور مٹتی ہیں شہنشاہیاں بام عروج پر پہنچتی اور فنا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کے تاثرات و روایات، تہذیب و تمدن، ان کے نقوش و جلوے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سلطنتِ آصفیہ کی اس آخری تاجدار کے کارہائے نمایاں جدید حیدرآباد کے اس معمار کا نام، اس کی مثال علم پرستی، تنظیمی صلاحیتیں، غربا نوازی اور رعایا پروری تاریخ کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ آصفِ سابع کا ۳۶ سالہ دورِ حکمرانی مملکتِ آصفیہ کا ایک سنہرا باب رہا ہے۔ دکن کی گنگا جمنی تہذیب اور باہمی اتحاد و خلوص دورِ عثمانی کا قابلِ قدر ورثہ رہا ہے جس پر تاریخِ دکن ہمیشہ ناز کرتی رہے گی، جو سربلندی، عظمت و افتخار دورِ عثمانی کو نصیب تھا ان کے پیش روؤں میں کسی کو نصیب نہ ہو سکا تھا۔ اس کا احساس خود میر عثمان علی خاں کو تھا:

عروجِ بخت و دولت میں دکن ہے آج لاثانی
فلک سے کرتی ہے چشمک زمیں اس آستانے کی
کچھ ایسی رفعت و شوکت ہو تیری آصفِ سابع
بجائے آسماں نوبت ترے نقار خانے کی

یہ دنیا کہتی ہے ہے صداقت کی قسم کھا کر
عروج و شان و شوکت میں ذرا ملکِ دکن دیکھو

عیش و عشرت کی ہے جو دھوم دکن میں عثماں
یہ سب کہتے ہیں ترے بخت کی بیداری ہے

زمانہ کہتا ہے بے لاگ عثماںؔ

ہر اک کو آس ہے ترے ہی در سے

باوجود اس دبدبے کے میر عثمان علی خاں نے سطوت و جلالت کے سایے میں کسر نفسی اور دولت و حشمت یکجا پر جو کھٹ پر فقیری کی شان رکھی۔ ایک سیدھا سادہ پر خلوص انسان جو دنیا کے ہیر پھیر سے ناواقف، مصلحتوں اور ریاکاری سے دور تھا۔ اپنے خیالات کا انھوں نے یوں اظہار کیا ہے :

تمہاری عمر یوں ہی رائیگاں گزری ہے اے عثماںؔ

نہ تم کو دستِ غیب آیا نہ تم کو کیمیا آئی

ایک جگہ لکھتے ہیں :

اس سے بھی بدنصیب ہے عثماںؔ کوئی بھلا

جو شخص ہیر پھیر میں دنیا کے رہ گیا،

عثماںؔ ہمارا رنگ بدلتا کبھی نہیں

پابند اپنی وضع کے اپنے طرز کے ہیں

تو جانتا ہے ان کو مطلب کے ہیں یہ عثماںؔ

اغیار سے تو ہر آن ہشیار رہا کرنا

عثماںؔ تو کر چکا ہے ہزاروں کا امتحاں

بے شرم ہوں جو کہ ایسے بہت کم بشر ملے

سرزمینِ دکن صدیوں سے شعر و ادب کا گہوارہ بنی رہی۔ اعلیٰ حضرت کا کلام اس تاریخی ورثے کی کڑی ہے۔ شاعری میر عثمان علی خان کو ورثے میں ملی تھی ۔

آصف جاہ اول اور ان کے فرزند و جانشین ناصر جنگ شہید ناصر اور خود میر محبوب علی خاں آصف آصف سادس سب اس میدان کے شہسوار رہے ہیں۔ چناں چہ اس علمی اور ادبی اور شعری ماحول میں آصف سابع سخن سنجی اور سخن دانی سے کیسے دور رہ سکتے تھے۔ عثمان تخلص کرتے جلیل مانک پوری سے اصلاح لیا کرتے (جنھیں بعد میں فصاحت جنگ کا خطاب عطا کیا گیا تھا) آپ کی سخن وری کے چرچے ہوئے تو ملک اور بیرون ملک کے شعرا اور ادیب دکن کی طرف کھنچے کھنچے چلے آئے۔ امیر مینائی اور داغ دہلوی، جلیل مانک پوری تو آصف سادس ہی کے زمانے سے سرزمین دکن کے ہو رہے تھے۔ اب فانی بدایونی، یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی جیسے جلیل المرتبت شاعر اس شمع محفل کے اردگرد پروانوں کی طرح منڈلاتے نظر آئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد اور چند ولال شاداں وغیرہ کو بھی ان کا قرب حاصل تھا۔

اردو سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان تھی اور شاعری اس کی آبرو۔ میر عثمان علی خاں نے اردو کو سرپرستی دے کر، حرارت و تازگی اور لطافت بخش کر اپنے عہد میں اردو اور اردو شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔
شعر کو ہم دل کے احساسات و جذبات کے اظہار کا وسیلہ قرار دیتے ہیں کچھ کیفیات و واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کے بیان کے لیے ہمیں الفاظ نہیں مل پاتے۔ ایسے وقت شعر ہمارے جذبات کی ترجمانی کر دیتا ہے۔ بقول مجروح:

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمے میں آ گئی

"حریمِ ناز کے قصے" اور "حدیثِ یار کے عنواں" شاعری میں ڈھل کر نکلے تو بقول

فصاحت جنگ جلیلؔ کے فرزند علی احمد جلیلی:

اشک ٹپکے ان کی آنکھوں سے علیؔ
میرے افسانے رقم ہوتے رہے

لیکن میر عثمان علی خاں نے دبی زبان سے کہا:

منہ سے تو ہو سکا نہ سوالِ زکوٰۃ حُسن
حیرت زدہ میں ہاتھ کو پھیلا کے رہ گیا
میں چاہتا ہوں ان سے کہوں حالِ دل مگر
اظہارِ عشق لب پہ مرے آ کے رہ گیا

اور پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میر عثمان علی خاں کہنے لگے:

یہ حالت اپنے دل کی ہم سے اب دیکھی نہیں جاتی
تڑپنا، لوٹنا اور اس طرح مجبور ہو جانا
ذرا تم دیکھ لو ہنس کر ابھی غم بھول جاتا ہے
کوئی مشکل نہیں دل کا مرے مسرور ہو جانا

عثماںؔ کیا ہے عشق نے ایسا ہمیں تباہ
دل کو جو پوچھیے تو اک اجڑا دیار ہے

عشق کا موضوع اردو شاعری میں ابدی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے پُرپیچ راستوں میں محبت و محبوب ازل سے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے نظر آتے ہیں۔ فرقت و وصال کی گھڑیاں بھی آتی ہیں، آنسو اور مسکان بھی چمن میں بکھرتی ہے۔

اس دریا میں ڈوب کر نکلنے والوں کے لیے [illegible]
رہتی ہیں۔ ہزاروں موضوع تغزل کا لباس [illegible]
ہوجاتے ہیں اور تغزل کے وجدان میں اپنی [illegible]
شعر شاعر کے وجود وجدان کا اوڑ[illegible]
شخصیت کا جزو اور اس کی فطرت کا عکس ہو[illegible]
ہوتی ہے، اپنا رنگ اپنا مشرب ہوتا ہے۔ میر غ[illegible]

الگ ہے سب سے مرا رنگ مشر[illegible]
مرید شیخ کا ہوں میں نہ باد[illegible]

شاعر خوشہ چینی بھی کرلیتا ہے لیکن اس کی اپنی
زندگی کے مختلف رشتوں سے ناتا جوڑتا رہتا [illegible]
اور خود اعتمادی کے ساتھ پرانی روایتوں کو لیے [illegible]
محترم رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ میر [illegible]
داغ دہلوی کا رنگ جھلکتا ہے۔ ہوسکتا ہے لیکن
وضع داری اور انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے۔
اعتمادی اور عزت نفس کے نمونے بھی ملتے ہیں

الٰہی خیر ہو بلے ہوئے ہیں یار [illegible]
ستم آیا، غضب آیا، بلا آئی قضا [illegible]

آنکھوں میں اثر مے کا ہے لغزش ہے قدم میں
یہ تو کہو اس شان سے آتے ہو کہاں سے

بسر ہوئی ہے تری رات کس کی محفل میں
یہ نیند کا ہے جو اب تک خمار آنکھوں میں

نیا یہ رنگ نکالا مری عیادت کا
وہ دیکھ کر مرے زخموں کو مسکراتے ہیں

ہماری جان گئی تیری دل لگی ٹھہری
سکھایا کس نے ادا کو تری قضا ہونا

چھوڑے گا دستِ شوق نہ رُخ پر ترے نقاب
رہنے نہ دے گا دل مرا تجھ کو حجاب میں

شوخی بھی ہے ادا بھی ہے شرم و حجاب بھی
کیا کیا بھرے ہیں سحر تمہاری نگاہ میں

ناز و ادا سے آپ کا آنا تو دیکھئے
تعظیم کو کھڑی ہے قیامت بھی راہ میں

میر عثمان علی خاں کی تحریر پاکیزہ اور شستہ ہے جس میں وہ اپنی خوشیاں اپنے غم، اپنے اندیشے، اپنی محرومیاں، اپنا فلسفۂ حیات اور اپنی دلی کیفیاتِ عشق و محبّت نہایت ہی شریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی فکر متوازن، شائستہ اور سنجیدہ ہے۔ بے تکلف دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔ کلام رومانیت اور دلبری سے لب ریز ہے لیکن متانت اور شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتا ہے۔ ان کی محبت شرافت کے دائرے میں اپنے محبوب سے ناز و نیاز اور شکوہ شکایت کرتی نظر آتی ہے۔ غزلوں کی غنائیت کلاسیکی تغزل کا ورثہ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

فرشِ زمیں پہ گرتے ہی دی اشک نے صدا
ایسی جگہ نہ جائیے جہاں آبرو نہ ہو

آہ و فغاں سکھائی دلِ بے قرار کو
آنکھوں کو اپنی ہم نے گہربار کر دیا

اندازِ یہ ستم کے تجھے تھے کہاں نصیب
میری وفا نے تجھ کو جفاکار کر دیا

ہچکیاں آنے لگیں کس لیے بیٹھے بٹھائے
شاید اس بھولنے والے نے مجھے یاد کیا

یہ ادائیں، یہ کرشمے، یہ غضب کے انداز
نظر آتے ہیں مری جان کے خواہاں کیا کیا

فصلِ گل میں بھی فسردہ ہی رہا دل اپنا
کبھی شاداب نہ یہ نخلِ تمنا دیکھا

سیدھی سادی زبان، عام فہم الفاظ اور دل نشین پیرائے میں کس خوبی سے دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے شاعری کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزل کے ساتھ قطعہ، منقبت، سلام، حمد و نعت اردو اور فارسی میں اور ٹھمری ہندی زبان میں لکھی۔ ہندی کلام میں بھی وہی مہک ہے جو اردو فارسی کلام میں پائی جاتی ہے باوجود سلطنت کی بے انتہا مصروفیتوں کے انھوں نے شاعری کو گلے سے لگائے رکھا۔ شاید اس کافر ادا کا نشہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اُردو کی اس کا فرحسینہ جسے عرف عام میں غزل بھی کہتے ہیں، اپنے روایتی انداز ومضامین کے ساتھ رنگ برنگی جلوے بکھیرتی نظر آتی ہے۔ احساس و ادراک کے کئی مسائل، تصوّف و عرفان کے کئی نکتے اس میں جلوہ گر رہتے ہیں۔ عثمان علی خاں نے اسے اسی روایتی انداز سے چاہا اور برتا ہے اور اس کے محافظ بن کر اسے مسندِ ذیشان پر متمکّن کر دیا ہے۔

مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اس کی قدرت کی یہ نیرنگی چمن میں دیکھنا
گُل کو جب خنداں کیا، شبنم کو گریاں کر دیا

سمجھنے میں قاصر رہی کیا راز ہے اس میں
ہنسی غنچوں کی گلشن میں کوئی سمجھا تو میں سمجھا

نہیں آساں کہ واقف ہو کوئی اس رازِ پنہاں سے
کہ دنیا میں مقامِ آدمی سمجھا تو میں سمجھا

مرا سینہ ہے مطلعِ آفتابِ نورِ عرفاں کا
چراغِ طور ہے ہر ذرّہ ذرّہ اس بیاباں کا

یہ کس چشمِ مست نے فتویٰ سنا دیا
جو پارسا تھے آج وہ مے نوش ہو گئے

عثماں بھری تھی آگ جو دل میں شبِ فراق
ایسے جلے کہ آپ ہی خاموش ہو گئے

کیا کیا نشانیاں مجھے دی ہیں فراق نے
لب خشک، چہرہ زرد ہے دل داغ دار ہے

پانی ہے عشق میں مرے اشکوں نے آبرو
دامن میں اپنے جو ہے گہر آب دار ہے

سینے میں درد و غم سے خالی جگہ نہ تھی
دل میں کہاں سے آکے یہ ارمان بھر گئے

شب و روز ہوں محو نظارہ عثماں
نظر میں ہیں جلوے نہاں کیسے کیسے

راحت نصیب ہوتی ہے عثماں الم کے بعد
مژدہ بہار کا ہے یہ فصل خزاں مجھے

عثمان علی خاں کی نظر گہری، مطالعہ وسیع تھا۔ فلسفیانہ نکتے، خوف خدا اور خیال آخرت ان کے کلام میں پھولوں پر شبنم کی طرح نظر آتے ہیں:

کون سا دل ہے جہاں میں جس میں درد و غم نہیں
دیدۂ نرگس کو دیکھو باغ میں پرنم نہیں

دینے والا جس کو دیا ہے بخشتا ہے بے حساب
جو دیں لطف و عطا میں اس کے بخشش و کم نہیں

حسرت سے اس کی ہو گئی عثماں مری نجات
گو میں گناہ گار سراپا قصور تھا

ہر وقت ہے عثمانؔ مجھے عقبیٰ کا تصور
جانا ہے پلٹ کر وہیں آئے ہیں جہاں سے

عثمانؔ نجات کے لیے آتا رہے خیال
اعمال نیک بھی رہیں فردِ گناہ میں

جو کرنا ہو تجھے وہ کرلے غافل
دو روزہ زندگانی مختصر ہے

دارِ فانی سے بھی انساں کو سفر کرنا ہے
زندگی پر بھی تو اک نظر کرنا ہے

زندگانی کے ہیں ایام گزرنے والے
سحر و شام یہ کرتے ہیں اشارہ ہم کو

عثماں یہ سر بلند ہوا بعدِ مرگ بھی
اللہ رے حوصلہ مرے مشتِ غبار کا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ معمہ عثمانؔ
عمر معلوم نہیں جاتی ہے یا آتی ہے

جہاں میں دیکھ تو عثمانؔ ذرا یہ غور سے نکتہ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

اک نفس پر ہے زندگی موقوف
بحرِ ہستی میں پھر حباب کہاں

جینا بھی اس کے ساتھ ہے مرنا بھی اس کے ساتھ
دنیا قیام گاہ نہیں رہ گزر تو ہے

عقل و خرد سے پوچھ لے اس راز کو کبھی
جو ذرہ ہے وہ اپنی جگہ کائنات ہے

شاعر کی فکر و نظر بلند ہو تو کلام میں تقدیس و بلندی آ ہی جاتی ہے انسان ہونے کے لحاظ سے وہ بھی اپنی کمزوریوں سے واقف تھے لیکن اس سے پردہ پوشی نہیں کرتے تھے البتہ اپنی خوبیوں کے تعلق سے کسرِ نفسی سے کام لیتے تھے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار میں نظر آتا ہے:

مجھے شاہد پرستی سے نہیں انکار لے عثماں
نہ عابد ہوں نہ زاہد ہوں نہ عالم ہوں نہ فاضل ہوں

دور یہ دور ہیں عثماں ہے کے گل گوں کے ملام
شرم آتی نہیں کہتے ہو مسلماں ہوں میں

عثماں بھی شاعری میں بڑا نام کر گیا
گو اک سے اک بڑھا ہوا خلقِ خدا میں تھا

عثماں علی خاں جام سبو سے شغف نہیں رکھتے تھے۔ اسلامی اصولوں کے پابند تھے۔ نماز خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے۔ جمعہ کی نماز باغِ عامہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ ہوتی تھی تو یہ نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا تھا:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اعلیٰ حضرت کا کلام ایک ایسے بادشاہ کا کلام ہے جو محبت کرنا جانتا ہے، جو جذبات کا پتلا ہے۔ ایک بھرپور انسان ہے۔ عشقِ خداوندی اور حبِ رسولؐ

اور اہلِ بیت رسول میں دن رات آنسو بہاتا ہے۔ تڑپتا مچلتا ہے۔ ان کی والہانہ عقیدت و انہماک کے نمونے ملاحظہ ہوں :

کس منہ سے شکر ایزدِ باری ادا کروں
ناچیز تھا سو اس کو بھی اک چیز کر دیا
عثماںؔ یہ اس کا فضل ہے تجھ پر کہ بے سوال
نعمت سے اپنی دامنِ مقصود بھر دیا

الٰہی شکر ترا کس طرح کرے عثماںؔ
ہمیشہ وہ تری رحمت سے کامیاب رہا

دل کو خدا نے اپنی محبت سے بھر دیا
تسبیح کو زبان دی سجدہ کو سر دیا

حُبِّ رسول میں یوں گہر فشانی کرتے ہیں :

کمالِ دین و ایماں کی اگر خواہش ہے اے عثماںؔ
خدائے پاک سے حُبِّ نبیؐ کی التجا کیجے

اُڑ جائے وہ عثماںؔ طرفِ گلشنِ طیبہ
جس وقت قفس ٹوٹے مرے طائرِ جاں کا

مدّاح ہوں میں دل سے شہِ ہر دو جہاں کا
جبریل بھی شاہد ہے مرے حُسنِ بیاں کا

جلوۂ دینِ مبیں قرآن میں ہے
روئے احمد قلب میں اور جاں میں ہے

شکلِ موسیٰ نہ رہے دہر کی حسرت مجھ کو
دل تڑپتا ہے دکھادو رُخِ انور اپنا

ہر وقت یہ غمانؔ کی دُعا ہے کہ خدایا
جاؤں نہ رہِ حُبِّ پیمبر سے نکل کر

اہلِ بیت رسول کے لیے انھوں نے کہا:

یہ کرنا عرض اے بادِ صبا سبطِ پیمبر سے
کہ غم میں آپ کے دریا رواں ہے دیدۂ تر سے

مولا علی کے لب پہ تھا مصحف رواں دواں
سیکھا انھوں نے علم خدائے قدیر سے

آنکھ روتی ہے شہیدِ کربلا کے واسطے
دل تڑپتا ہے اسیرانِ بلا کے واسطے

ایک قطعہ سنئے:

دو عالم کا ہوا سرتاج سر دے کر رہِ حق میں
علی کا لختِ دل سبطِ پیمبر ہو تو ایسا ہو

جلوہ عبادتوں کا ہے دیکھو نماز میں
کچھ اور ہی ہے کیف یہ راز و نیاز میں

پستی یہ کہتی جاتی ہے شرمندہ ہو کے آج
درجہ بلند کیسا ہے دیکھو فراز میں

فارسی میں بھی انھوں نے رسولِ اکرمؐ کی مدح سرائی کی ہے:

ے نہ باشد جائے من جز آستانِ مصطفےٰ عثمانؔ
سر ایں جا، سجدہ ایں جا، بندگی ایں جا قرار ایں جا

ے اے تاجِ کجکلاہاں سلطانِ دیں پناہاں
بر حالِ زارِ عثمانؔ چشمِ کرم خدارا

تخیل کی بلندیوں اور اچھوتی پروازِ فکر کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

ے حسرت سے دیکھتے ہیں جو نقشِ قدم مجھے
کن بے کسوں کی خاک تری رہگزر میں ہے

ے یہ تاثیر بھی دل دکھوں کی سنو
خموشی بھی دیکھو زباں ہو گئی

ے حقیقت کھول کر اک دن رہیں گے
یہ آنسو جو ہیں چشمِ رازداں میں

ے خدا جانے کیا کیا کرے گی نہ رسوا،
یہ چاہت ہماری یہ صورت تمہاری

ے ہمارے عشق کا افسانہ اکثر
وہ سنتے ہیں رقیبوں کی زباں سے

ے آتا ہے تو نہ جان نکلتی ہے ہجر میں
تیری طرح سے بھول گئی ہے قضا مجھے

ے ناز و ادا سے آپ کا آنا تو دیکھیے
تعظیم کو کھڑی ہے قیامت بھی راہ میں

؎ مرے قاتل نے عجب آج مسیحائی کی
مرنے والے بھی رہ غمِ جانم بھول گئے

؎ سو بار مرے دل کو نگاہوں سے تو گرا
یہ اشک تو نہیں جو اُٹھایا نہ جائے گا

تشبیہات کی گل کاریاں کلام میں حسن و رنگ پیدا کر دیتی ہیں۔ یہ کچھ خوب صورت تشبیہات ملاحظہ ہوں :

؎ صبحِ عشرت اپنی یاں شام جدائی ہو گئی
زلف کو عارض پہ کیوں تو نے پریشاں کر دیا

؎ ابر ہی نہیں گریاں اشک باری دیکھ کر
برق بھی مضطر ہے دل کی بے قراری دیکھ کر

؎ کسی نے دستِ حنائی سے پونچھ کر آنسو
لگا دی آگ مری اشک بار آنکھوں میں

؎ برق میں بھی تڑپ ہے گو لیکن
میرے دل کا سا اضطراب کہاں

؎ شیشہ کہتا ہے جھک کر جام سے
کیا صدا مستی بھری قلقل میں ہے

؎ یہ بھی درازیِ شبِ ہجراں کی ہے دلیل
جو شام سے تصورِ گیسوئے یار ہے

اٹھا ہوگا بلبل کا دردِ جگر
گلستاں میں کیسی گھٹا چھا گئی

ساقیا آنکھوں کی گردش دیکھ کر
دور یاد آتے ہیں ہم کو جام کے

نزاکت آئی ہے پھولوں میں گل بدن کی سی
شمیم پھیلی ہے باغوں میں پیرہن کی سی

پھیر کر آنکھ اٹھ گئے پہلو سے وہ قبلِ نظر
ہم برنگِ آرزوئے دید کی تسکیں رہ گئے

افشاں جما کے تم نے یہ اندھیر کر دیا
گرنے لگے زمیں پہ ستارے نئے نئے

دلِ پرسوز کی اور شمع کی اک حالت ہے
اسے سینے میں اُسے بزم میں جلتا دیکھا

ہو سکے تعریف کیا تیری شمیمِ زلفِ یار
پھول گلشن میں کوئی جیسے مہک کر رہ گیا

یادِ مژگاں نے کیا بیٹھے بٹھائے بے قرار
دفعتاً اک خارِ غم دل میں کھٹک کر رہ گیا

واں کھلیں شانے پہ اور یاں اتر آئیں دل میں
تیری زلفوں کی درازی سے پریشاں ہوں میں

رخسار و چشم یار کے تصویر دیکھنا
نرگس کے پھول باندھ دیئے ہیں گلاب میں

خدا جانے کیوں محبوب سے ہر شاعر کو شکایت رہتی ہے اور تجاہل و تغافل سے وہ دل برداشتہ رہتا ہے ۔ میر عثمان علی خاں کا دراز قد، گھنیری زلفوں والا محبوب بھی کچھ اس قدر منچلا اور الھڑ ہے کہ وہ پیمانِ وفا کرتا ہے نہ ہی عثمان علی خاں کی وفاشعاری کا اسے کچھ احساس ہے ۔ اس کا حال عثمان علی خاں ہی کی زبانی سنیے:

ے
نہ آیا اور کچھ ہم کو اگر آئی وفا آئی
مگر ہاں تجھ کو اے ظالم ستم آیا جفا آئی
الٰہی خیر ہو بدلے ہوئے ہیں یار کے تیور
ستم آیا غضب آیا بلا آئی قضا آئی

ے
ہل گیا عرش میرے نالوں سے
اس کے دل کو مگر خبر نہ ہوئی
کون رویا نہ میرے رونے پر
نہ ہوئی تیری آنکھ تر نہ ہوئی

ے
مزاجِ یار میں جانیے کیا اب سمائی ہے
کہ میرے روبرو میری برائی ہوتی جاتی ہے

ے
یاد آتی ہے ظالم کی باتیں مجھے رہ رہ کر
سننا میرے شکووں کا اور خوب ہنسا کرنا

ے
ہزار بار کہا لاکھ بار سمجھایا
کبھی نہ آپ مرے دل کا مدعا سمجھے

ہمیشہ ظلم اٹھاتے رہے مزے لے کر
کبھی نہ تیری جفاؤں کو ہم جفا سمجھے

؎ پھر وہی طرزِ جفا وہی پیمان شکنی
چار ہی روز میں سب قول و قسم بھول گئے

؎ کروٹیں لے کے گزاری شبِ فرقت ہم نے
کیا غضب کرتے ہیں وعدے پہ نہ آنے والے

؎ وصل کا وعدہ کیا ہے یار نے
منتظر بیٹھے ہوئے ہیں شام سے

؎ نہیں کچھ اعتبارِ عہد و پیماں
وفا کی کیا امید اس بے وفا سے

؎ یہ حوصلہ یہ کلیجا یہ دل ہمارا ہے
کہ بارِ عشق تمہارا ہمیں اٹھاتے ہیں

؎ انداز یہ ستم کے تجھے تھے کہاں نصیب
میری وفا نے تجھ کو جفا کار کر دیا

؎ ایک بھی کوچۂ جاناں سے شاداں نکلا
کوئی گریاں، کوئی نالاں، کوئی حیراں نکلا

؎ ہزار وصل کا ان سے کیا سوال مگر
نہیں نہیں کے سوا اور کچھ جواب تھا
ستا کے عشق میں کیا تجھ کو مل گیا ظالم
ہمارے دل کا دکھانا کوئی ثواب نہ تھا

جب حالِ دل کہا ہے ملا ہے یہی جواب
کچھ اور کہیے ذکر یہ سو بار ہو گیا

ایک آفت ہے ابھی سے قدِ بالا تیرا
نوجوانی میں یہ قامت بھی قیامت ہوگی

واں کھلیں شانے پہ اور یاں اتر آئیں دل میں
تیری زلفوں کی درازی سے پریشاں ہوں میں

اور پھر اس غلط فہمی کا بھی شکار ہو جاتے ہیں:

ہم جانتے ہیں شرم و حیا کا بہانہ ہے
دل میں ہے ان کے چور تو کیوں کر نظر ملے

عشق و محبت، ناز و ادا اور شکوہ شکایت کی رنگین وادیوں سے نکل کر جب ہوش و خرد کے دربار میں پہنچتے ہیں تو یہاں کے رنگ کچھ اور نظر آتے ہیں۔ عالم و فاضل، شاعر و ادیب سب حیدرآباد میں چلے آتے ہیں۔ حیدرآباد علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کا ذکر میر عثمان علی خاں نے یوں کیا

علومِ مشرقی کی آج عثماںؔ
توجہ نے تیری وقعت بڑھا دی

اعلیٰ حضرت کے دورِ حکومت میں سارے مذاہب باہمی پیار اور انسانیت کے رشتے میں منسلک تھے۔ خود بے تعصب بادشاہ بلا لحاظ مذہب و ملت اپنی رعایا کی دیکھ بھال کرتے۔ مذہبی تقاریب کے موقعوں پر انھیں مبارک بادی بھجواتے اور ان کی خوشیوں میں ساتھ رہتے۔ "نوروز" کے موقع پر پارسیوں

کے لیے انھوں نے یہ قطعہ قلم بند کیا:

آج دنیا میں جو نوروز ہوا
حق میں ہر ایک کے فیروز ہوا
شامِ غربت یہی کہتی ہے سنو
نیک ساعات کا یہ روز ہوا

مسلمانوں کے لیے "عید" کے موقع پر انہوں نے مبارکباد بھجوائی:

قدسیوں کی یہ صدا آتی ہے بہ ہم عثمان
عید کا روز ہے مژدہ مسلمانوں کو

"ہولی" کے رنگین ماحول میں ہندی میں انھوں نے اپنی ہندو رعایا کے لیے کہا:

گلناری میں کو مارت ہے پچکاری
کا گھر میں کیسا رنگ بھرا ہے
وہ بھی گھرا زنگاری
سابح پیا تورے نین رسیلے
وار لگا ایسا کاری

عثمان علی خاں کا کلام تین، دو دواوین پر مشتمل ہے جن میں ہمیں ہر رنگ کا شعر نظر آتا ہے۔

عروج و زوال، دن اور رات، فراز و نشیب نظامِ ہستی کی ایسی حقیقتیں ہیں جن سے مفر نہیں۔ آنے والے بھیانک دور کے تاموں کی آہٹ شاید انھوں نے سن لی تھی کہ لکھتے ہیں:

کان میں جو بجا تھا ہر گھڑی
انقلابِ دہر کا افسانہ تھا

اپنے ہی لوگوں کی طوطا چشمی اور بے وفائی اور دو عملی کا انھیں علم ہو چکا تھا تبھی تو انھوں نے لکھا ہے:

کس نے ملایا بادہ میں سم کچھ نہ پوچھیے
کیا کیا ہوئے ہیں ہم پہ کرم کچھ نہ پوچھیے

خود اپنی مجبوریوں کا بھی اعتراف تھا۔

حضرت مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی طرح اپنی زندگی ہی میں اپنی سلطنت کے زوال و بربادی کو دیکھنے زندہ رہے یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ انھیں صدمہ نہ ہوتا لیکن خدا پر توکل اور راضی بہ رضا رہنا ہی مسلمان کا ایمان ہے:

ناخدا کی نہیں حاجت کہ خدا مالک ہے
آ ہی پہنچا ہے سفینہ لبِ ساحل اپنا

وہ والیِ سلطنت جس کے دربار میں امیر غریب، فاتح و مفتوح ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، جس کی نعمتیں عام اور فیوض بے شمار تھے، اس ایک شمع سے لاکھوں شمع روشن رہتی تھیں کس طرح اس نے یہ سب کچھ برداشت کیا ہوگا جب دکن کا بچہ بچہ سسکیاں بھرتا نظر آ رہا تھا۔ ۱۹۴۸ء کی وہ بدبخت گھڑی جب سلطنت آصفیہ کا پرچم سرنگوں ہوا، شاہِ عثماں کا تخت تاراج ہوا اور قلم کانپ اٹھا جس نے لکھا تھا:

سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثماں
مسلمانوں کا تری سلطنت سے ہے نشاں باقی

---اور

دیکھ کر بلبل پریشاں ہوگئی
جب گلوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا

کنگ کوٹھی کے بام و در نے کون جانے کس حالت میں اپنے نقیر کو پایا ہوگا ایک مجبور و پابندِ سلاسل فرماں روا جو ڈیڑھ کروڑ عوام کا سہارا تھا۔ کون جانے اس کی کیا کیفیت تھی۔ لیکن اس کے لوح و قلم اس کے دل کی ترجمانی کرتے رہے۔ یاس و تنہائی کی گھڑیوں میں اس کے قلمِ خوں چکاں نے جو لہو ٹپکایا وہ اس کے جذبات کی غمازی کرتے رہے:

"زخموں کی مہک، داغوں کا دھواں، مت پوچھ فضائے زنداں میں"

سوز و غم آنسو بن کر شاہ عثماں کے اشعار میں ڈھل گئے:

فلک کے جور سے سب لطف مٹ گئے عثماںؔ
نہ مے رہی نہ وہ صحبت نہ یار باقی ہے

سختیاں دہر کے سہنے کے لیے اے عثماںؔ
دل جو آہن کا تو پتھر کا جگر کرتا ہوں

دل کی نہ پوچھ بات وہ دکھ پا کے رہ گیا
اک پھول تھا جو ٹوٹ کے مرجھا کے رہ گیا

ستم کا دور رہا بار بار ہم پر بھی
نہ پوچھ کیسے تھے یہ روزگار ہم پر بھی
بتائیں کیا تمھیں قصہ زمانِ ماضی کا
گزر چکے ہیں یہ لیل و نہار ہم پر بھی

؎ مرمر کے جی کے ہم نے گزاری ہے ساری عمر
آفاتِ روزگار میں یہ زندگی رہی

؎ اک نہ اک طرح تمھیں عمر کو اپنی عثماںؔ
جھیل کر آفت و آلام بسر کرنا ہے

؎ رکھتا نہیں ہے چین سے یہ آسماں ہمیں
پہنچائے دیکھیے مری قسمت کہاں مجھے

؎ ہم سمجھتے ہیں قفس ہی کو نشیمن اپنا
صحنِ گلزار میں کیا بادِ صبا رکھا ہے

؎ مثالِ اشک کسی کی نظر سے ہم گر کر
مٹے کچھ ایسے کہ اب تک نہیں نشاں باقی

؎ عثماںؔ تو انقلابِ جہاں راگریز نیست
از وضعِ روزگار شکایت چہ می کنی

اور پھر ایک درماندہ مضمحل خطاکار و عاصی عثماںؔ درِ مصطفی[۱۴] پر گڑگڑانے لگا:

عثماں ہے بہت عاصی و درماندہ یا نبیؐ
مولا ترے کرم سے ہے امید مخلصی
تیری نگاہِ لطف کا امیدوار ہے
ہر چند آفتوں میں گرفتار ہو گیا

زمانے کی بے ثباتی اور بدلے ہوئے حالات نے اسے بتایا کہ:
سابق کے رنگ ڈھنگ وہ عثماںؔ بدل گئے
منظر نئے نئے ہیں قرینے نئے نئے

اور پھر اپنی محرومی کا ماتم کر کے انہوں نے کہا :

ہجرِ ساقی میں ہوئیں آنکھیں ہماری اشک بار
ضبطِ گریہ کیا کریں ساغر چھلک کر رہ گیا

سلامت کیا رہیں گے نشترِ غم سے یہ اے عثماںؔ
حباب آسا بہت نازک ہمارے دل کے چھالے ہیں

دل کے چھالے پھوٹ گئے
ساغر چھلک کر رہ گیا ــــ اور

دور آتے گئے کتنے مگر اے ارضِ دکن
تیرے چہرے کا وہی سانولاپن باقی ہے

(یہ مقالہ میر عثمان علی خاں کی صدی تقاریب میں پڑھا گیا)

اگلے صفحات میں میر عثمان علی خاں کے دو فارسی سلام پیش کیے جارہے ہیں۔

کلامُ الملوک ملوکُ الکلام

کلام بلاغت نظام و فصاحت التیام اعلیٰحضرت بندگانِ عالی شہریارِ دکن و برار خلّد اللہ ملکہ سلطنتہ

بمراحمِ خسروانہ این سلام بہ سیّد الاخبار سرفراز شُد

شہید نمبر ۱۳۳۷ھ

سلام

حُسینؑ ابنِ علیؑ ہمین شاہِ دین است ... کہ نامِ پنجتنؑ ہم بر نگین است

نہ دا بابِ نجفؑ ہم کربلاؑ داد ... نگر تو نقشِ سجدہ بر جبین است

شُنیدہ نوحۂ ماتم بہ ہر سُو ... عجب درد ے کہ در قلبِ حزین است

غدیرِ خُم بگفتہ پیشِ ساقی ... عجب مستی بہ جامِ آبگین است

پئے ہر قلبِ صافی گفت ایقان ... نگو ایمان بہ آئین ہمین است

ہمہ اسرار و ہم رمزے بگفتہ ... چہ جلوہ ہم بہ فرقانِ مبین است

وَزیدہ از ریاضِ خُلدِ عثمانؔ

صبا گفت لمت بوُئے عنبرین است

کلام الملوک ملوک الکلام

کلام بلاغت نظام و فصاحت التیام اعلیحضرت بندگان عالی شہریار دکن و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

بمراحم خسروانہ این سلام بہ سید الاخبار سرفراز شد

شہید نمبر ۱۳۲۷ھ

سلام

از پئے سبطِ نبیؐ این ماہِ ماتم آمدہ
از پئے ماتم گساران نیز دم خم آمدہ

از پئے تشنہ لبان افسوس گفتہ این فرات
آبِ چون مخلوط گشتہ در دہن سم آمدہ

مسجدِ اقصےٰ کہ باشد یا حریم کعبہ
از پئے تعظیم در طاقے نگر خم آمدہ

گریہ کردہ آنقدر پیش چمن گفتہ صبا
آید بدہ دیدۂ نرگس شدہ نم آمدہ

دیدہ بستان را کہ شد برباد از دستِ خزان
بر رخ گلہائے تر در باغ شبنم آمدہ

جملہ خم ہا گشت لغزیدہ ز جائے استوار
سرنگون در بزمِ ماتم کاسۂ جم آمدہ

این تفوق داشت چون بر جملہ حیوانات ہم
در لباسِ عقل عثمان ابنِ آدم آمدہ

حصّہ ۳

گُل ہوئی وہ شمع جس کا اک جہاں پروانہ تھا

عثمان

حصّہ دوم



میر عثمان علی خاں شاہ سعود کے معطیہ لباس میں ملبوس ۱۱ر ڈسمبر ۱۹۵۵ء

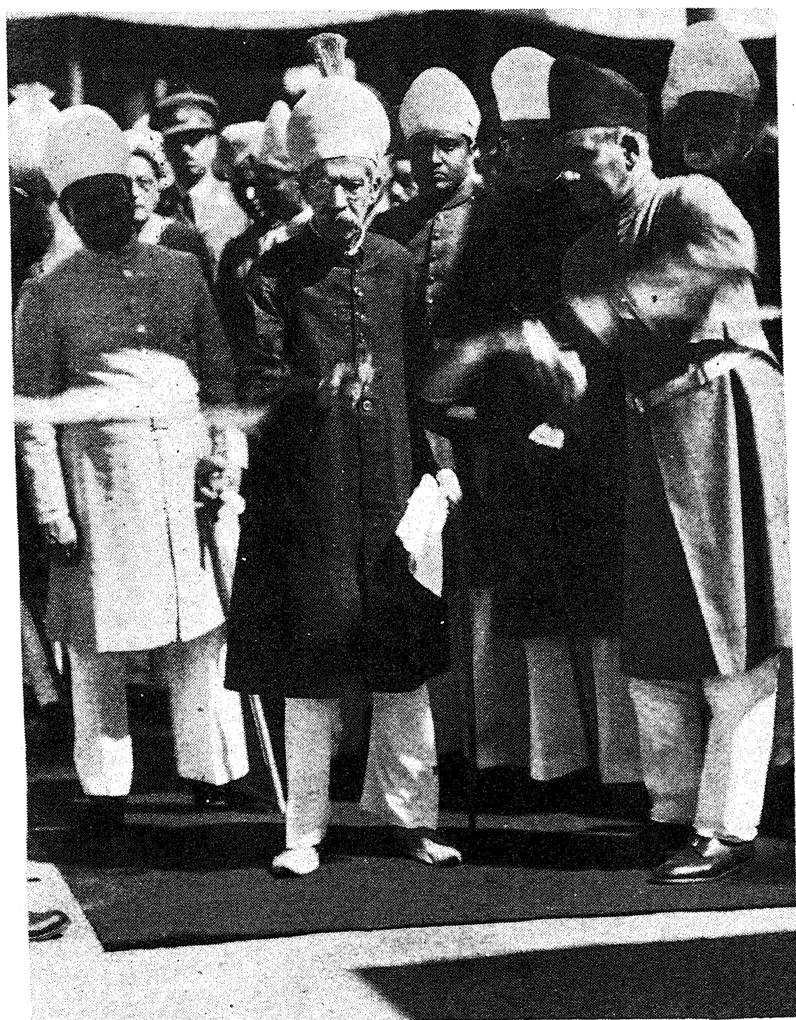


اے ۔ سی ۔ گارڈز میں چرچ کا افتتاح

۸ر فروری ۱۹۵۹ء



جوبلی ہال میں شاہ سعود کو سرکار کی جانب سے لنچ شاہ سعود سرکار کے ساتھ صوفے پر ۵ر ڈسمبر ۱۹۵۵ء



باغِ عامہ کی نمائش کا افتتاح

۷؍ نومبر ۱۹۴۵ء

ممالکتِ آصفیہ

قدیم نظامِ حکومت

ہر زمانے میں حکومتیں انقلابات اور تغیّرات سے دوچار ہوتی ہیں۔ کامیابیاں اور ناکامیاں ہر دور میں ہر حکومت کے نظم و نسق میں واقع ہوتی ہیں۔ ہندوستان بالخصوص دکن میں مختلف خانوادوں میں اقتدار کے ساتھ عروج اور زوال کی داستانیں ملتی ہیں۔ امورِ سلطنت میں افرادِ حکومت اور رعایا کی کارکردگیاں اور اس کے اچھے بُرے نتائج سامنے آتے ہیں جس کا اثر براہ راست سلطنت کی بقا یا فنا پر پڑتا ہے۔

دکن میں علاالدین خلجی کے زمانے میں "امیرانِ صدہ" کے نام سے وزرا اور سپہ سالار کے عہدے قائم ہوئے (جو دورِ آصفی کے صدر المہاموں معتمدین، نقبائے سررشتہ دار کی حیثیت رکھتے تھے) لیکن وائسرے یا نائب سلطنت اصل اقتدار کے مالک ہوتے تھے۔ اہم معاملات میں دہلی سے منظوریاں ملتی تھیں۔

سلطان محمد تغلق نے دولت آباد کو جب ہندوستان کا پایہ تخت بنایا تو اس کی کمزوریوں نے بہمنی سلطنت کے قیام اور علاالدین حسن گنگو بہمنی کی فرماں روائی کا باب کھولا۔ بہمنی سلطنت میں بادشاہ کی ذات ہی حکومتِ اعلیٰ کا مرکز ہوتی تھی

اور سلطنت کے سارے معاملات کی کارفرمائی اس کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی۔
وزرائے سررشتہ، نائبان صوبہ جات، شاہی امرا، سپہ سالار اور حاکمانِ عدلیہ سب اپنے فرائض وفاداری سے انجام دیتے تھے۔ ولی عہد کم سن ہوتا تو سن رشد کے پہنچنے تک کوئی ذمہ دار شخص نائب سلطنت کی حیثیت سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتا۔
مدار المہام جیسے عہدے قائم ہوئے اور اصول و ضوابط کے تحت مضبوط بنیادوں پر حکمرانی ہوتی۔ بہمنی سلطنت کے مدار المہاموں میں ملک سیف الدین اور محمود گاواں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔
بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت میں اسد خاں، دلاور خاں، مصطفیٰ خاں، صلابت خاں اور افضل خاں وزرائے سلطنت رہے۔
بہمنی سلطنت کے بعد عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں دکن کا مستقبل بن گئیں۔ ان حکومتوں کا نظم و نسق اور آئینِ جہاں بانی بہمنی سلطنت کے آئین و قوانین پر ہی مبنی تھا۔ بانی سلطنت اقتدار اعلیٰ کا مالک ہوتا۔
احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت میں مکمل خاں، ملّا عنایت اللہ، شاہ طاہر اور شیخ جعفر ملک عنبر نے جاں فشانی سے اپنے عہدے سنبھالے۔ احمد نگر کے مدار المہام کے پیشوا کہلاتے تھے جو فارسی کی اصطلاح ہے۔
گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت میں بانی سلطنت قطب الملک ہی اقتدار اعلیٰ کا مالک تھا جو کشور کشائی اور انتظامِ حکومت دونوں میں ماہر تھا اور اسی صفت کی بنا پر بہمنی سلطنت کے سلطانوں نے اسے "صاحب سیف و قلم" کا خطاب دیا تھا۔ مدار المہامی کی خدمات پر مصطفیٰ خاں اردستانی، میر مومن استر آبادی، مادنّا اور میر جملہ جیسے اعلیٰ دماغ مدبّر مامور تھے۔

قطب شاہی سلطنت کے نظم و نسق میں مختلف سررشتوں کے ذریعے حکومت کے کام انجام پاتے مثلاً مال گزاری، آب کاری، کروڑگیری، تجارت، صنعت و حرفت، امور مذہبی، تعمیرات، طبابت، ڈاک اور تعلیمات وغیرہ۔

اورنگ زیب عالم گیر کی جنوبی فتوحات کے ساتھ دکن کا پایہ تخت قیام پانا ہندوستان کی تاریخ میں محمد تغلق کے بعد دوسرا واقعہ تھا۔ مغلیہ سلطنت کا نظم و نسق منظم اور مستحکم تھا۔ دکن میں صوبہ دار یا وائسرے مغلیہ سلطنت کی طرف سے مامور کئے جاتے تھے۔ صوبہ دار جس کی حیثیت وائسرے کی سی ہوتی تھی نواب ناظم کہلاتے تھے۔ نواب ناظم کے تحت دیوان، بخشی بادشاہی جیسے عہدوں پر بادشاہ کی طرف سے تقرر ہوا کرتے تھے جنھیں کا درجہ حاصل تھا۔ صدر الصدور کا عہدہ بھی ایک اعلیٰ عہدہ تھا جس کے تحت پیش کار، سررشتہ دار، بخشی مشرف اور خانساماں وغیرہ عہدے ہوتے تھے جو دورِ عثمانی کے معتمدین اور ناظمائے سررشتہ کے برابر تھے۔

قطب شاہوں کے بعد نظام الملک آصف جاہ اوّل صوبہ دار کی حیثیت سے دکن آئے اور آصف جاہی سلطنت کی بنیاد پڑی اور ایک آزاد اور خود مختار والیٔ سلطنت کی حیثیت سے ہندوستان کے برطانوی عمل داری سے ہٹ کر اپنی قومی حکومت قائم کی جس کے وزرا اور عہدہ دار والیٔ سلطنت کی ایما سے مقرر ہوتے تھے۔ ابتدائی دورِ مملکت میں دیوان، بخشی جیسے عہدے ہوتے تھے۔ امیر الامرا صمصام الدولہ شاہ نواز خاں دیوانی کی خدمات پر مامور تھے۔ سید عبدالرزاق ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے عہد کے باعزت دیوان تھے جو خان خاناں فخر الملک کے مورث تھے۔ آصف جاہ

دوّم کے عہد میں مدار المہام ارسطو جاہ نے سلطنت آصفیہ کی نمایاں خدمات انجام دیں اور آصف جاہ ثالث سکندر جاہ کے عہدِ حکومت میں مدار المہام کا عہدہ زیادہ اہمیت کا حامل ہوا گو تمام اہم معاملات کا تعلق ذاتِ شاہانہ ہی سے وابستہ رہتا تھا۔ مدار المہام کے تحت پیش کار، وکالت، میر منشی، صدر الصدور، سررشتہ دار دیوانی، سررشتہ دار مال اور کوتوالی کے عہدے آتے تھے۔

آصف جاہ رابع ناصر الدولہ کے عہدِ حکومت میں مدار المہامی کا عہدہ ذاتِ شاہانہ سے منسلک تھا۔ آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ کے دور میں انقلابات کی وجہ سے جب برطانوی حکومت مستحکم ہوئی تو برطانوی حکومت کا نظم و نسق مملکتِ آصفیہ میں جاری و ساری رہا لیکن اہم امور کی منظوری ذاتِ شاہانہ سے ہی متعلق تھی۔

ارسطو جاہ نے آصف جاہ دوم نظام علی خاں کے عہد حکومت میں سلطنت آصفیہ کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور مدار المہامی کے عہدے کو دوامی حیثیت حاصل ہوئی۔

ارسطو جاہ کے بعد میر عالم سید ابو القاسم نے مدار المہام اور مدار المہام سیاسیات دونوں عہدوں کو سنبھالا اور نظم و نسقِ سلطنت کو مضبوط کرنے کی سعی کی۔ ان کے بعد مدار المہام نواب منیر الملک نے فرائضِ حکومت سنبھالے لیکن مہاراجہ چندو لعل پیش کار پیش پیش تھے۔

منیر الملک کے انتقال کے بعد چندو لعل نے مدار المہامی، پیش کاری اور وکالت تینوں قلمدان سنبھالے لیکن انکی بالادستی کی وجہ سے کشیدگی پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں سراج الملک اور مختار الملک کی وزارتیں قائم ہوئیں۔ سر چارلس مٹکاف رزیڈنٹ کے زمانے میں چندو لعل کو اپنے عہدوں سے سبک دوش ہونا پڑا اور یہ

عہدۂ پیش کاری راجہ رام بخش کو سونپا گیا۔ راجہ رام بخش کے انتقال کے بعد وزراتیں تبدیل ہوئیں۔ کچھ عرصے تک اس عہدے کو رخصت کر دیا گیا۔

اس کے بعد سراج الملک کو مدار المہامی عطا کی گئی اور شیندر پرشاد کو جو چندو لعل کے پوتے تھے پیش کاری کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔

مدار المہامی، پیش کاری اور پائیگاہ کی ذمہ داریاں دربارِ خاص سے عطا کی جاتی تھیں۔ (کہتے ہیں کہ جب مدار المہام قصرِ شاہی کو جاتے تو میانے میں جاتے اور لوٹتے تو ہاتھی کی عماری میں بیٹھ کر خیرات لٹاتے ہوئے اپنے محل کو آتے تھے)۔

نواب مختار الملک آصف جاہ رابع کے عہد میں مدار المہام ہوئے۔ آصف جاہِ خامس نے جب عنانِ سلطنت سنبھالی تو حکومت میں برطانوی نظم و نسق کے اصول مروج ہونے لگے۔

آصف جاہ خامس افضل الدولہ کے دور میں عدالت و کوتوالی۔ طبابت، پلیہ، تعلیم اور حفظانِ صحت کے صیغوں میں اصلاح آئی۔ ضلع بندی کی گئی اور حکام مال کے عہدے قائم ہوئے اور دیسمکھ، دیس پانڈے ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے۔

آصفِ سادس میر محبوب علی خاں کم سنی میں تخت نشین ہوئے چناں چہ ان کی رہبری کے لیے نائب سلطنت مقرر ہوئے۔ برطانوی حکومت نے نظم و نسق کی ذمہ داری قبول کی اور والیسرے اور رزیڈنٹ کو ذمہ دار قرار دیا۔ نائب سلطنت کی ذمہ داری نواب مختار الملک سالار جنگ اوّل اور نواب رفیع الدین خاں عمدۃ الملک امیر کبیر دوم کو مشترکہ طور پر سونپی گئی۔ قصرِ شاہی کے احکام عمدۃ الملک بجا لاتے اور نظم و نسق کے معاملات میں مختار الملک کو مقتدر قرار دیا گیا۔ دونوں اتفاق رائے سے اپنی ذمہ داریاں

انجام دیتے رہے۔

رجب ۱۲۸۶ھ میں عدالت، مال اور کوتوالی اور متفرقات کے لیے صدر المہامیوں کے نام سے چار وزارتیں قائم ہوئیں اور جریدۂ اعلامیہ کے توسط سے ان صدر المہاموں یعنی وزرائے سررشتے کے فرائض اور اقتدارات کی تفصیل بتائی گئی۔

صدر المہاموں میں نواب بشیر الدولہ سر آسمان جاہ صدر المہام عدالت بنے۔

نواب مکرم الدولہ صدر المہام مال

نواب شمشیر جنگ صدر المہام کوتوالی

اور نواب شہاب جنگ افتخار الملک صدر المہام متفرقات (تعمیرات و صفائی) بنے۔ ان صدر المہاموں کے اختیارات محدود تھے۔ نظمائے سررشتہ بھی اس قدر بااقتدار نہیں تھے جتنے کہ عہدِ عثمانی میں تھے۔

صدر المہاموں کے تقرر کے بعد ایک مجلسِ صفائی قائم کی گئی اور بلدیہ کی داغ بیل پڑی۔ مجلس صفائی کے میر مجلس متعلقہ صدر المہام ہوتے تھے۔ حکام میں امراء عظام، نمائندگان پائیگاہ اور پیش کار، جاگیردار، منصب دار اور ساہوکار شامل تھے۔

اہم امور کے لیے مشاورتی کمیٹی قائم ہوئی۔ مختار الملک سالار جنگ اوّل متعلقہ سربرآوردہ افراد سے مشاورت کرتے۔

۱۲۹۶ھ میں نواب عمدۃ الملک کا انتقال ہوا اور نواب رشید الدین خاں وقار الامرا کو شریکِ نائب سلطنت مقرر کیا گیا۔ جب وقار الامرا کا انتقال ہوا تو مختار الملک سالار جنگ اوّل تنہا نائب سلطنت اور مدار المہام دونوں فرائض کے ذمہ دار ہوئے۔

نواب مکرم الدولہ صدر المہام مال کے انتقال پر کسی کا تقرر نہیں ہوا البتہ ایک مجلسِ مال گزاری قائم کی گئی۔

چند امور غور طلب تھے جیسے صدر المہاموں کے لیے نام معین المہام سے برطانوی ہند کے وزرا کی سی کارکردگی، محکمہ جات معتمدی اور نظامتوں کے تغیرات، صدر تعلق داروں کو صوبہ دار سے موسوم کرنا، مجلسِ مرافعہ نظامت، دیوانی بزرگ اور جداگانہ محکموں کے بجائے ایک ہائی کورٹ کا قائم کرنا۔ لیکن اس اثناء میں مختار الملک گزر گئے۔

لارڈ رپن وائسرائے ہند نے سر اسٹیورٹ بیلی کو جو برطانوی ہند میں صدر المہام رہے تھے حیدرآباد بھجوایا۔ آصف جاہ سادس محبوب علی خاں ابھی سنِ رشد کو نہیں پہنچے تھے چناں چہ طے پایا کہ فرائض فرمانروائی کے انصرام کے لیے ایک کونسل آف ریجنسی قائم کی جائے جس کی صدارت میر محبوب علی خاں کریں۔

۱۔ اراکین میں مہاراجہ نریندر پرشاد پیش کار، نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ اور نواب خورشید جاہ ہوں۔ کونسل کے معتمد مختار الملک کے فرزند نواب میر لائق علی خاں عماد السلطنت رہیں۔

۲۔ فرائض مدار المہامی مہاراجہ پیش کار سے متعلق ہوں اور نواب لائق علی خاں کو امور مدار المہامی کا تجربہ کرایا جائے۔

۳۔ صدر المہامانِ مال و دولت کو ختم کر کے ان کی جگہ صدر المہاموں کی معتمدیوں کو محکمہ معتمدی مدار المہام میں ضم کر دیا جائے لیکن صدر المہام کوتوالی اور صدر المہام متفرقات اسی طرح قائم رہیں۔

۴۔ عدالت اور مال کے انتظامات تبدیلی کے ساتھ عمل میں آئیں۔

مملکتِ آصفیہ

محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا عہدِ حکومت

اب حیدرآباد میں عظیم تبدیلی کا احساس ہوا۔ ۲۵ برس تک نائب سلطنت عمدۃ الملک سراج الملک اور مختار الملک سالار جنگ اول کی ذاتوں میں حکومت مرتکز تھی۔ چناں چہ اس عہدے میں تبدیلی آئی اور پیش کار راجہ نریندر بہادر کے حوالے یہ ذمہ داری کی گئی لیکن وہ اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے اور استعفیٰ دے دیا۔ چناں چہ ۱۸۸۴ء میں خود محبوب علی خاں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لیکن جلد ہی میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی عماد السلطنت کو مدار المہامی کے لیے منتخب کیا گیا اور راجہ نریندر بہادر کو ان کے سابقہ عہدۂ پیش کاری پر مامور کر دیا گیا۔

اس دوران یعنی ۱۸۸۴ء میں اسٹیٹ کونسل قائم ہوئی۔
اراکین کونسل میں مدار المہام کے علاوہ ۳ امرائے پائیگاہ۔
نواب آسمان جاہ، نواب خورشید جاہ، نواب وقار الامراء
اور پیش کار (نواب شمشیر جنگ) معین المہامان نواب افتخار الملک اور نواب فخر الملک

شامل کئے گئے۔ کچھ عرصے بعد آصف یار الملک کو بھی رکن قرار دیا گیا۔

اسٹیٹ کونسل کے معتمد کے لیے سیّد حسین بلگرامی نواب عماد الملک کا انتخاب ہوا۔ اور صدر المہامی کے لیے آسمان جاہ منتخب ہوئے۔

۴ معین المہامیاں قائم ہوئیں۔

۱۔ معین المہام مال اور فوج — نواب منیر الملک
۲۔ معین المہام متفرقات — نواب خان خاناں
۳۔ معین المہام کوتوالی — نواب افتخار الملک
۴۔ معین المہام عدالت — نواب فخر الملک

اسٹیٹ کونسل کا افتتاح۔ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ء کو میر محبوب علی خاں کے ہاتھوں پرانی حویلی میں اسٹیٹ کونسل کا افتتاح ہوا۔ ارشاد شاہانہ ہوا کہ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلی بار امرا بالاتفاقِ رئیسِ وقت سرکاری کاموں میں مدد دینے جمع ہوئے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ منتخب شدہ امرا تاج دارِ دکن اور رعایا کی مدد کریں گے اور اپنے ذاتی اغراض کو سرکاری امور سے دور رکھیں گے۔ کسی کی حق تلفی نہ ہوگی۔ تاج دارِ سلطنت سرکار اور رعایا کے حقوق کی حفاظت کریں گے۔

میر محبوب علی خاں کی فرمانروائی کے وقت حکومت شوری کو اہمیت دی جانے کی بات وائسرے کی طرف سے چھیڑی تھی اور اسی بنا پر اسٹیٹ کونسل قائم کی گئی تھی۔ لیکن کونسل میں پیش ہونے والے چند مسائل سے مدار المہام میر لائق علی خاں کی رائے اور پالیسی سے تصادم ہونے لگا۔ آخرکار عماد السلطنت میر لائق علی خاں کو مدار المہامی سے استعفیٰ دینا پڑا اور مدار المہامی کے فرائض ذاتِ شاہانہ نے اپنے ذمے لے لیے۔

وقتاً فوقتاً کرنل مارشل معتمد پیشی خسروی اور ان کے مشیر محسن الملک ، فریدوں الملک اور عماد الملک اسٹیٹ کونسل اور صرف خاص کی معتمدی کے سلسلے میں غفراں مکاں کی بارگاہ میں باریاب رہتے ۔ مختلف معاملات کے ضمن میں مدارالمہام کی ضرورت کا احساس ہوا چناں چہ نواب آسمان جاہ امیر کبیر کو مدارالمہام کے لیے دعوت دی گئی ۔ محسن الملک کی جگہ وقار الملک کو مشیر سلطنت بنایا گیا ۔

اضلاع میں مجالس لوکل فنڈ کا قیام عمل میں آیا ۔

غفراں مکاں نے اصلاحات کی غرض سے ایک کمیٹی نواب وقار الامرا معین المہام کی صدارت میں قائم کی جس کے نتیجے کے طور پر قانونچۂ مبارک کا نفاذ ۹۳-۱۸۹۲ء میں عمل میں آیا ۔ جس کی رو سے حکمرانی کی ذمہ داری ذاتِ شاہانہ پر عائد ہوئی اور اقتداراتِ شاہی کی وضاحت کی گئی ۔

ایک عہدہ عہدۂ معتمدی پیشی خسروی قائم ہوا جس پر سرور الملک مامور کئے گئے ۔ اسٹیٹ کونسل کی جگہ کیبنیٹ کونسل قائم ہوئی جس کے میر مجلس مدارالمہام اور اراکین وزرائے سررشتہ یعنی معین المہام بنائے گئے ۔ ان کے اقتدارات میں اضافہ کیا گیا ۔ کیبنیٹ کونسل کا دستور العمل مرتب پایا ۔ معین المہاموں کے صیغوں کی جدید ترتیب عمل میں آئی ۔

مہاراجہ کشن پرشاد کو پیشکار نیز وزیر صیغۂ فوج بنایا گیا ۔

اس کے ساتھ ہی ایک مجلس وضع قوانین قائم کی گئی ۔

ان تبدیلیوں اور اصلاحات کے ساتھ معتمدین اور ناظمانِ سررشتہ میں شخصی اختلافات پیدا ہونے لگے اور نواب آسمان جاہ نے نتیجے کے طور پر مدارالمہامی سے

استعفیٰ دے دیا۔ آسمان جاہ کی جگہ وقار الامرا مدار المہام منتخب ہوئے۔ ان کے انتخاب کے بعد وزرائے سررشتے کے اقتدار کم کر دیے گئے۔ کیبنٹ کونسل کی متفقہ رائے کو مسترد یا ملتوی کرنے کا حق انھیں مل گیا۔ کسی مسئلے کو کونسل میں پیش کرنا بھی مدار المہام کی رائے اور ثواب دید پر منحصر تھا۔

مختلف اختلافات کی وجہ سے کیبنٹ کونسل کمزور ہونے لگی۔

اس دوران حکومت برطانوی ہند کی کرنسی پالیسی کی بنا پر سرکار عالی کا مالیہ متاثر ہونے لگا۔ اندرونی کشمکش اور پیچیدگیاں پیدا کرتی گئیں۔ آخر کار وقار الامرا بھی مدار المہامی سے سبک دوش ہو گئے۔

وقار الامرا کی سبک دوشی کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت مدار المہام مقرر کیے گئے۔ اور معین المہام فوج کے لیے نواب شمس الملک کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس موڑ پر رزیڈنٹ سر ڈیوڈ اور وائسرئے لارڈ کرزن کے مشورے سے یہ طے پایا کہ سر جارج واکر کو معین المہام فینانس بنایا جائے لیکن وہ کیبنٹ کونسل کے رکن نہ رہیں۔ مسٹر ڈنلاپ معتمد مال رہیں۔ فریدون الملک مشیر و معین المہام سیاسیات بنے۔ یوں بین نظمائے سررشتہ کے اقتدارات بڑھائے گئے۔ فینانس، مال گزاری اور سیاسیات کے اہم معاملات مدار المہام یا پیش گاہِ خسروی سے منظور کرائے جاتے تھے۔ (تنظیم بابِ حکومت میں مشترکہ صیغوں کے معاملات باہمی مشوروں سے ہوتے تھے وہ اس وقت رائج نہیں تھے) کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ کیبنٹ کونسل کی معتمدی ہر مہینے باری باری ایک ایک معتمدِ سرکار کو ملتی تھی۔ غیر اردو دان معتمد کو اس پر مامور نہیں کیا جاتا تھا۔

سر جارج واکر چاہتے تھے کہ دوسرے معین المہاموں پر ان کو فوقیت حاصل رہے جو طبقہ امرا کے معین المہامانِ سررشتہ کے وقار کو متاثر کرتے تھے۔ اعلیٰ خدمات پر برطانوی ہند کے افسروں کو مامور کرنے کے طریقِ کار کو استحکام ہوا جس سے ملک کے عہدے دار خوش نہیں تھے۔

اسی دوران نواب شمس الملک کا انتقال ہوا اور نواب حسام الملک خانِ خاناں معین المہام فوج ہوئے۔ نواب مظفر جنگ کیبنیٹ کونسل کے زائد رکن منتخب ہوئے۔ سر جارج واکر کا تقرر جو کہ عارضی تھا اُس میں توسیع کی گئی اور ان کے اختیارات بھی زیادہ ہو گئے۔ ان کے بعد سر ریجالڈ گلانسی جو نیر سویلین اور مددگار ریذیڈنسی تھے، سر واکر کے عہدے پر مامور کیے گئے حالاں کہ سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ ان سے سینیئر تھے۔ اس طرح افرادِ ملک کے حقوق برطانوی افسروں کے انتخاب سے متاثر ہوتے گئے۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے وزارت کے عہد میں غفران مکان میر محبوب علی خاں نے امورِ جہاں بانی میں خصوصی دل چسپی لی اور اہم امورِ سلطنت کے متعلق فرامینِ شاہی جاری کیے۔ سرور الملک کی معتمدِ پیشی خسروی سے علاحدگی پر نواب امین جنگ بہادر ان کے جانشین ہوئے۔

میر محبوب علی خاں کے انتقال کے بعد جب کہ دہلی میں شاہ جارج پنجم کی تاج پوشی کا دربار منعقد ہو رہا تھا، مہاراجہ کشن پرشاد نے کوشش کی کہ برار کے معاملے پر گفت گو ہو۔

مدار المہام اور معین المہام در عہد میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس
(۱۸۶۹ء – ۱۹۱۱ء)

مدار المہام

مہاراجہ نریندر بہادر پیشکار	۱۸۸۳ء تا ۱۸۸۳ء
نواب میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی	۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۷ء
نواب آسمان جاہ	۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۴ء
نواب وقار الامرا	۱۸۹۴ء تا ۱۹۰۱ء
مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت	۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۲ء

معین المہام

نواب منیر الملک	نواب شمس الملک
نواب خان خاناں	سر جارج واکر
نواب افتخار الملک	نواب فریدون الملک
نواب فخر الملک	نواب حسام الملک خان خاناں

سر ریجالڈ گلانسی

محمد مظہر۔ "تذکرۂ بابِ حکومت" ص ص ۴۲ – ۵۴

مملکتِ آصفیہ

دورِ عثمانی کا نظم و نسق[1]

خصوصیات حکومت

میر عثمان علی خاں جدید حیدرآباد کے معمار تھے۔ انھوں نے ہر شعبہ زندگی میں حیدرآباد کو ایک مثالی ریاست بنا کر ترقی دی۔ یہ ایک ایسا باوقار دور تھا جو تاریخ کے اوراق سے محو نہیں ہو سکتا۔ تعلیم، ایڈمنسٹریشن اور عوامی فلاح و بہبود کے علاوہ انھوں نے نظم و نسق میں مختلف اصلاحات کیں۔

میر عثمان علی خاں جب تخت نشین ہوئے تو ریاست کے کل امور ان پر روشن تھے چنانچہ انھوں نے اپنی دور اندیشی سے ریاست کو ایسا انتظامیہ دیا کہ ریاست کی کایا پلٹ دی اور علمی، سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے اس کی ترقی کا آغاز ہوا۔

عثمان علی خاں کے دورِ حکومت کا سب سے نمایاں کارنامہ زبانِ اردو کی ترقی اور نوجوانوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت کے لیے جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے (۱۹۱۸ء)

۱۔ یوسف حسین خاں ڈاکٹر۔ تاریخِ دکن۔ عرفانی۔ "حیاتِ عثمانی"
نجم الغنی خاں محمد۔ تاریخِ ریاست حیدرآباد ص: ۶۰۳

جس کی خصوصیت یہ تھی کہ سارے علوم کی تعلیم اُردو زبان میں دی جانے لگی۔ جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کا آغاز ۱۷ اگسٹ ۱۹۱۹ء سے ہوا اور یوں حیدرآباد علم وفن زبان و ادب کا گہوارہ بن گیا۔ تاریخ کے اس اہم ورق کا جائزہ ہم علاحدہ باب میں لیں گے جس طرح محمد قلی قطب شاہ تاجدارِ گولکنڈہ نے حیدرآباد کی بنیاد رکھ کر اردو زبان کو ترقی دی، عثمان علی خاں نے اس کی سرپرستی کی اور جامعہ عثمانیہ قائم کر کے اُردو زبان کو سرکاری حیثیت عطا کی۔ جگہ جگہ مختلف علمی اور فنی مدرسے اور کالج کھولے تاکہ سلطنت کے ہر طبقے اور ہر مذہب کا بچہ اور نوجوان آسانی سے اپنی مادری زبان اُردو میں تعلیم حاصل کر سکے۔ معذورین کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بھی اسکول اور کالج کھولے گئے۔

ان کا دوسرا بڑا احسان اور کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عدلیہ کو انتظامیہ سے علاحدہ کر کے اسے پورے اختیارات دے دیئے۔ پہلے ریاست کے تعلقداروں کو اختیارات تھے کہ وہ کسی مقدمے پر خود ہی فیصلے سناتے اور سزائیں دیتے یا بخش دیا کرتے۔ ان خرابیوں کو دُور کرنے انھوں نے ان اختیارات کو برطرف کر دیا اور نئی خود مختار عدالتیں قائم کیں۔ جہاں رعایا کے ساتھ انصاف برتا جاتا اور صاف ستھرا ایک نظم و نسق کی بنیاد رکھی۔ عدالت اور انتظامیہ کے عہدے بالکل جدا کر دیے تاکہ عدالتی اور انتظامی کام علاحدہ علاحدہ انجام پا سکیں[1]۔

علوم و فنون اور عدلیہ کی انتظامیہ سے علاحدگی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک نیا محکمہ "باب حکومت" قائم کر کے اپنی روشن خیالی اور سیاسی تدبر کا اظہار کیا۔ ۱۹۱۹ء میں وزارت کے قدیم عہدے کو برخواست کر دیا اور اپنی شخصی

---

[1] چھوٹے مقدموں کا فیصلہ عدالت خفیفہ میں ہوتا اور بڑے مقدموں کا عدالت العالیہ میں ہوتا تھا۔

حکومت کو جمہوریت میں تبدیل کر دیا ایک انتظامیہ کونسل بابِ حکومت کے نام سے مقرر کی جس کے صدر "صدر اعظم" کہلائے اور ہر محکمے کے اعلیٰ عہدہ دار صدر المہام جو بابِ حکومت کے رکن ہوتے تھے۔

بابِ حکومت میں ریاست کے بڑے بڑے معاملے سب اراکین کے صلاح و مشورے اور غور و خوض سے طے پاتے اور عثمان علی خاں کی توجہ کے لیے پیش کئے جاتے۔ اس طرح سلطنت کے کاروبار باقاعدہ اور منظم طریقے سے انجام پاتے۔

بابِ حکومت میں ایک صدر، سات اراکین معمولی اور ایک رکن اختصاصی (جن سے کوئی قلم دان وابستہ نہیں ہوتا تھا) پر مشتمل تھا۔ صدر اور ارکان بابِ حکومت کے اختیارات اور ذمہ داریوں کے حدود متعین کر دیے گئے تاکہ باہمی اختلافات سے بدمزگی نہ ہو، ذاتی اغراض کی بنا پر فلاحِ عامہ کو نقصان نہ پہنچے۔ اراکین کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتی گئی کہ وہ لائق، قابل اور بردبار ہوں تاکہ شاہ کو ان کے مشوروں اور اجتماعی عمل سے تقویت ملے اور انتظامِ حکومت میں بہترین کارکردگی ہو۔ اندرونی امور کی بھی اصلاح ہو سکے اور موجودہ طریقۂ حکومت کے نقائص دور ہوں۔

صیغہ جاتِ دیوانی کے سب معین المہام اور صدر المہام کو اس میں شامل رکھا گیا البتہ پائیگاہ، صرفِ خاصِ مبارک اور پیشیٔ مبارک کے صدر المہاموں کو بابِ حکومت میں شامل نہیں کیا گیا۔

"بابِ حکومت" کے صدر کے لیے مؤید الملک سید علی امام کا نام تجویز ہوا۔ برطانیہ کے مجلسِ وزرا کے اصول پر ایک صدر المہام، بغیر کسی قلم دانِ وزارت کے، فریدون الملک منتخب ہوئے۔ صدر المہامی سیاسیات کے لیے نظامت جنگ، صدر المہامی تعمیرات،

آثار قدیمہ اور امور مذہبی کے لیے تلاوت جنگ مقرر ہوئے۔ عماد الملک کے نام نامی کا انتخاب ہوا تو پیرانہ سالی کی وجہ سے انھوں نے مودبانہ گریز کیا اور اپنے صاحب زادے عقیل جنگ کا نام تجویز کیا۔ چناں چہ عقیل جنگ کو صدر المہام صنعت و حرفت و تجارت بنایا۔ تشکیلِ باب حکومت کے بعد کنگ کوٹھی میں دربار شاہانہ منعقد ہوا اور اعلیٰ حضرت خسروِ دکن نے خطبہ پڑھا۔ باب حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور اس کے اغراض و مقاصد اور اس سے وابستہ اُمیدوں کا اظہار کیا۔

اس سے قبل ایک اور قدم انھوں نے یہ اٹھایا کہ پائیگاہ کو شاہی نگرانی میں لے لیا اور اس کا انتظام انگریز انسپکٹر جنرل کے ذمّے رکھا۔

صدر المہاموں، معین المہاموں اور معتمدوں کے اختیارات میں اضافہ کیا اور صدر المہامین کے عہدوں میں تبدیلیاں لائیں۔ میر لائق علی خاں سالار جنگ ثالث مدار المہام اور عماد الملک نیز فریدون الملک مشیر مدار المہام بنائے گئے۔

مسٹر گلانسی کو صدر المہام فینانس بنایا گیا اور مسٹر ویک فیلڈ کو صنعت و حرفت، تجارت و آب کاری کی صدر المہامی سونپی گئی۔ علی الدولہ کو معین المہام عدالت کوتوالی اور امور عامہ بنایا اور لطف الدولہ کو معین المہامی فوج عطا ہوئی۔ مال کی صدر المہامی فتح نواز ونت کو ملی۔

صدر یار جنگ کو معین المہامی امور مذہبی کے بجائے صدر الصدور کے عہدے پر مامور کیا۔ نواب افتخار الملک معین المہام تعمیرات و کوتوالی اور نواب مظفر جنگ کو معین المہام فوج بنایا گیا۔ تلاوت جنگ کو معین المہام طبابت مقرر کیا گیا۔

انوار اللہ خاں فضیلت جنگ کو ناظم اور پھر مظفر جنگ کے انتقال پر معین المہام فوج بنایا۔

کوتوالی بلدہ کا تعلق صدر المہام سیاسیات سے کردیا گیا۔ معاہدۂ برار میں ترمیم بھی پیشِ نظر ہوا۔

کونسل گورنمنٹ کے طریقۂ کار کو جو برطانوی ہند کے مرکزوں اور صوبوں میں رائج تھا، حیدرآباد میں بھی جاری کیا گیا۔ حیدرآباد کے امرا اور تجربہ کار افسروں کے برطانوی ہند کے افراد بھی اس میں شامل رکھے گئے۔ مال گزاری، کوتوالی، تعلیمات، ٹپہ وغیرہ پر اہلِ ملک کو اعلیٰ خدمات پر متعین کیا گیا۔

شاہانِ آصفیہ کا قدیم طریقہ تھا کہ مدار المہام کی عرضیوں پر حکمِ شاہی ثبت ہوکر واپس جاتی یا زبانی یا متعلقہ افسر یا چوبدار کے ذریعہ کہلوا دیا جاتا لیکن عہدِ عثمانی میں یہ طریقہ بدل دیا گیا۔ عرضیوں پر معین المہام کی دستخط ثبت ہوسکتی تھی لیکن ان کے غیاب میں معتمد یا صدر ناظم یہ کام انجام دے سکتے تھے۔ لیکن اس بات کی وضاحت کردی گئی کہ تمام عرضیاں صدر المہامیٔ سیاسیات کے توسط سے ہی روانہ کی جائیں۔

صرفِ خاص مبارک (صرفۂ خاص)

شخصی اور شاہی حکومتوں کے حکمرانوں کے مصارف کے لیے کوئی رقم یا علاقہ مختص کیا جاتا تھا۔ آصفیہ سلطنت کے شاہوں کے مختص کردہ علاقے کو "صرفِ خاص" کا نام دیا گیا تھا۔ ابتدا میں اس کا انتظام ناصر الدولہ اور افضل الدولہ کے سپرد تھا بعد میں سالار جنگ مختار الملک نے سنبھالا اور عارضی طور پر صرفِ خاص کے تعلقات کا انتظام علاقۂ دیوانی سے رہا۔ ۱۸۷۰ء میں ایک معتمدی قائم کی گئی جس کے معتمد بدر الدولہ مقرر ہوئے۔

میر محبوب علی خاں کی مسند نشینی کے بعد ۱۸۸۱ء میں صرفِ خاص کے تمام کاروبار و کاغذات راست میر محبوب علی خاں کو پیش کرنے کا حکم صادر ہوا۔
۱۸۸۴ء میں صرفِ خاص کی تنظیم کے لیے ایک مجلس "تنظیم مداخل و مخارج" کے نام سے قائم ہوئی۔ دو سال بعد یہ ختم ہو گئی اور ۱۸۸۶ء میں "بورڈ آف صرفِ خاص" قائم ہوا۔ اس کے میر مجلس کلارک، نائب میر مجلس بدرالدولہ اور اراکین میں مقرب جنگ اقبال جنگ اور قدیر جنگ شامل ہوئے لیکن چند ماہ بعد اس کی میر مجلسی کو موقوف کر کے خود میر محبوب علی خاں نے کرسیِ صدارت سنبھالی۔

۱۹۰۹ء میں آصف جاہِ سابع میر عثمان علی خاں فرماں روا ہوئے تو صرفِ خاص کے علاقے کی بے قاعدگیاں دور کی گئیں۔ صرفِ خاص کی آمدنی سے بلا لحاظ مذہب و ملت سب مستفید ہونے لگے۔ گو یہ ایک خانگی علاقہ تھا لیکن یہاں کے قوانین کی حکومت کی جانب سے پوری پابندی ہوتی تھی۔ صرفِ خاص کی معتمدی کے لیے یکے بعد دیگرے سعید الدین، آصف نواز الملک، سید جنگ، تہور الملک، مرزا عبدالرحیم بیگ، رائے مرلیدھر فتح نواز ونت، تلاوت جنگ، عقیل جنگ اور یسین جنگ جیسے تجربہ کار لوگ کارگزار مقرر ہوئے۔

صدر المہامی کے تقررات علاقۂ دیوانی کے بعد علاقۂ صرفِ خاص میں بھی ہوئے۔ سب سے پہلے صدر المہام مرلیدھر فتح نواز ونت کو مقرر کیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد صدر المہامی کے فرائض "ارکانِ معزز کمیٹی" کے تفویض کیے گئے۔ ۱۹۲۸ء میں سعادت جنگ کو اس کی سعادت ملی۔ ۱۹۳۶ء میں نواب داراب جنگ کو یہ خدمت ملی۔ ۱۹۴۰ء میں نواب عزیز یار جنگ صدر المہام صرفِ خاص مقرر ہوئے۔

۱۹۴۹ء میں عبدالحمید خاں کا انتخاب ہوا اور ۱۹۴۹ء ہی میں صرف خاص کا انضمام عمل میں آیا۔ انضمام سے پہلے ہر صدر المہام صرف خاص اور معزز کمیٹی کا میر مجلس ہوا کرتا تھا۔

معزز کمیٹی صرف خاص کا اعلیٰ ترین محکمہ تھا جس میں اہم امور پیش ہوتے تھے۔ معزز کمیٹی کے ارکان کا تقرر اعلیٰ حضرت کرتے۔ ارکانِ کمیٹی کی رائے سے میر مجلس کو اتفاق ہوتا تو مسئلہ بارگاہ خسروی میں جاتا۔ افسر الملک، امین جنگ، اظہر جنگ، علی نواز جنگ اور تلاوت جنگ اس معزز کمیٹی صرف خاص کے ارکان میں شامل تھے۔

صرف خاص کے انضمام کے وقت دفاتر صرفِ خاص "مدِ خاص" اور "مدِ عام" پر مشتمل تھے۔ مدِ عام کے دفاتر کا انضمام حیدرآباد کے دفاتر میں ہوا اور مدِ خاص کے صیغے اور کارخانے صرف خاص میں برقرار رہے۔ انضمام کے بعد عبدالحمید خاں صاحب بدستور صدر المہام صرفِ خاص رہے۔ ۱۹۵۳ء میں نواب دین یار جنگ کا تقرر صرفِ خاص مبارک میں ہوا اور شعبۂ صاحبزادگان کو آپ سے متعلق کیا گیا۔ دین یار جنگ صدر نظامت کوتوالی سے وظیفہ یاب ہو گئے تھے۔

اپنے ذاتی علاقے صرف خاص کے اہم خدمات پر صدر المہامی کا عہدہ انھیں ہی دیا جاتا تھا جنھیں اعلیٰ حضرت وفادار، دیانت دار اور قابل سمجھتے تھے۔

قیامِ کمیشن تنظیم جدید: پیشگاہِ خسروی سے جب اس کمیشن کے قیام کا حکم ہوا تو اس کے چیرمین زین یار جنگ، وائس چیرمین دین یار جنگ اور رکن مرزا ہمایوں علی بیگ مقرر ہوئے۔ ہر شعبہ کے نظم و نسق میں اصلاح ہوئی۔ اس کمیشن کے قائم ہونے کے بعد صدر المہامی کا عہدہ برخاست کر دیا گیا۔ اور ایک کمیٹی "انتظامی کمیٹی

"صرفِ خاص" کے نام سے ۱۹۵۴ء میں بنائی گئی۔ اس کمیٹی میں دین یار جنگ کو وائس چیرمین مقرر کیا گیا۔

صرفِ خاص کے انضمام کے بعد ایک بڑا حصہ دیوانی میں منتقل ہوگیا تھا اور وہ علاقہ جو ذاتِ شاہانہ سے متعلق تھا اسے "ایچ دی ایچ دی نظامس پرائیوٹ اسٹیٹ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کا نفاذ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۵ء سے ہوا اور چھ مہینے بعد دین یار جنگ کو چیرمین کمیٹی انتظام پرائیوٹ اسٹیٹ مقرر کیا گیا۔

ان تبدیلیوں اور اصلاحات کے علاوہ قدیم محکموں کی اصلاح بھی کی اور جدید سررشتے قائم کیے گئے۔ مثلاً

۱۔ سررشتہ آرائشِ بلدہ
۲۔ سررشتہ آثارِ قدیمہ
۳۔ سررشتہ تعمیرات
۴۔ سررشتہ امورِ مذہبی اور اوقاف
۵۔ سررشتہ جنگلات
۶۔ سررشتہ زراعت
۷۔ سررشتہ تعلیمات
۸۔ سررشتہ ٹپہ سرکارِ عالی و دارالضرب
۹۔ سررشتہ مال گزاری
۱۰۔ سررشتہ تالیف و ترجمہ
۱۱۔ سررشتہ نظامت کوتوالی
۱۲۔ سررشتہ سیاسیات
۱۳۔ محکمہ معتمدی افواجِ سرکارِ عالی
۱۴۔ محکمہ لاسلکی
۱۵۔ محکمہ ریلوے
۱۶۔ محکمہ صنعت و حرفت

آرائشِ بلدہ

۱۹۰۸ء [illegible]

جاسکتیں۔ ان تباہ و برباد محلّوں کو دوبارہ آباد کرنے اور طغیانی کے اندیشوں کو دور کرنے کے لیے اپنی تخت نشینی کے دو سال بعد یعنی ۱۹۱۳ء میں مجلس آرائش بلدہ قائم کیا جس کے صدر سر نظامت جنگ صدر المہام سیاست مقرر ہوئے۔ ۲ سال بعد ان کے سبک دوش ہونے پر شہزادہ معظم جاہ بہادر کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔

موسیٰ ندی میں شہر سے قریب عیسیٰ ندی آملتی ہے اور بارش کی کثرت کی وجہ سے اس میں سیلاب آتا رہا تھا۔ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ان دونوں ندیوں پر بند اور پل تعمیر کرنے کی تجویز پیش ہوئی اور جو بڑے تالاب بادشاہِ وقت اور ان کے بڑے صاحبزادے کے ناموں پر عثمان ساگر (گنڈی پیٹ) اور حمایت ساگر وجود میں آئے جن کے ذریعے شہریوں کو پینے کا پانی دستیاب ہوتا رہا۔ عثمان ساگر شہر سے ۱۰میل کے فاصلے پر موسیٰ ندی کو روک بنایا گیا جس کی وجہ سے طغیانی کے اندیشے بھی ختم ہوگئے۔ حمایت ساگر عثمان ساگر سے ۳ میل کے فاصلے پر ہے۔ ان تالابوں سے پہلے میر عالم کا تالاب تھا جس کا پانی شہریوں کو پینے کے کام آتا تھا۔ حسین شاہ ولیؒ کی نشانی حسین ساگر حیدرآباد و سکندرآباد کے درمیان نہ صرف شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اس سے بھی پینے کا صاف پانی شہر میں پہنچایا جاتا تھا۔ ایک بڑا بند نظام ساگر نظام آباد میں تیار کروایا گیا جس سے ہزاروں ایکڑ زمین کی آبیاری ہوتی ہے۔

قدیم طرز کے تنگ و تاریک مکان منہدم کرکے جدید مکان تعمیر کروائے گئے

جو حفظانِ صحت کے اصول کے تحت بنوائے گئے اور ان مالکانِ مکان کو معقول رقم بھی ادا کردی گئی ۔ بچوں کے لیے کھیل کود کے میدان اور جسمانی ورزش گاہیں بھی قائم ہوئیں۔

آثارِ قدیمہ :

۱۹۱۴ء میں یہ سررشتہ قائم کیا گیا۔ مولوی غلام یزدانی ماہر کتبیات اسلامیہ کو اس سررشتے کا مہتمم بنایا۔ بعد میں اعلیٰ نظامت کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اس سررشتے کی جانب سے تمام آثار قدیمہ کے تحفظ کا کام انجام پاتا رہا۔ ہندو اور اسلامی تمدن کے آثار دریافت کیے گئے جن سے بھولی ہوئی عظمت زندہ ہوگئی۔ اس سے دکن کو آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے اہم جگہ حاصل ہوگئی۔ اجنٹہ کی قدیم نقاشی کا لازوال اور قیمتی خزانہ اور اسلاف کے کارناموں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ غاروں کی صفائی ہوئی اور قدیم فنِ نقاشی کو زندگی بخشی گئی ۔

راجہ اشوک کے کتبے ایلورا اجنٹہ کے غاروں کی طرح صدیوں پرانی تہذیب کی یادگار اور حسن و آرٹ کا گراں قدر اور لاجواب کارنامہ ہیں۔ گزشتہ بادشاہوں نے قدیم دلکش عمارات، محل اور مکان اور مسجدیں مندریں بنوائی تھیں۔ ان کی مرمت اور دیکھ بھال اس محکمے کے حوالے کردی گئی ۔ شمانندہ کا دیول جو ہزار کھمبوں پر مشتمل ہے، تلجاپور کا مندر، پالم پیٹ، چالوکیہ طرزِ تعمیر کی عمارتیں تھیں۔ گلبرگے کی تاریخی عمارتیں اور درگاہیں، مدرسے، دولت آباد کا قلعہ، بی بی کا مقبرہ، بیدر کے مقبرے اور مدرسے، گولکنڈے کے سلاطینِ قطب شاہی کے مقبرے، بالاحصار اور قلعہ اور ان کی بنوائی ہوئی مکہ مسجد، چار مینار، مختلف کمانیں، حوض وغیرہ

سب اسلامی تمدن کی شان دار عمارتیں ہیں جو آج قومی میراث بن گئی ہیں۔
محکمۂ آثارِ قدیمہ کے قیام نے ان پر عظمت تاریخی عمارتوں کو جاویداں کر دیا۔
اس کے علاوہ عجائب خانے متمدن ملک کا اہم جزو ہوتے ہیں۔ باغ عامہ میں ایک
عجائب خانہ بنایا گیا جس میں قدیم اسلحہ، بیدر اور کریم نگر کی منقبتیں، قدیم تصاویر
سکّے، زیورات، سنگ تراشی کے
ہوئی قرآن شریف اور دیگر مختلف
کسی بھی ملک کی تاریخی اہمیت کا

سررشتۂ تعمیرات

آصفِ سابع کی فنِ تعمیر
کے لیے خوب صورت عمارتوں کا
ہوئیں وہ رشکِ دہلی و آگرہ تھیں
شفاف سڑکیں بنائی گئیں۔ یہ
ہندوستان بھر میں مشہور تھیں
محکمۂ تعمیرات کے تحت
آغاپورہ، یاقوت پورہ میں جدید مکانات کا سلسلہ شروع ہوا جو تین درجوں اے،
بی اور سی پر مشتمل تھے۔ غریب اور مزدور طبقے کے لیے ملے پلی اور آصف نگر
کے درمیان ایک کمرے پر مشتمل پختہ مکانات کم آمدنی سے بنائے گئے جن کا ماہانہ
کرایہ صرف دو روپے تھا۔ گوشہ محل میں فری میسن لاج اور مکہ مسجد میں مدرسہ
حفاظ قائم ہوا۔ قابلِ ذکر خوب صورت عمارتوں میں ٹاؤن ہال، جوبلی ہال،

جاگیر دار کالج (موجودہ پبلک اسکول)، عثمانیہ ہائی کورٹ، شفاخانہ عثمانیہ (عثمانیہ دواخانہ) سٹی کالج، کتب خانۂ آصفیہ، معظم جاہی مارکٹ، یونانی شفاخانہ، مجلسِ مقننہ، عزاخانہ زہرا، قصرِ شاہی فلک نما (فلک نما پیلس) اور جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں شامل ہیں۔ عہدِ عثمانیہ کی یہ عمارتیں عہدِ شاہجہاں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

تنگ و تاریک گلیوں کو روشن اور کشادہ کیا گیا۔ صفائی کا انتظام ہوا مسافر خانے بنوائے۔ موسیٰ ندی کے کنارے پختہ طور پر دوبارہ تعمیر کیئے گئے اور وہاں چمن بندی کی گئی۔

نلوں کی تنصیب عمل میں آئی۔ اضلاع میں بھی نلوں سے پانی کی سربراہی ہونے لگی۔ ٹیلیفون کے تار مختلف جگہوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرنے لگے۔ جب بجلی اور برقی روشنی کی سربراہی عمل میں آئی تو شہر حیدرآباد جگمگا اُٹھا۔ شاہراہوں، چوراہوں پر بجلی کے قمقمے تاریکی دور کرتے رہے۔ سڑکوں کی دونوں جانب سرسبز و شاداب پھولوں کی کیاریاں راہ گیروں کی تسکینِ نظر کا سامان مہیا کرنے لگے۔ جا بجا خیابان و باغ لگائے گئے۔ سمنٹ، ڈانبر، روڑی اور گچی کی چوڑی جاذبِ نظر سڑکیں بن گئیں۔ ڈرینج کا باقاعدہ انتظام ہوا۔

سررشتۂ امورِ مذہبی[1]

اس سررشتے کے تحت جہاں مسلمانوں کے مذہبی مقامات جیسے مسجدیں، درگاہوں کی اصلاح کا انتظام ہوا، اہلِ ہنود کے معابد کا بھی اہتمام ہوا۔ آتش کدوں، گرودواروں کا بھی انتظام کیا گیا جس کا مقصد مختلف مذاہب میں خوشگوار تعلقات

۱۔ امورِ مذہبی کا قیام ۱۸۷۷ء میں عمل میں آیا۔ پولیس ایکشن کے بعد ۱۹۵۰ء میں اس سررشتہ کی تنظیم جدید ہوئی۔ تنظیم جدید کے پہلے نواب دین یار جنگ ناظم امورِ مذہبی تھے۔

کا پیدا کرنا تھا تاکہ مذہبی رواداری اور بھائی چارہ ہمیشہ قائم رہ سکے اور عوام ان کی اہمیت کو تسلیم کریں۔

سررشتۂ جنگلات :

۱۸۶۷ء میں نواب سالار جنگ کے عہدِ وزارت میں یہ محکمہ قائم ہوا جس کے تحت جنگلوں کی نگرانی اور جانوروں کی بقا کا انتظام تھا۔ بڑے جنگل جیسے اضلاع، عادل آباد، کریم نگر، محبوب نگر اور نظام آباد وغیرہ کے جنگلات کی حفاظت کی گئی جہاں سے ساگوان اور شیشم کی لکڑی بھی حاصل ہوتی تھی ۔

سررشتۂ تعلیمات :

اس سررشتے کے تحت ریاست کے طول و عرض میں تعلیم عام کرنے کی غرض سے مختلف درس گاہیں اور کالج کھولے گئے۔ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے لیے مدرسۂ حفاظ کھولا گیا۔ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے لیے سٹی کالج کے علاوہ تین اور کالج اورنگ آباد، ورنگل اور گلبرگہ میں قائم ہوئے ۔ بعد ازاں کئی اور کالجوں اور مدرسوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ دورِ عثمانی میں بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آخر میں یعنی ۱۹۲۹ء میں ایک ماڈل پرائمری اسکول حیدرگوڑہ میں مہتمم تعلیمات سید علی اکبر صاحب کے مساعی سے قائم کیا گیا جب کہ نواب مہدی یار جنگ مدار المہام تھے ۔ یہ پہلا اسکول تھا جہاں لڑکے اور لڑکیاں مخلوط تعلیم حاصل کرسکتی تھیں اور جس میں مانٹیسوری اور فروبل طریقِ تعلیم کا انتظام تھا۔

۱۹۱۸ء جامعۂ عثمانیہ، عہدِ عثمانی کا نادر کارنامہ ہے جس کے لیے عثمان علی خاں کو سلطان العلوم کی اعزازی ڈگری دی گئی ۔ ۱۷ اگسٹ ۱۹۱۹ء کو اس

جامعہ میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ خواتین کے لیے بھی کلیہ اناث میں تعلیم کا علاحدہ انتظام کیا گیا۔ عثمانیہ میڈیکل کالج ۱۹۲۷ء میں اور انجینرنگ کالج ۱۹۲۹ء میں ان ہی کی سرپرستی میں کھولے گئے۔ اچھوتوں کی تعلیمی پستی کو دُور کرنے کے لیے ان کے لیے درس گاہیں کھلوائیں۔ اندھوں اور بہروں کے لیے بھی اسکول کھولے گئے۔

اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر ریاست کے نوجوانوں کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔ جو کارہائے نمایاں عثمان علی خاں نے اپنی ریاست میں اپنے عوام کے لیے انجام دیئے وہ ان کی ذاتی دل چسپی اور سرپرستی کی رہینِ منت ہیں۔

سررشتۂ زراعت:

حیدرآباد میں بے حساب پہاڑ اور پہاڑیوں تھیں جن سے مختلف معدنیات حاصل ہوتی تھیں۔ بالاگھاٹ ضلع ناندیڑ پربھنی میں پھیلا ہوا تھا۔ شیادری پربت عادل آباد سے ہوتا ہوا اجنٹہ تک پہنچتا تھا۔ جالنہ کی پہاڑیاں تھیں۔ سونا، چاندی، ہیرا، ابرک، لوہا، تانبا، کوئلہ اور مختلف دیگر دھاتوں سے یہاں کی سرزمین زرخیز تھی۔

سررشتۂ زراعت کے تحت زرعی تحقیق کا کام شروع ہوا۔ کاشت کاروں کی تربیت کی گئی اور انھیں جدید فنی مشوروں سے لیس کیا گیا۔

آب پاشی اور آب رسانی کے لیے چھوٹی بڑی نہریں نکالیں جن سے سرزمین نہایت زرخیز ہو گئی۔ چار بڑی نہریں محبوب نہر، آصف نہر، گنگا ندی نہر اور میمل نہر تھیں۔ قحط کے انسداد کے لیے بڑے بڑے تالاب بنائے جن میں عثمان ساگر، حمایت ساگر، پاکھال، رامپا، مہالکشوا رام اور تالاب میر عالم قابلِ ذکر

ہیں۔ ہر ضلع میں نلوں کی تنصیب اور ڈرینج کا کام ہوا۔

سررشتہ ٹپہ سرکار عالی ۔ دارالضرب

خود مختار سلطنت آصفیہ میں اس کا اپنا سکہ رائج تھا۔ یہ خصوصیت ہندوستان کی کسی دوسری ریاست کو حاصل نہیں تھی۔ ایک دفتر نظامت ٹپہ سرکار عالی، نامپلی میں قائم ہوا جو حیدرآباد کی امتیازی خصوصیت کی حامل تھی لیکن آج یہ منہدم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ کئی منزلہ عمارت نے لے لی ہے۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۲ء تک ٹپہ خانوں (ڈاک خانوں) کی تعداد ۶۹۸ ہو چکی تھی جو ریاست کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔

عہد عثمانیہ میں سکۂ محبوبیہ کا نقش قائم رکھ کر عثمانیہ سکے اور نوٹ رائج کیے گئے یعنی سکۂ عثمانیہ اور سکۂ محبوبیہ دونوں کا رواج تھا۔

سررشتۂ مال گزاری :

ریاست کی کل آمدنی کا پہلا سررشتہ تھا جہاں آمدنی کا تخمینہ ہوتا تھا۔

سررشتۂ تالیف و ترجمہ :

جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اردو قرار دیا گیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ مختلف علوم کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروایا جائے اور اردو میں علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں۔ اس مقصد سے ۱۹۱۶ء میں دارالترجمے کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں اردو زبان کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی گئی۔ بہت سی فنی کتابیں کو اردو زبان میں منتقل کیا گیا۔

صدر نظامت کوتوالی

اور محکمۂ معتمدی افواج سرکار عالی قائم کیے گئے ۔۔ دسمبر

کوتوالی[1] میں LAW AND ORDER کی حفاظت کی جاتی تھی۔ خفیہ پولیس جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی کوتوال تھے۔

جب عثمان علی خاں برسر اقتدار آئے تو افواجِ آصفی کی کل تعداد تقریباً ۲۱ ہزار تھی جن میں ۶۹۸۵ فوجِ باقاعدہ اور ۱۳۳۰۲ ہزار فوج بے قاعدہ اور نظم جمعیت تھی۔ ان کے مصارف تقریباً ۵۲ لاکھ روپے سالانہ ہوتے تھے۔

جدید اصلاحات کی بنا پر اور ترقیوں کے مدِنظر جب مختلف تبدیلیاں عمل میں آئیں تو فوجِ بے قاعدہ میں اضافہ ہوا اور نظمِ جمعیت میں کچھ کمی کی گئی۔ فوجی بارکوں کی تعمیر کی گئی۔

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں افواجِ آصفی نے نمایاں کام انجام دیے۔ میر عثمان علی خاں نے سلطنتِ برطانیہ کی بے حد مدد کی۔ ہزاروں کی تعداد میں میدانِ جنگ کو سپاہی بھیجے گئے۔ یہی نہیں اپنی جیب خاص سے لاکھوں پاؤنڈ کی رقمی امداد بھی دی۔ ۵۰ لاکھ روپے کی مالیت کی چاندی کی اینٹیں بھی حکومتِ برطانیہ کو دیں۔ جب ۴ سال بعد یہ جنگ ختم ہوئی تو میر عثمان علی خاں کی دوستی کے اعتراف میں ۲۴ جنوری ۱۹۱۸ کو حکومت برطانیہ نے میر عثمان علی خاں کو "ہز اکزالٹیڈ ہائی نس" کا خطاب دیا اور یارِ وفادار سلطنت برطانیہ کا لقب دیا۔

محکمۂ لاسلکی:

۱۹۳۲ء میں محکمہ لاسلکی سرکار عالی کا قیام عمل میں آیا۔ ریاست کا اپنا ریڈیو اسٹیشن سرورنگر میں قائم ہوا۔

---

[1] صدر نظامت کوتوالی۔ کوتوالی کی جدید تنظیم ہوئی تو علی یاور جنگ کی تحریک پر دین یار جنگ کا انتخاب بہ حیثیت ڈائرکٹر جنرل پولیس عمل میں آیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک اس عہدے پر کارگزار رہے۔

محکمۂ ریلوے

۱۹۳۰ء میں حکومت حیدر آباد نے اپنی ریاست کی ساری ریلویز خریدلیں اور چھوٹی بڑی پٹریوں کی ریلوں کا جال سا بچھا دیا۔ جون ۱۹۳۲ء میں نظام اسٹیٹ ریلوے نے اپنی موٹر بس سروس بھی شروع کردی۔ اس طرح نظام کی اپنی ریلیں چلتی تھیں جو کشادہ اور صاف ستھری ہوتی تھیں۔

محکمۂ صنعت و حرفت :

ریاست حیدر آباد کی رعایا زیادہ تر زراعت پیشہ تھی لیکن زراعت کے ساتھ اضلاع میں ضروریات زندگی کی چیزیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ ملکی مصنوعات سے اہلِ ملک فائدہ اٹھاتے۔ ان کی محنت کی قدر ہوتی اور وہ گھر بیٹھے اپنی محنت کی روٹی کما سکتے تھے۔

اورنگ آباد اور پیٹھن میں چکن اور ریشمی کپڑے، مشروع کا کپڑا اور کمخواب تیار کرتے پیٹھن کی پگڑیوں کی مانگ دور دور تک تھی۔

صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ بھی یہاں قائم تھا۔ یہاں کے صناعوں کو حکومت کی جانب سے امداد دی جاتی تھی تاکہ وہ صنعت کو زندہ رکھیں اور ترقی دیں۔ پیٹھن میں زربفت کا کام بھی اچھا ہوتا تھا۔ ٹوپیاں اور مخمل کے جوتے تیار ہوتے تھے۔

دولت آباد کے قریب ایک قصبے "پورے" میں دیسی کاغذ تیار ہوتا تھا۔ لیکن جب سے کاغذ باہر سے آنے لگا اس کی مانگ کم ہوگئی۔ ورنگل میں ریشم، روئی اور اون کی قالینیں تیار ہوتیں جن کی مانگ ولایت تک پہنچ گئی تھی۔

اس کے علاوہ ٹسر سلک کی ساڑیاں بھی تیار ہوتی ہیں۔

نارائن پیٹ کی ساڑیاں بھی مشہور تھیں۔ بیدر میں عمدہ بیدری برتن اور دوسری گھر کی آرائش کی چیزیں تیار ہوتیں۔ نرمل میں نرمل انڈسٹری تھی جہاں لکڑی پر خوب صورت نقاشی کے فن کا مظاہرہ ہوتا۔

بعض اضلاع میں سُنار عمدہ کام کرتے تھے۔ کریم نگر میں چاندی کا باریک کام ہوتا، زیورات پر بھی نقاشی کی جاتی۔ یاقوت پورے میں بھی سُنار عمدہ کام کرتے تھے۔ رزیڈنٹ کرک پیٹرک نے لکھا ہے "یاقوت پورے کے رہنے والوں کی سادہ کاری ہمارے ملک سے بہتر ہے"۔ لیکن بیرونی اشیاء کی کثرت سے برآمد کی وجہ سے سُناروں کا بازار بھی سرد پڑ گیا۔

حیدرآباد کے چوڑی کے جوڑے مشہور ہیں جو نگینوں اور مسالوں سے تیار ہوتے ہیں۔ ولیم پالمر نے تقریباً ایک لاکھ روپے کے چوڑی کے جوڑے خرید کر لندن بھجوائے تھے یہ ساری صنعتیں اب بھی جاری ہیں اور مقبولِ خاص و عام ہیں۔

سررشتۂ دیہی ترقیات:

۱۳۳۹ھ میں دیہی ترقیات کے تحت دیہاتوں کو پانی اور دوسری سہولتوں کی فراہمی پر توجہ کی گئی۔ صفائی، حفظانِ صحت، ڈرینج، سڑکوں کی تعمیر اور درستی اور دیہی مدارس کی نگرانی کی گئی۔

محکمۂ علاجِ حیوانات:

اس کے تحت حیوانوں کے علاج کا مکمل انتظام کیا گیا۔

ان محکموں کے علاوہ حیدرآباد اسٹیٹ ٹمبا فنڈ کے ذریعے سرکارِ عالی نے سرکاری

ملازموں کو کفایت شعاری کی طرف توجہ دلوائی۔
۱۹۳۶ء میں پرواز کلب کی ابتدا جلشی گوڑہ میں کی گئی۔ ہوائی مسافر سروس، اور ہوائی میل سروس کی ابتدا ہوئی۔ حکیم پیٹ میں طیران گاہ کا قیام عمل میں آیا۔

محکمۂ اسپورٹس اینڈ گیمس:

کھیل کود کے لیے ۱۹۲۰ء میں اس محکمے کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد اسکاؤٹس کے لیے بھی ایک محکمے کی منظوری دی گئی۔

محکمۂ ورزش جسمانی:

۱۹۱۸ء میں اس کا قیام عمل میں آیا جو Y.M.C.A کی مدد سے چلتا رہا۔ اس کو ½ ۲ ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ دی جاتی تھی۔ اس کے ذمے ڈرل ماسٹروں کی ٹریننگ کا کام بھی تھا۔

انجمن ہائے امداد باہمی:

قرضے کی انجمنوں کا ایک محکمہ تھا۔ مقصد غریب کسانوں کو روپیہ بطور قرض دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنی جائیداد زمین داروں، بنیوں، ساہوکاروں اور مارواڑیوں کے پاس رکھ کر پریشان نہ ہوں کیوں کہ غریب اس قدر زیادہ سود ادا نہیں کر سکتے تھے۔ حکومت انھیں معمولی سود پر روپیہ قرض دیتی تھی۔ اضلاع اور دیہات میں اس محکمے نے ایک ہزار سے زیادہ بینک کھولے جن میں کسان خود حصہ دار تھے۔

محکمۂ سیاسیات :

حیدرآباد اپنے تمام داخلی امور سیاست میں مکمل آزاد اور خودمختار تھا اور جتنے سیاسی مسائل ہوتے وہ بادشاہ کی رائے سے تصفیہ پاتے تھے۔

محکمۂ کروڑگیری :

اس محکمے کے انتظامات باقاعدہ اور منظم تھے۔ کروڑگیری کا انحصار ملک کی زرعی اور اقتصادی حالت پر ہوتا تھا۔

عثمان علی خان کی علمی اور سماجی خدمات

عثمان علی خان نے نئی پود کی بہتر نشو و نما اور تعلیم پر خاص طور پر توجہ کی۔ اس غرض سے انھوں نے کروڑوں روپے خرچ کیے اور اپنی رعایا کو علم سے بہرہ مند کیا۔ سررشتۂ تعلیمات کی طرف خاص توجہ فرمائی اور اس کی از سرِ نو تنظیم کی۔ ان کی تخت نشینی سے قبل ملک میں بہت کم مدارس تھے۔ چنانچہ تخت نشینی کے ساتھ ہی شہر کے مدارس میں اضافہ ہونے لگا۔

سب سے پہلے انھوں نے قانون کے ذریعے تعلیم کو مفت کر دیا۔ اس حکم نامے سے ملک میں تعلیمی رجحان عام کرنے کی جو پالیسی بنائی گئی اس پر روشنی ڈالی۔ کونے کونے میں تحتانیہ مدارس قائم ہوئے۔ فوقانیہ اسکول بھی بہ کثرت کھلے۔ ریاست کی چاروں زبانوں اردو، تلنگی، مرہٹی اور کنڑی میں تحتانی تعلیم کے انتظامات کیے گئے۔

اساتذہ کو جدید طریقۂ تعلیم سے آشنا کرنے کے لیے "کلیۂ معلّمین" قائم کیا تاکہ بچوں کو جدید اصولوں پر تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ بہروں، اندھوں، گونگوں کی تعلیم کے لیے بھی ضروری انتظامات کیے۔ عثمان علی خاں کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے تعلیمِ نسواں پر زیادہ توجہ دی گئی۔ لڑکیوں کے لیے مدرسے

صلاطنت "ہفتہ وار عہدِ عثمانی کے علمی عطائے۔"
یادگار سلور جوبلی نمبر "عہدِ عثمانی میں علمی و ادبی جدوجہد"

قائم ہوئے اور زنانہ کالج قائم ہوا جہاں لڑکیوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے موقع فراہم کیے گئے۔

میر عثمان علی خاں کے دورِ حکومت میں ملک سے جہالت کو دور کرنے کے لیے "تعلیم بالغاں" کی اسکیم بھی نافذ کی گئی۔ اس طرح کے تقریباً پچاس مدرسے ریاست بھر میں قائم ہوئے۔ پیشہ ورانہ تعلیم اور اسکاؤٹس اور ورزشِ جسمانی کے لیے بھی ادارے کھولے گئے۔

امرا کے فرزندوں کو بھی فراموش نہیں کیا گیا۔ ان کے لیے ایک جداگانہ مدرسہ معہ ہاسٹل قائم ہوا جو "جاگیردار کالج" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کالج بیگم پیٹ میں تھا جہاں لڑکوں کی تعلیم کے علاوہ آداب و اخلاق کی خاص طور پر توجہ دی جاتی تھی۔ (آج اسی عمارت میں حیدرآباد پبلک اسکول قائم ہے) اس کے علاوہ سٹی کالج، نظام کالج، کالج آف ایجوکیشن، طبیہ کالج اور میڈیکل کالج قائم ہوئے۔

عثمان علی خاں نے پست اقوام کی بھی ہمت افزائی کی اور ان کے لیے بھی مدارس کھولے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے نظام کی اس ہمدردی اور خلوص کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اچھوتوں کی پستی کو دور کرنے کی کوشش کی۔

حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر بھی انھوں نے مختلف علمی اداروں کی سرپرستی کی۔ مدرسہ معینیہ عثمانیہ، اجمیر شریف کے لیے ماہانہ پانچ سو روپے منظور ہوئے جسے بڑھا کر بارہ سو کر دیا گیا۔

مدرسۂ اجمیر کے تعمیری فنڈ کے لیے دس ہزار روپے کا عطیہ دیا گیا۔ مدرسہ

آصفی حیدرآباد کی بھی مالی امداد کی۔ محبوب کالج سکندرآباد کی امداد کی غرض سے پچاس ہزار روپے منظور کیے۔ اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد کی تعمیر کے لیے ۱۲ ہزار روپے منظور ہوئے۔ دارالعلوم کالج حیدرآباد کے لیے سالانہ پچاس ہزار اور دارالعلوم مدرسے کو ۱۵ ہزار روپے دیے گئے۔ مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد کو ۲ ہزار روپے ماہانہ منظور ہوئے جس کا انتظام نواب فضیلت جنگ کے سپرد تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جناب حبیب الرحمٰن شروانی کے حوالے کیا گیا۔

اپنی بے مثال رواداری سے انھوں نے ریاست کی ہر قوم و فرقے کی امداد کی تاکہ ان کی ریاست کا کوئی فرد ان کی نوازشوں سے محروم نہ رہے۔

جہاں انھیں نے مسلم اینگلو اردو اسکول کھام گاؤں 'برار' کی تعمیر کے لیے ۱۹ ہزار روپے (کلدار) کا عطیہ منظور کیا وہیں درس گاہِ ٹیگور شانتی نکیتن کے لیے ایک لاکھ روپے (کلدار) کا عطیہ دیا۔ جب ٹیگور حیدرآباد آئے تو دوبارہ انھیں سوا لاکھ روپے مرحمت فرمائے۔ اس سوا لاکھ روپے کے عطیے سے شانتی نکیتن میں فارسی کی ایک "کرسی" قائم کی گئی۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ کی تکمیل کے لیے ۱۰ ہزار روپے منظور کیے۔ مسلم ہائی اسکول انبالہ کے لیے ۲ ہزار روپے کلدار کا عطیہ دیا اور ماہانہ ۲سو روپے کی امداد بھی ملتی رہی۔

مدرسہ اطفال سکھان کو بھی ان کی سرپرستی حاصل تھی۔ مشن اسکول سکندرآباد کے لیے بھی ۵ ہزار روپے کی منظوری دی۔

اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی کی قدیم تاریخی عمارت کی درستی کے لیے

۱۷ ہزار روپے کالدار کی امداد منظور کی۔

نادار طلبائے صوبۂ مدراس کے اسکول کو کالج میں تبدیل کر دیا اور ہونہار بچوں کی امداد کے لیے ۲۵ ہزار روپے کی منظوری دی۔

حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کی امداد کے لیے جب خواجہ الطاف حسین حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین نے جناب عماد الملک بہادر کے توسط سے دربارِ آصفی سے درخواست کی تو مبلغ ۱۰ ہزار روپے اس مدرسہ کے لیے دیے گئے۔ دوبارہ اس درس گاہ کو ۲۰ ہزار روپے مرحمت فرمائے اور ساتھ ہی ۳ ہزار روپے کی مستقل امداد جاری کر دی۔

دیگر علمی ادارے جن کی سرپرستی کی گئی از ایں ندوۃ العلماء لکھنو بھی تھا جسے شبلی نعمانی نے مشرقی طرزِ تعلیم کی اصلاح کی غرض سے کھولا تھا۔ دارالعلوم دیوبند جس کے لیے ماہانہ ایک ہزار روپے دیے گئے۔ جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد جب حکیم محمد اجمل خاں اور مولانا محمد علی نے رکھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے جب بارگاہِ عثمانی سے امداد طلب کی تھی تو ایک ہزار روپے کالدار ماہانہ اور ۵۰ ہزار روپے عطیہ منظور کیا گیا۔ جو عمارت بنائی گئی اس پر 'عثمان' کا نام کندہ کیا گیا یہ جامعہ ملیہ اوکھلا میں تعمیر کی گئی۔

مکہ مکرمہ کی مدرسۂ صولتیہ کی بھی امداد کی اور ۲۵ ہزار روپے منظور کیے۔

انجمن ہائے اسکول ناگپور میں مسجدِ عثمانیہ کی تعمیر کے لیے ۱۰ ہزار کا عطیہ دیا اور مرہٹی اسکول مدرسۂ نسواں کے لیے سالانہ ۲۵ ہزار روپے منظور کیے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے ۵ لاکھ روپے کی منظوری دی ۔ اس

پیش کش نے حیدرآباد کے بہت سے امراء کو اس یونیورسٹی کے لیے چندہ جمع کرنے پر مائل کیا اور لاکھوں روپے جمع کیے گئے۔ علی گڑھ کالج کے لیے نواب عمادالملک کی سفارش پر ۱۵ ہزار روپے کلدار کا عطیہ دیا گیا اور دوبارہ اس کالج کے لیے ۵۰ ہزار روپے کلدار منظور ہوئے۔ عثمان علی خاں کے نام سے ایک عمارت تعمیر کی گئی۔ عربی تعلیم کی تکمیل کی غرض سے عثمان علی خاں نے سالانہ ایک ہزار روپے کلدار کے وظیفے بھی جاری کیے۔

یونیورسٹی کی مالی حالت اس قدر نازک اور خطرناک موڑ پر پہنچ گئی تھی کہ نواب سر راس مسعود نے جو اس وقت وائس چانسلر تھے عثمان علی خاں کی توجہ اس طرف مبذول کروائی تو اعلیٰ حضرت نے ۱۰ لاکھ روپے کلدار کا عطیہ عطا فرمایا۔ مستقل امداد میں ماہانہ ۲ ہزار روپے کا بھی اضافہ کر دیا۔

۱۳۵۴ھ میں عثمان علی خاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر اور آغا خاں وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

خان بہادر شیخ عبداللہ کی کوششوں سے اس زمانے میں زنانہ انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہوا۔ چوں کہ خود عثمان علی خاں تعلیم نسواں کے حامی تھے، انھوں نے زنانہ کالج کے لیے ایک ہزار روپے کا عطیہ عنایت فرمایا اور ماہانہ ایک سو روپے کی مستقل امداد جاری کر دی بعد میں اسے ایک سو پچاس کر دیا۔

سنٹرل اسٹانڈنگ کمیٹی کی درخواست اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی سفارش پر مسلم کانفرنس کے کاموں میں مدد دینے کے لیے ½ ۱ لاکھ روپے کلدار کے پرامیسری نوٹ منظور فرمائے اور ایک مہینے کے اندر اندر ۱۸ ہزار روپے

کے پرامیسری نوٹوں کا اضافہ کر دیا۔

مسلم یونیورسٹی کے ساتھ انھوں نے ہندو یونیورسٹی بنارس کی بھی فراخ دلی سے امداد کی۔

مہاراجہ جام صاحب کی تحریکات کی سرپرستی کی اور ۱۵ ہزار روپے کی سالانہ امداد مقرر کی۔ رصدگاہ نظامیہ کے لیے ۳۵ ہزار روپے مقرر کیے اور آلات کی حفاظت و صفائی کے لیے اسٹاف مقرر کیا۔

پبلک اسکول دیرہ ڈون کے قیام کی غرض سے ۲ لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ اسلامیہ کالج کلکتہ کی مدد کے لیے ۱۰ ہزار روپے منظور کیے۔ لکھنؤ کے موسیقی کالج کی بھی سرپرستی کی اور اسے بھی ۱۰ ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ عثمانیہ کالج گلبرگہ کی بھی امداد کی اور پرنسپل کی تنخواہ کے لیے سالانہ مصارف میں ۳ ہزار روپے اضافہ کر دیے۔ دہلی کے ڈومسٹک سائنس کالج (لیڈی ارونگ کالج) کے لیے ۲ لاکھ روپے منظور کیے۔

ان مختلف امدادوں کے علاوہ ان کے دورِ حکومت میں ۱۸۴۵ء میں مدرسہ طبابت، ۱۸۷۸ء میں انجینیرنگ جس کے لیے ایک لاکھ اٹھادن ہزار کا عطیہ دیا گیا اور ۱۸۸۹ء میں ایک اور کالج کھولا گیا۔ یہ تینوں درس گاہیں جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد ۱۹۲۹ء میں میڈیکل کالج، انجینیرنگ کالج اور ایجوکیشن کالج کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ میں ضم کر دیے گئے۔ ۱۸۵۶ء میں دارالعلوم کی درس گاہ قائم ہوئی۔ ۱۸۷۷ء میں مدرسۂ عالیہ اور ۱۸۸۳ء میں مدرسۂ اعزہ کا قیام عمل میں آیا۔ وقت کی ضرورت اور رجحان کو دیکھتے ہوئے انگریزی تعلیم کا خاص

انتظام کیا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں نظام کالج قائم ہوا جہاں مغربی تعلیم کے ساتھ
مشرقی تعلیم بھی دی جانے لگی اور فنی تعلیم پر بھی توجہ دی گئی۔

۱۸ویں صدی عیسوی میں سلطنت آصفیہ کے قیام نے علم و فن کے
میدان میں ان مٹ نقوش چھوڑے۔ آصف جاہی حکمراں شائستہ اور علم و فن
کے ماہر تھے اور بذات خود انھوں نے اس کی ترقی میں حصہ لیا تھا۔ اس علم و فن
کے گہوارے میں کتنے ہی پوشیدہ جواہر آشکار ہوئے ہیں کہ اور قوم و ملت کا اثاثہ
بن گئے۔ مقامی اور غیر مقامی کی تخصیص نہیں تھی۔ طالب علم اور صاحب علم بھی
یہاں سے فیض یاب ہوئے۔

۲۰ویں صدی میں مشرقی اور مغربی علوم کی سبھی درس گاہیں بام عروج پہ
پہنچ گئیں۔ انگریزی اور فنی تعلیم کے ذریعہ بہت سا مواد حاصل کیا گیا۔ دارالعلوم
کالج نے جامعہ عثمانیہ کی بنیاد کا حق ادا کیا۔ یہاں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت
نے وہ شہرت پائی کہ قرطبہ اور بغداد کی ہمسری کرنے لگا۔

۱۹۱۵ء میں حیدرآباد ایجوکیشن کانفرنس کے پہلے اجلاس میں حیدرآباد
میں ایک بڑی جامعہ کی بنیاد رکھنے کے لیے قرارداد منظور ہوئی۔

یہ وہ دور تھا جب کہ ہر طرف انگریزی کا بول بالا تھا اور وہی ذریعۂ تعلیم بھی
تھی۔ ملکی زبان میں تعلیم عام کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا۔

معتمد تعلیمات نواب حیدر نواز جنگ (سر اکبر حیدری) نے نظام سے
۱۹۱۷ء میں جامعہ کے قیام کی اجازت طلب کی۔ سید حسین بلگرامی نواب
عماد الملک اس میں پیش پیش تھے۔ ان کے علاوہ مولوی عبدالحق، مولوی

عبدالرحمٰن خاں شروانی نے بھی جامعہ کی تعمیر میں سر اکبر حیدری اور نواب عمادالملک کا ساتھ دیا۔ بالآخر نظامِ سابع میر عثمان علی خاں نے ۱۹۱۷ء میں فرمان نافذ کیا اور جامعہ عثمانیہ کی تشکیل کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی ملکی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔

علاوہ متعدد علمی خدمات کے آصف سابع کے دورِ حکومت کا سب سے نمایاں اور درخشاں کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام اور اردو زبان کی ترقی ہے۔

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
شاد باش اے حضرت عثمان علی خاں شاد باش



جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد دکن میں ایک جامعہ کی ضرورت کو سب سے پہلے سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک نے محسوس کیا تھا۔ سر علی امام نے اس منصوبے کو اپنے زمانے میں آگے بڑھایا اور سر اکبر حیدری کی توجہ سے اس ارادے کو عملی جامہ پہنایا گیا۔
جامعہ عثمانیہ کا قیام اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے ساتھ ذہنی اور اخلاقی تربیت کا باعث ہوا۔ عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی جو اُن کی جدوجہد کا پیش خیمہ بنی۔ جامعہ عثمانیہ کی عمارت مغل اور ہندو آرٹ کا خوب صورت نمونہ ہے۔

۱۔ دارالترجمہ و تالیف کا قیام "یادگار" سلور جوبلی خصوصی نمبر ص ص ۱۸۵ - ۱۸۸
۲۔ مجلہ عثمانیہ " جامعہ عثمانیہ نمبر ص ۲۴
۳۔ سید محی الدین قادری زور عہد عثمانی میں اردو کی ترقی
۴۔ میر احمد علی خان عہد عثمانی میں اردو خدمات

یہ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں شمار کی جاتی رہی۔ جس نے حیدرآباد کے باصلاحیت نوجوانوں کو آگے بڑھنے اور اونچے مراتب پانے کا موقع دیا۔ یہاں کے اساتذہ طالب علموں سے اپنے بچوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ علم کا شوق اور لگن ان میں پیدا کرتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علم علم کے ساتھ ادب، عزت اور احترام کا درس بھی لیتے رہے۔

حیدرآباد ہمیشہ اپنی پرانی روایات، تہذیب و تمدن کو گلے لگاتا رہا۔ فرقہ وارانہ یک جہتی، بھائی چارہ، خوش حالی اور رواداری میں اپنا ایک علاحدہ مقام رکھتا تھا۔ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کی نشانی، اپنی شائستگی، نفاست، آداب و اخلاق، تہذیب و معاشرت کے لیے ہندوستان بھر میں مشہور تھا اور ہر خاص و عام اس "حیدرآبادی تہذیب" کا مدح خواں تھا۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد ایسے روشن خیال، فیاض، ہم درد اور علم دوست بادشاہ اور ان کی خاندانی روایات کا پاسبان تھا۔ یہاں تعصب و تفریق نہیں تھی۔ رعایا اپنے بادشاہ کو "بندگانِ اقدس" "سرکار اور اعلیٰ حضرت کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

چناں چہ اسی رعایا کے لیے آصف سابع نے فرمان نکالا۔

"چوں کہ ما بدولت کو اپنی عزیز و وفادار رعایا کی فلاح و بہبود مدنظر ہے۔ اس لیے حیدرآباد میں ایک جامعہ بہ نام "جامعہ عثمانیہ" یکم محرم ۱۳۳۷ھ سے قائم کی جائے جس کا انتظام سلطنت کے حالات کے لحاظ سے کیا جائے۔"

"اس جامعہ کا مقصد یہ ہوگا کہ مذہبی، اخلاقی، فلسفی، طبعی، طبی، تاریخی، قانونی، زراعتی، تجارتی اعلیٰ تعلیم کا اور دوسرے مفید علوم و فنون اور صنعت و

حرفت کے سکھاتے کا اور ان سب میں تحقیق و ترقی کا انتظام ہو"۔

"جامعہ عثمانیہ کی خصوصیت یہ ہوگی کہ سارے علوم کی تعلیم "اردو زبان" میں دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم بھی لازمی ہوگی"۔

چناں چہ جامعہ عثمانیہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں عہد نامئہ وارسائے لکھا جا رہا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی اور نئی صبح اور نیا سویرا طلوع ہو رہا تھا۔ حیدر آباد کو جگاتے اور نئے ماحول کو سازگار بنانے کی بے حد ضرورت تھی۔

جدید نظم و نسق نے علمی اور ثقافتی دنیا میں جب اپنی راہ کی تو تعلیم کے نئے سانچے تیار ہونے لگے۔ ذہن بیدار ہوئے اور نئے آفاق' نئی راہیں بنتی گئیں۔

اس جامعہ کی بنیاد گو ۱۹۱۸ء میں رکھی گئی لیکن تعلیم کا آغاز ۱۷ر اگست ۱۹۱۹ء میں عثمان علی خاں کے فرمان کے ذریعہ ہوا۔

عثمان علی خاں کی خواہش تھی کہ جدید و قدیم' مغربی و مشرقی علوم و فنون کا امتزاج اس طرح ہو کہ موجودہ طرزِ تعلیم کے نقائص اور کمیاں دور ہوں اور روحانی اور دماغی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جائے۔ ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے تحقیقاتی کام بھی کیے جائیں۔ یوں جامعہ عثمانیہ کی بنیاد نئے ماحول' بلند ارادوں' عزم و استقلال کے ساتھ رکھی گئی۔

یونیورسٹی کا نام "عثمانیہ یونیورسٹی" یا "جامعۂ عثمانیہ" تجویز پایا اور اس فرمان پر نظامِ سابع نے اپنی مہر ثبت کر دی۔

۱۹۱۸ء میں یونیورسٹی کی تنظیم کے سلسلے میں فرمان جاری ہوا کہ موجودہ انتظامِ تعلیم کو بیرونی جامعات سے آزاد کردیا جائے اور اعلیٰ ملکی انتظام ملک کے مخصوص ماحول اور حالات کے مدِنظر کیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ طلبہ کی اخلاقی تربیت بھی کی جائے اور ان کو تمام سائنٹفک مضامین کا شوق دلایا جائے۔

۱۹۱۹ء کی صبح "آغا منزل" میں مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کی صدارت میں افتتاحی جلسہ ہوا۔ سر اکبر حیدری نے نظام کا فرمان پڑھ کر سنایا۔ صدر یار جنگ نے جلسے کو مخاطب کیا اور دلنکر نے جنھیں جامعہ میں انگریزی کا استاد مقرر کیا گیا تھا، انگریزی میں اس بھری محفل کو مخاطب کیا۔

دوسرے ہی دن سے جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ کی جماعتیں شروع ہوگئیں۔ جامعہ کا قیام عوام کی غیر معمولی مسرت کا باعث تھا جس کی امتیازی خصوصیت اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ اور مشرقی اور مغربی علوم کا امتزاج تھا جو حیدرآباد کے لیے ایک نیا اور بڑا تجربہ تھا۔ یوں اُردو انگریزی کی ہم سفر و ہم دوش بنی اور سائنس، ٹکنالوجی اور دوسرے فنون کی تعلیم شروع ہوئی اور علماء انگشت بدنداں رہ گئے۔

علم و حکمت کے لیے نئی راہیں کھلیں، شعر و شاعری کی زبان اب علمی زبان بن گئی۔ علمی و فنی مطالب اور اصطلاحوں کو اردو زبان میں ڈھالنے کی صلاحیت پیدا کردی۔ ۱۹۱۸ء سے پہلے ایسا کوئی مرکز نہ تھا جو ملکی زبان کو یوں پروان چڑھاتا اور جدید و قدیم علوم کی اشاعت اور ترجموں سے اُردو زبان کو مالا مال کرتا۔

جدید و قدیم، مشرقی و مغربی علوم و فنون کے امتزاج سے نظامِ تعلیم کے نقائص دور کرنے اور اخلاقی، جسمانی، روحانی اور دماغی تعلیم کے جدید و قدیم

طریقوں سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ اس یونیورسٹی کا مقصد تھا کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری پیاری اُردو زبان قرار دی جائے مگر انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان ہر طالب علم پر لازم گردانی جائے۔

اس یونیورسٹی نے نوجوانوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ جب ان کے ذہنوں کو علوم و فنون کی طرف مائل کیا گیا تو نوجوان ادیب اور شاعر بن کر نکلے جن میں عابد علی خان، ڈاکٹر زورؔ، پروفیسر سروریؔ، سکندر علی وجدؔ، مخدوم محی الدین، صاحب زادہ میکشؔ وغیرہ شامل ہیں۔ مغنی تبسم، وحید اختر، شاذ تمکنت کے علاوہ بہت سے نوجوان اسی جامعہ کے سپوت ہیں۔

جامعہ کے قیام بعد نصابی کتابوں کی فراہمی کی ضرورت پڑی تا کہ دوسری زبانوں سے اُردو میں کتابیں لکھی جا سکیں اس کے لیے "دار الترجمہ" قائم ہوا اور ظفر علی خاں، عبدالماجد دریابادی، جوشؔ ملیح آبادی، وحید الدین سلیمؔ اور عبدالحق جیسے مستند علما کی خدمات حاصل کی گئیں۔ "دائرۃ المعارف" کے ذریعہ اسلامی سرمایہ کا تحفظ کیا گیا۔ جامعہ میں ایک کتب خانہ بھی منتقل ہوا جو پہلے دار العلوم کی زینت تھا۔ اس کتب خانے میں عربی، فارسی اور دوسری زبانوں کے بے شمار نایاب کتابیں موجود ہیں۔

حیدرآباد میں اُردو جامعہ کا قیام نظام سابع کا ایک جراُت مندانہ اقدام تھا جو ان کی علم پروری، تدبّر، دور اندیشی اور ذاتی دل چسپی کا نتیجہ تھا۔ اس تجربے نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اُردو زبان کس قدر باصلاحیت زبان ہے جس میں ہر قسم کے علم کو سمیٹنے کا مادّہ ہے۔ ہندوستان میں یہ پہلی یونیورسٹی یا جامعہ تھی جس

اُردو زبان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ انگلستان کی آکسفورڈ یونیورسٹی، کیمبرج یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی نے عثمانیہ یونیورسٹی کو تسلیم کر لیا۔

لندن کے کالج آف سرجن کا وفد حیدرآباد آیا اور حیدرآباد کی اس بڑی جامعہ کے تعلیمی معیار کو پرکھا، فنِ طب کی کتابوں کا معائنہ کیا اور پھر اس نے بھی جامعہ عثمانیہ کی طبّی تعلیمی معیار کو عالمی طور پر تسلیم کر لیا۔

اس جامعہ کا حیدرآباد کے باہر خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسرے دانش وروں نے اس نایاب تحریک پر نظام سابع اور ان کی کوششوں کو سراہا اور مبارک باد دی اور اپنے مشوروں سے نوازا۔

جامعہ عثمانیہ کی مختلف کمیٹیاں بنیں اور نصاب تعلیم تیار ہوا۔ دار الترجمہ میں بے شمار اصطلاحات تیار ہوئیں اور لغت بنائی گئی۔ اس دار الترجمہ نے تعداد سے بھی زیادہ کتابیں شائع کیں جس کی بنا پر اُردو حیدرآباد کی بہترین علمی اور ادبی زبان بن گئی۔

۱۹۲۳ء میں بی۔ اے کے پہلے امتحانات منعقد کیے گئے اور ۷۳ طلباء کی کامیابی پر ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر سال طلبہ اپنے علمی سرمایہ میں اضافہ کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ایم۔ اے کی جماعتیں کھلیں اور حیدرآباد کے نوجوان اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہونے لگے۔

۱۹۲۸ء میں انجینئرنگ اور میڈیکل کالج قائم ہوئے تو نوجوان انجینیر اور ڈاکٹر بن بن کر نکلنے لگے۔ اس کے ساتھ ادب، فلسفہ، معاشیات، تاریخ اور سماجی علوم نوجوانوں کی تشنگی بجھانے لگے۔ حیدرآباد کے نوجوانوں کا مستقبل سنورتا ہی گیا۔

اس تحریک نے ملک میں چاروں طرف علم کی روشنی پھیلا دی ۔ کتب خانے قائم ہوئے علمی اخبار اور رسالے جاری ہوئے اور دُور دُور سے تشنگانِ علم حیدرآباد کا رُخ کرنے لگے اور اس سرچشمۂ علم سے سیراب ہوتے گئے ۔

دارالترجمہ کا قیام ۱۹۱۷ء

جامعۂ عثمانیہ کی تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ مختلف علوم کا اردو میں ترجمہ نہ کیا جاتا اور مغربی علوم و فنون کو اردو زبان میں منتقل کیا جاتا ۔ چناں چہ اس شعبے نے اردو زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کا ہم مرتبہ بنا دیا ۔ کتابوں کے ترجموں کے لیے ماہرینِ فن کی ضرورت تھی جو فارسی اور اردو میں بھی ماہر ہوں جو صرف ماہر تعلیم ہی نہیں بلکہ صاحب قلم بھی ہوں اور انگریزی اور عربی زبان سے اردو میں منتقل کر سکیں ۔ چناں چہ سائنٹفک کتابوں اور جدید ادب و فن کی اشاعت کے لیے ۱۴ اگسٹ ۱۹۱۷ء کو نظام سابع نے اپنا فرمان جاری کیا جس کی رو سے ستمبر ۱۹۱۷ء کو دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا ۔

ناظم ادارہ کے لیے مولوی عبدالحق کا نام تجویز پایا ۔ ہندوستان کے بہترین مفکرین، جرنلسٹ، پروفیسر اور دانش وروں کا انتخاب عمل میں آیا ۔ علمی اصطلاحیں بنیں ۔ سلیس اور آسان ترجمے کیے گئے ۔ مولوی عبدالحق اور پروفیسر وحیدالدین سلیم کی رہبری اور مشوروں سے فنی مشکلات حل ہوئیں ۔ عبدالماجد دریابادی اور قاضی محمد حسن کو ریاضی اور فلسفہ کے لیے مقرر کیا گیا ۔ چودھری برکت علی کو سائنس کے لیے، قاضی تلمذ حسین نے سیاسیات کی کتابوں کا ترجمہ کیا ۔ محمد الیاس برنی نے معاشیات،

کنگ کوٹھی



حکم

موضوع:- عرضداشت صیغہ تعلیمات مورخہ ۲۴ شوال المکرم ۱۳۳۵ھ جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے متعلق شعبہ ترجمہ قائم کرنے کی نسبت ہے۔

حکم:- تمہاری رائے مندرجہ عرضداشت سے معین المہام فینانس کو اتفاق ہے منظور کی جاتی ہے حسب یونیورسٹی کا شعبہ ترجمہ قائم کیا جائے جسکا سالانہ خرچ بلا جبکٹ ۹۶۲۰۰ سے ۸۰۳۶۴ روپیہ تک ہوگا اور پہلے سال کیلئے اخراجات یکمشت مصرحہ عرضداشت کیلئے سولہ ہزار روپیہ منظور کئے جاتے ہیں مترجمین کا تقرر ابتداءً ایک سال کیلئے امتحاناً کیا جائے بعدہ ان کے کام وغیرہ کو دیکھکر انکا استقلال یا توسیع خدمت کیا جاوے حسب ضرورت و مناسبت کی جائیگی۔ ہر سال کے ختم کے بعد ... ایک نقشہ پیش حضور کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ اس سال ترجمہ کا کام کسقدر ہوا

۲۰ شوال المکرم ۱۳۳۵ھ

فرمانِ اعلیٰ حضرت بابت دار التّرجمہ

سید ہاشمی نے تاریخ ہند اور مرزا محمد ہادی رسوا نے فلسفہ کی کتابوں کے ترجمے کیے۔ تاریخ کے شعبے کے لیے عمادی، طبا طبائی، محمد مجیب، یوسف حسین خاں اور ہارون خاں شیروانی کو مقرر کیا گیا۔ جوش ملیح آبادی بھی دارالترجمہ میں ناظر ادبی تھے۔ قانون کی کتابوں کے ترجموں کے لیے میر سیادت علی، سید علی رضا اور ڈاکٹر حمید اللہ کا تقرر کیا گیا۔

اس دارالترجمہ سے جو نیا ادبی ماحول بنا ہر کسی نے اس کا استقبال کیا۔ سینکڑوں کتابوں کی مدد سے اردو زبان میں اشاعت کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا اور ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔

دارالترجمہ کی کتابوں نے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ ادب اور زندگی باہم مربوط ہو گئے۔ بیرونی شعرا، افراد ادیب حیدر آبادی ماحول سے خود کو وابستہ کرنے لگے۔ ہر طرف شعر و سخن کی محفلیں سجنے لگیں۔ ادب میں چار چاند لگ گئے۔ ذہانت اور قابلیت نے نوجوانوں کو اعلیٰ مراتب بخشے۔

سلطنت آصفیہ کا آصف سابع کا یہ حیدر آباد، ہندوستان کے نقشے پر ضوفشاں ہو گیا۔ صفحہ ہستی اور اوراقِ تاریخ میں عثمان علی خاں جاوداں ہو گئے۔

مجلسِ رفقائے جامعہ عثمانیہ نے اپنے علم پرور بادشاہ کے اس کارنامے کو سراہتے ہوئے انھیں "سلطان العلوم" کے نام سے موسوم کیا۔ جس نقش کو شاہِ عثمان کے اتالیق نواب عماد الملک کی دور بیں نگاہوں نے اختراع کیا تھا، آخر وہ شرمندۂ تعبیر ہوا اور ایسا کہ لازوال ہو گیا۔

ابتدا میں جامعہ عثمانیہ کے لیے شہر میں موجودہ اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد کے قرب وجوار میں مختلف عمارتیں کرائے پر لی گئیں۔ بعد ازاں شہر کے باہر اڈکمیٹ میں ایک وسیع اراضی جامعہ عثمانیہ کے کالجوں اور اقامت خانوں کی تعمیر کے لیے مختص کی گئی۔

میر عثمان علی خان نے ۲۲ ربیع الاوّل ۱۳۵۲ھ کو کلیہ فنون Arts College کا سنگِ بنیاد رکھا۔ جب یہ عمارت تکمیل کو پہنچی تو میر عثمان علی خان کے ہاتھوں اس کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس موقع پر اراکینِ مجلسِ اعلیٰ جامعہ عثمانیہ نے ایک سپاس نامہ پیش کیا جو شاملِ صفحات ہے۔

دائرۃ المعارف ۱۳۰۷ھ

دائرۃ المعارف کا قیام نظام دکن میر عثمان علی خاں کی علم پروری کا نمونہ ہے۔ جس کے ذریعے علوم اسلامیہ خصوصاً عربی زبان کا تحفظ کیا گیا۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے عربی زبان کے علوم و فنون کی قیمتی و نایاب کتابوں کے تحفظ و بقا کے لیے یہ تجویز رکھی تھی کہ ان علوم اسلامیہ کا اردو زبان میں ترجمے کروا کر طلبہ کو تاریخ اسلام سے واقف کرایا جائے اور ان کے لیے مشرقی دنیا کے دروازے کھول دیے جائیں۔ ملا عبدالقیوم اور نواب فضیلت جنگ نے اس کی تائید کی تھی۔ چناں چہ ان حضرات کی کوششوں سے یہ معروف ادارہ وجود میں آیا۔ نواب عماد الملک کو میر مجلس اور نواب مسعود جنگ بہادر کو معتمد دائرۃ المعارف مقرر کیا گیا۔

قابلِ اشاعت کتابوں کی تحقیقات شروع ہوئیں۔ غیر ممالک کے مشہور اداروں اور کتب خانوں کی فہرستوں کی مدد سے اور مشرقی علماء سے خط و کتابت کے ذریعے قابلِ اشاعت کتابوں کی فہرست بنائی گئی۔ قلمی نسخے فراہم کیے گئے اور ان کی طباعت اور اشاعت کے لیے عملے کا انتخاب عمل آیا اور کتابوں کی طباعت کے لیے پریس قائم کیا گیا۔

۱۹۲۷ء میں جب نواب عماد الملک کا انتقال ہوا تو دائرۃ المعارف کی میر مجلسی کی خدمت پر سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ منتخب ہوئے۔ انھوں نے اس ادارے کو جامعہ عثمانیہ کے تحت کرنے کی تجویز رکھی جو منظور کر لی گئی۔ دائرۃ المعارف کا مقصد عربی کی قدیم نادر قلمی کتابوں کو محفوظ کرنا تھا جن کے نسخے دنیا کے کتب خانوں میں کم یاب ہے۔

کتب خانۂ آصفیہ

آصف جاہی سلاطین کی فیاضی اور علم پروری کا نتیجہ تھا کتب خانۂ آصفیہ جو میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے عہد میں نواب عماد الملک کی نگرانی میں قائم ہوا۔ اس وقت یہ حیدر آباد کا شاہی کتب خانہ کہلاتا تھا۔

ابتدا میں اس میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابیں اور قلمی نسخے رکھے گئے تھے لیکن چند سال بعد اس کتب خانے نے ایسی ترقی کی کہ اس کا شمار ہندوستان کے چند مشہور کتب خانوں میں ہونے لگا اور قدیم نسخے اور مخطوطات کے باعث اس کتب خانے کی آب و تاب میں اضافہ ہونے لگا۔ اس کتب خانے کا افتتاح میر عثمان علی خاں نے فرما کر اپنی علم دوستی اور علم پروری کا ثبوت دیا۔

پہلے یہ کتب خانہ صدر ٹپہ خانہ عابد روڈ کی عمارت میں تھا جو منہدم کر دی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں موسیٰ ندی کے کنارے سوا لاکھ روپے کی لاگت سے دو منزلہ عمارت کی تعمیر کروائی گئی جو آج شہر کے بیچوں بیچ اپنی نفاست اور خوب صورتی کی وجہ سے آپ اپنی نظیر ہے۔

سپاس نامہ

بہ پیش گاہ حضور پرنور اعلیٰ حضرت قدر قدرت رستم دوراں ارسطوئے زماں

ہز اگزالٹڈ ہائینس لفٹننٹ جنرل سپہ سالار، آصف جاہ مظفر الملک و

الممالک نظام الملک نظام الدولہ

نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر فتح جنگ یار وفادار دولت برطانیہ

جی سی ایس آئی، جی، بی، ای شہریار دکن و برار

سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

بعد از آستاں بوسی ارکانِ مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ بصد ادب عرض پرداز ہیں کہ آج مسرت و شادمانی کا وہ مبارک و مسعود دن آیا ہے جس کے لیے وہ عرصہ دراز سے چشم براہ تھے۔ یعنی بالآخر ان کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہوئیں اور وہ عظیم الشان عمارت بفضلہ تیار ہوگئی جو جامعہ اور اس کے رفیع المرتبت بانی و سرپرست کے شایانِ شان ہے۔

حضرت جہاں پناہی کے عہد عطوفت میں اہلِ ملک کے معاشی اور تمدنی حالات میں جو اصلاح ہوئی ہے اور تعلیم کے تمام شعبوں میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے ایک عالم پر آشکارا ہے۔ زمامِ حکومت اپنے مبارک ہاتھوں میں لیتے ہی تعلیم کی تنظیم جدید اور اس کی اصلاح و ترقی کی طرف توجہِ بلیغ فرمائی گئی۔ جس سے تعلیم کے تمام شعبوں میں نئی جان پڑ گئی۔ جب تعلیمی اصلاح کافی طور پر

عمل میں آگئی تو اس وقت کے معتمد تعلیمات نے جو اب جامعہ چانسلر ہیں اسی سلسلے میں غور و خوض اور مشاہیر ہند سے مشورہ کرنے کے بعد ایک معروضہ پیش کیا جس میں عرض کیا گیا تھا کہ "ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صحیح اصول تعلیم، ملکی ضروریات اور قومی خصائص پر قائم ہو، جس میں قدیم و جدید دونوں طریقوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو تعلیمی بھی ہو اور امتحانی بھی، اور ساتھ ہی تالیف و ترجمہ کا کام بھی کرے، اور جو تربیت ذہن اور تحصیل علم کے لیے اپنی ہی زبان یعنی اردو کو کام میں لائے" اس معروضے کو بذریعہ فرمان واجب الاذعان مترشحہ ۴ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ میں شرف قبولیت بخشا گیا اور بہ الطاف شاہانہ ارشاد فرمایا گیا کہ :

"میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول محولہ معروض داشت کے موافق ممالک محروسہ کے لیے حیدر آباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے"۔

بخیال ہے اس حکم محکم کی تعمیل میں جو ملک کے لیے آیۂ رحمت ثابت ہوا قیام جامعہ کے لیے ضروری کارروائی شروع کر دی گئی اور بہ افضال الٰہی و شفقت مربیانہ حضرت جہاں پناہی جامعہ کو جو روز افزوں ترقی نصیب ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔ زبان اردو میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں موجود نہیں تھیں جو کالج کے طلبہ کے کام آسکیں اس لیے ۱۸ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ (یکم آبان ۱۳۲۶ ف) دار الترجمہ کا قیام عمل میں آیا تاکہ ضروری کتابیں تالیف ترجمہ کی جاسکیں۔ اس ادارے کے قیام سے حضرت اقدس و اعلیٰ نے زبان اردو پر

سب سے بڑا احسان فرمایا ہے کیوں کہ اس کی وجہ ہماری زبان مختلف علوم و فنون کی بلند پایہ تصانیف سے مالامال ہو کر ہندوستان کی تمام زبانوں میں ممتاز ہو گئی ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت سے نہ صرف اردو میں اعلیٰ تعلیم کی ترویج ممکن ہو گئی ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے جو زبان انگریزی سے بہ خوبی واقف نہیں ہیں علوم و فنون کے لازوال خزانے کھل گئے ہیں۔

کتابوں کی ضروری تعداد تیار ہوتے ہی شعبہ فنون کے سالِ اوّل کی جماعت کا قیام یکم ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ کو عمل میں آیا اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے اعلیٰ جماعتوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ ہندوستان کی دیگر سربرآوردہ جامعات کی طرح ہر مضمون میں ایم۔ اے کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کر دیا گیا ہے اور علمی تحقیقات کے لیے پی۔ ایچ۔ ڈی کی جماعتیں کھول دی گئی ہیں۔ آکسفورڈ، کیمبرج اور لندن کی ممتاز جامعات اور ہندوستان کی بیش تر جامعات نے جامعۂ عثمانیہ کی اسناد کو تسلیم کر لیا ہے۔ شعبۂ فنون کے علاوہ جس سے تعلیم کا آغاز ہوا دوسرے شعبے بھی اپنے اپنے وقت پر کھول دیے گئے۔ چناں چہ جامعہ میں اب شعبہ جات دینیات، فنون، سائنس، طبِ مغربی، انجینیرنگ اور فنِ تعلیم موجود ہیں اور قوی امید ہے کہ حضرت اقدس و اعلیٰ کے ظلِّ عاطفت میں دوسرے شعبے بھی مثل زراعت، صنعت و حرفت و فنونِ لطیفہ جلد وجود میں آ جائیں گے۔

جامعہ کی ضروریات کے مطابق سرکاری عمارتیں موجود نہ ہونے سے صرف یہی مشکل نہ تھی کہ تعلیمی کام کرایے کے ناموزوں مکانوں میں انجام دینا پڑا بلکہ اس سے زیادہ ناموزوں وہ ماحول تھا جس میں طلبہ کو رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے کالج

کے قیام کے بعد ہی اڈک میٹ کے پُر فضا اور خوش آب وہوا میدان میں تعمیرِ عمارت کا کام شروع کر دیا گیا جس کا سنگِ بنیاد حضرت اقدس واعلیٰ نے بمراحمِ خسروانہ اپنے دستِ مبارک سے ۲۲ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ کو رکھا اور آج جس کے افتتاح کی مودبانہ استدعا کی جاتی ہے ۔ یہ عمارت جامعہ کی عمارتوں میں سب سے شاندار ہے اور ہمارے ملک کی اس قدیم اور مقدس تہذیب کو یاد دلاتی ہے جو اس خطّے کے ہندو مسلمانوں کی یک جہتی اور سے وجود میں آئی ۔ شعبہ جات فنون و دینیات و قانون کی تمام جماعتوں کے علاوہ جامعہ کا دفتر بھی فی الحال اس میں رہے گا ۔ باخبر مبصّروں کی رائے ہے کہ یہ عمارت جو قریب ۳۰ لاکھ کے صرفِ خطیر سے تیار ہوئی ہے تمام ہندوستان میں اپنی آپ نظیر ہوگی اور مبارک عہدِ عثمانی کی دائمی یادگار رہے گی ۔ تشنگانِ علم صدیوں تک اس چشمۂ علم و ہنر سے سیراب ہو کر حضرت جہاں پناہی کے لیے دست بدعا رہیں گے ۔ یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس سے قبل دو بڑے دار الاقامہ تیار ہو چکے ہیں اور سائنس کالجوں کی تعمیر کا کام عن قریب شروع کر دیا جائے گا ۔ اس نوبت پر یہ عرض کرنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ اس عمارت کی خوبیٔ تعمیر دو عہدہ داران یعنی نواب زین یار جنگ بہادر اور سید علی رضا کی محنت شاقہ و شغف و انہماک و مہارتِ فنی کا نتیجہ ہے ۔ ابتدا میں موسیو جاسپر سے بھی جو بلجیم کے نامور ماہرِ تعمیر ہیں مشورہ لیا گیا تھا ۔

اب یہ معروضہ ادب ختم کیا جاتا ہے ۔

فدویان و جاں نثاران اراکین مجلسِ اعلیٰ جامعۂ عثمانیہ

اُردو زبان اور آصف جاہی سلطنت

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطنتِ مغلیہ میں فارسی سرکاری زبان رہی لیکن عوام کی زبان ہندی یا پراکرت کی مختلف شاخیں تھیں ۔ دکن میں بہمنی سلطنت کے بعد جو اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں ان کی سرکاری زبان بھی فارسی تھی لیکن قدیم اردو یا دکنی کا رواج بھی ہو چلا تھا۔ اُردو چوں کہ مسلمان حکمرانوں کے زیرِ سایہ پلی اور پروان چڑھی اس لیے اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں برخلاف ہندی کے جو اپنے اصلی ماخذ سنسکرت کی طرف پلٹ گئی ۔ آج ادبی اُردو اور ادبی ہندی میں کوئی مناسبت نہیں رہی۔

اُردو زبان کو ہندوستان میں فروغ دینے اور بول چال کی سطح سے نکال کر ادبی سطح تک پہنچانے میں اولیاءاللہ، صوفیوں اور فقیروں کا بہت بڑا حصّہ رہا ہے ۔ تبلیغ دین کے لیے اُردو ہی ایک موثر زبان بنی کیوں کہ فارسی، عربی اور ترکی عوام الناس کی زبانیں نہیں تھیں ۔ اور تبلیغ اسلام کے لیے ایسی زبان کی ضرورت تھی جو کہنے لینے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ چناں چہ اُردو کی ابتدائی تحریریں مذہبی رنگ میں ڈوب گئیں اور اُردو ایک وسیلہ بن کر ترقی کرتی چلی۔

جب محمد تغلق نے دولت آباد کو پایۂ تخت بنایا تو تمام اہلِ دہلی کو ترکِ وطن

کا حکم دیا۔ اُردو بھی دہلی کے خانہ بدوشوں کے ساتھ دکن آئی۔ دہلی ویران ہوئی، تو دکن آباد ہوا۔ دہلی کے تمام شعرا، علما، فضلا اور فقرا منتشر ہوگئے اور دہلی کا علم شمال سے جنوب میں پھیل گیا۔

۱۵ ویں صدی عیسوی کے اواخر میں شاہ بہاء الدّین باجن اور ۱۶ ویں صدی عیسوی میں شاہ علی[1] نے گجرات میں اس نئی زبان میں وعظ دیے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ دہلی سے گجرات آئے اور یہاں قیام کیا پھر دکن کی راہ لی۔

دکن میں اس وقت بہمنی سلطنت تھی۔ فیروز شاہ بہمنی کی دعوت پر وہ گلبرگہ آئے اور یہیں ان کا وصال ہوا۔ گجرات پر بیرونی حملہ آوروں کا تسلّط ہوا تو وہاں کے علما و فضلا نے دکن کا رُخ کیا اور بیجاپور کو اپنا وطن بنایا۔ اس طرح گجرات کی دولت عادل شاہی حکمرانوں کے ہاتھ آئی۔ عادل شاہی دور میں شاہ میراں جی شمس العشاق اور برہان الدّین جانم نے اُردو زبان کے نظم و نثر کے بہترین نمونے چھوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ عادل شاہ ثانی کے دربار میں اہلِ قلم اور شاعر آتشی، مقیمی، امین اور نوری نے محمد عادل شاہ کے زمانے میں ملک خوشنود اور صنعتی نے؛ علی عادل شاہ کے عہد میں نصرتی، شاہ ملک اور ہاشمی نے اُردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی اور اپنی شاعری کے مایۂ ناز نقوش چھوڑے ہیں۔

بہمنی سلطنت کے بعد عادل شاہوں اور قطب شاہوں کی اسلامی سلطنتوں نے اس زبان کو بہت ترقی دی گو ان کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ اُردو اب

---

[1] شاہ علی جیو گام دھنی

ایک مستقل زبان بن چکی تھی جس میں ہر مطلب کے ادا کرنے کی صلاحیت، فصاحت اور بلاغت پیدا ہو چکی تھی۔ اس زبان میں مرثیے، مثنویاں، غزلیں لکھی جانے لگی تھیں۔

بیجاپور کے ساتھ گولکنڈہ اور حیدرآباد بھی اُردو زبان و ادب کے بہت بڑے مرکز بن گئے تھے۔ خود بادشاہ محمد قلی قطب شاہ دکنی اُردو میں شعر کہتے تھے اور پہلے صاحب دیوان شاعر تھے۔ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ، اور ابوالحسن تاناشاہ نے اپنی سخن فہمی اور سخن سنجی سے غواصی، وجہی، ابن نشاطی جیسے شاعروں کے کلام اور ادب سے اس زبان کو عروج پر پہنچایا۔ ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں محمودؔ، فیروزؔ اور احمد گجراتی پہلے ہی اس سلطنت میں مانے ہوئے شاعر رہ چکے تھے۔ اس سلطنت کے زیرِ سایہ اُردو زبان "دکنی اُردو" کے نام سے موسوم تھی۔

جب سلطنتِ آصفیہ کی بنیاد حیدرآباد دکن میں رکھی گئی تو فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کا چلن باقی رہا۔

آصفی سلاطین نے اس زبان میں اپنی شاعری کے خوب صورت نمونے چھوڑے ہیں۔ محبوبِ دکن میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے اُردو کی ترقی کے لیے بجائے فارسی کے اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ کسی ملک کی عام زبان کو جب سرکاری سرپرستی ملتی ہے تو اس کی ترقی میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ وہ گلی گلی کوچے کوچے میں پہچانی، بولی اور سمجھی جاتی ہے چنانچہ اُردو زبان ہر کسی کی آنکھوں کا تارہ بن گئی۔

پھر تو یہ عدالتوں میں پہنچی اور ۱۳۰۱ھ میں فرمانِ مبارک کے ذریعے

دفاتر میں مکمل کام اُردو زبان میں ہونے لگے۔ یوں محبوب نے اس محبوبۂ دکن کو اپنی سرپرستی دے کر نہ صرف یہ کہ ایک تابناک کام انجام دیا بلکہ اُردو کو سجا سنوار کر شہ نشین پر متمکن کیا۔ لوگوں کے دلوں میں بٹھایا اور پھر زندگی کے ہر شعبے میں، ہر گھر میں اُردو راج کرنے لگی۔

میر عثمان علی خاں آصف سابع نے اُردو نوازی سے اسے وہ مقام عطا کر دیا کہ آج یہ کسی بھی زبان کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ غالبؔ کی یہ منہ چڑھی امیر خسرو کی دہلیز سے نکل کر شاہی محل میں پہنچی تو ہر کسی نے اسے سلام کیا۔ اس کی عزت افزائی ہوئی اور جس کسی نے اس کا دم بھرا وہ ذرّے سے آفتاب بن گیا۔ اردو گیت، غزل، مرثیے، قصیدے، قوالی گائکوں نے گائے۔ گداؤں فقیروں نے اس سے روزی کمائی۔ راگ راگنیاں بنیں اور شاعر اور ادیب نے اُردو دنیا میں دھوم مچا دی۔

یہ حقیقت ہے کہ اظہارِ مطلب کا جو سلیقہ اُردو میں ہے، جو شائستگی اور تہذیب اس میں ہے اس نے غیر مہذّب کو بھی مہذب بنا دیا۔ یہاں تک کہ ہماری تہذیب خود "اُردو تہذیب" کہلانے لگی۔ دبستانِ دہلی، دبستانِ لکھنؤ، دبستانِ دکن، ہر دبستان میں اس کا حُسن اور دل نوازی دلوں کو گرماتی رہی۔ میرؔ کو اس نے سوز بخشا، غالبؔ کے گھر اس نے پیار و محبت، ہجر و وصال کے گیت گائے اور اقبالؔ کے زمان و مکاں میں پہنچ کر تصوّف و فلسفہ، خودی و وحدت کے قدم چومے۔ ولیؔ، سراجؔ، قطبؔ، آصفؔ، عثمانؔ کے گلے کا ہار بن گئی۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اُردو زبان و ادب کی بے مثال خدمت انجام دی ہے

جس کی بنا پر میر عثمان علی خاں کا نام تاریخ دکن میں ہمیشہ محسنِ اردو کے
نام سے زندہ جاوید رہے گا۔ اگر یہ جامعہ نہ ہوتی تو ریاست کے لاکھوں
نوجوان زیورِ تعلیم سے محروم رہ جاتے۔ خواتین علم و ادب میں وہ مقام
نہ پاسکتیں جو انھیں آج حاصل ہے ۔۔ میر عثمان علی خاں کا دور ادب و
شاعری کا زرین دور تھا۔

اردو ہماری پرانی تہذیب کی یادگار اور نشانی ہے اور سلطنتِ آصفیہ قدیم و
جدید تہذیب کا سنگم ہے۔

ڈاکٹر زور کے ان الفاظ سے حیدرآباد اور اردو کے صحیح موقف کا پتہ چلتا ہے۔

"حیدرآباد تین صدیوں سے علم و فضل اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے۔
سینکڑوں بلند پایہ ادیب، شاعر اور صحافی یہاں پیدا ہوئے یا باہر سے آکر بس
گئے۔ جدید سیاسی نظریوں نے ہر جگہ ہر چیز کی قدر و قیمت کو متاثر کردیا ہے۔
ہر انقلاب کے پیچھے تعمیری اور تخریبی قوتوں کو ابھرنے اور سرسبز ہونے کا موقع
ملتا ہے۔ عبوری دور کے ختم ہونے پر سیاسی بصیرت اور برے بھلے کی تمیز
بھی پیدا ہوتی ہے۔ اردو کو شہر بدر کرنے کی کوشش بھی ہوئی لیکن اردو کی فطری

۱- ہر زبان کو اپنانے
راویوں کے نغموں

آصف جاہی سلاطین کی اردو نوازی کے نمونے

آصف جاہ اوّل نواب قمرالدین خان نے جب ۱۷۲۴ء میں دکن میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور سلطنتِ آصفیہ کی بنیاد رکھی تو عروسِ اُردو کو نہیں معلوم تھا کہ اس کی کاکلیں، اس کی زلفوں کو سنوارنے والے شاہی ہاتھ اس کی قسمت کے ستارے کو کس بلندی تک پہنچائیں گے اور اس کی روشنی کہاں کہاں پہنچے گی۔

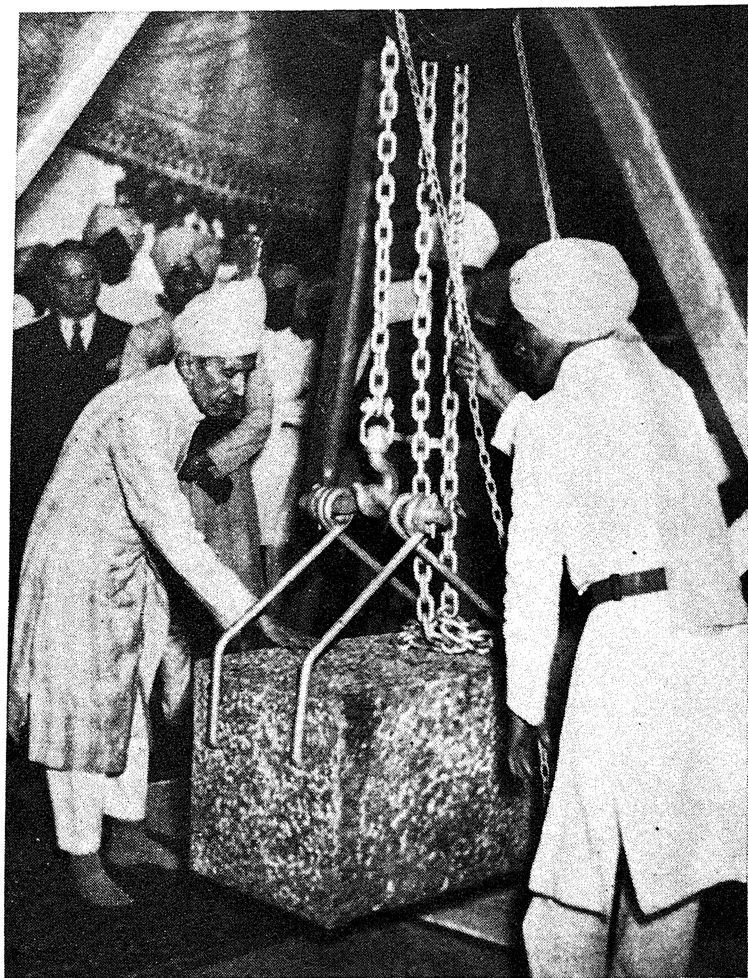
دکن میں آصف جاہ اوّل کو نہ صرف یہ کہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کی روایات، تہذیب و تمدّن ورثے میں ملی بلکہ علم پروری اور علم نوازی بھی ان کے حصے میں آئی۔

وہ صاحب سیف و قلم تھے۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب کی مہربانیاں ان

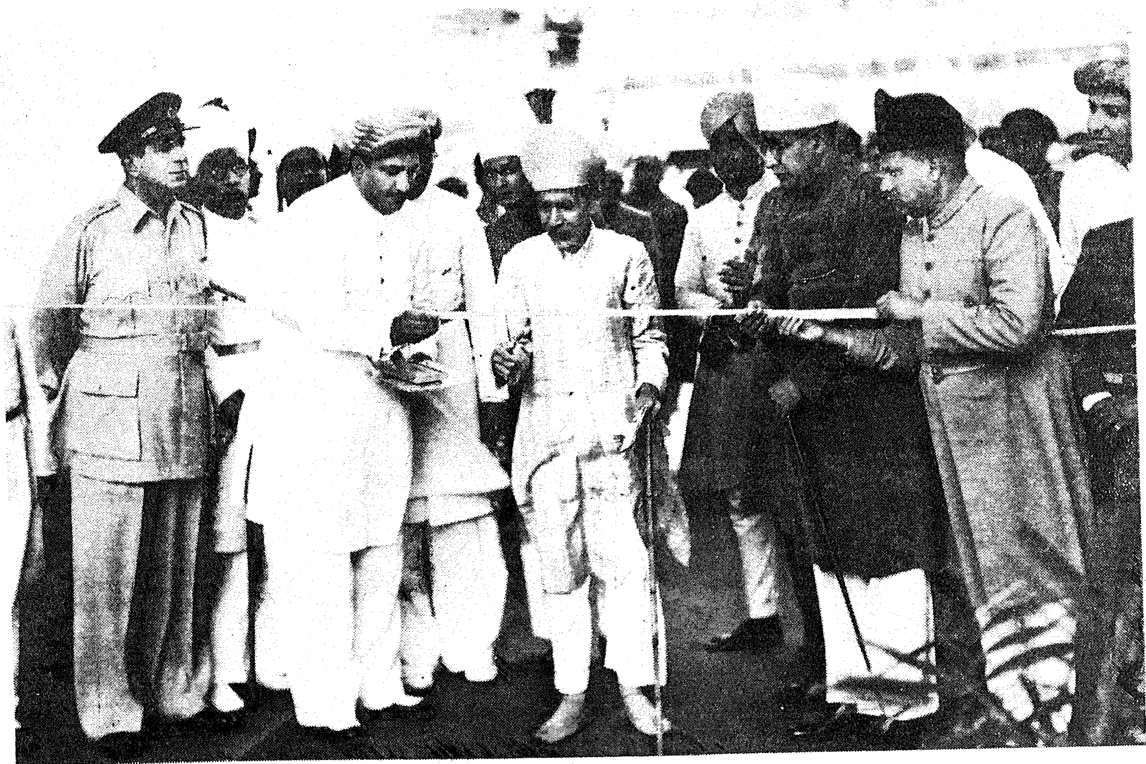
کے ساتھ تھیں۔ وہ نہ صرف ایک زبردست سپہ سالار، فاتح اور مدبّر سیاست داں تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر اور علم وفن کے قدرداں اور سرپرست بھی تھے۔ فتوحاتِ دکن نے انھیں مصروف ضرور رکھا لیکن جب آصفیہ حکومت مستحکم ہوگئی تو انھوں نے اردو کی اشاعت اور سرپرستی کی طرف توجہ کی ــــ علما، فضلا، شاعر اور ادیب ان کے دربار میں باریاب ہوئے۔ اورنگ آباد جو ان کا دارالخلافہ تھا، شعروسخن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ درگاہ قلی خاں، خواجہ قلی موزوں، علی نقی خاں ایجاد اور مرزا داؤد ان کے درباری شاعر تھے۔ مورّخ محمد ہاشم خاں ان کے دیوان مقرر ہوئے تھے اور مرزا خاں ہمدانی ان کے میر منشی۔ اسی طرح عاجز اور جرأت کو مناصب حاصل تھے۔

شعرا نوازی کے ساتھ انھوں نے طلبہ کے لیے وظیفے جاری کیے۔ علما، فقرا، صوفیا ان کے دربار سے فیض یاب ہوتے رہے۔ وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ پہلے شاکر تخلص کرتے تھے پھر آصف۔ اور مرزا بیدل سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ علم نواز اور علم پرور بادشاہ نے مدرّسین کی ہمّت افزائی کی اور علم کی ترویج وترقی کے لیے بھرپور امداد دی۔

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی جب تخت نشین ہوئے تو دارالخلافہ اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوا۔ ان کی علمی قدردانیوں نے یہاں کے ادبی ماحول کا رنگ وروپ اور بھی نکھار دیا۔ امرا بھی شعرا کی سرپرستی کو باعثِ فخر سمجھنے لگے۔ شمس الامرا، اور اعظم الامرا ارسطو جاہ کو شہرت دوامی ملی ۔



مجلسِ مقننہ کا سنگِ بنیاد
بہ دستِ اعلیٰ حضرت
۲۷ رجون ۱۹۴۸ء

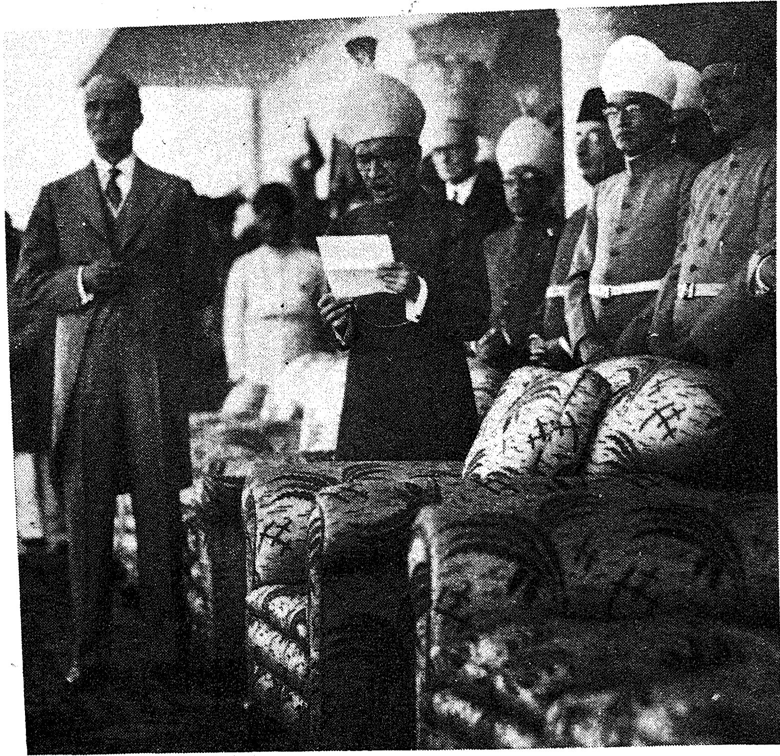


مدینہ بلڈنگ کا افتتاح

مرزا



جوبلی ہال میں شاہ ایران کے خصوصی بنکوئٹ میں ملکۂ شاہ ایران کے ساتھ ۲۸ ؍فروری ۱۹۵۶ء



مدرسہ عالیہ کے پویلین میں سرکار اڈریس پڑھ رہے ہیں ۔ ۱۹ ر فروری ۱۹۴۷ء
زین یار جنگ ۔ دین یار جنگ ۔ اعظم جاہ بہادر ۔ سر مرزا اسمٰعیل اور رزیڈنٹ ہربرٹ دیکھے جا سکتے ہیں ۔

تاریخ نگاری کو فروغ ہوا اور لچھمی نارائن شفیق نے "سوانحِ دکن" لکھی۔ شاہ تجلّی علی نے "آصف نامہ" تصنیف کیا اور قادر خاں بیدری نے "تاریخِ دکن" لکھی۔ مرزا علی لطف "گلشنِ ہند" اور میر قمر الدّین منت نے "شکرستان" تصنیف کی۔ شاہ کمال الدین نے "مجمع الانتخاب" لکھی۔ ان تینوں کو دربار سے ۴ سو اور ۲، ۲ سو روپے ماہوار ملا کرتے تھے۔

میر محمد خاں صلابت جنگ آصف جاہ اوّل کے تیسرے صاحبزادے تھے جن کا دور حوادث و لڑائیوں سے بھرا تھا۔ اسی دور میں مرہٹوں نے زور پکڑا اندرونی سازشیں ہوئیں جس میں علم و ادب کے چراغ تو نہ جل سکے لیکن انھوں نے اردو کی ترقی میں بہت کوشش کی۔ "تذکرۂ شعرائے ادب" ان کے اس پُر آشوب دور کا ہی کارنامہ ہے۔ "گلشنِ گفتار" کے نام سے حمید خاں حمید نے شمالی ہند اور دکن کے شعرا کا تذکرہ کیا ہے۔ "چمنستانِ شعرا" لچھمی نارائن شفیق اور "ریاضِ حسینی" عنایت اللہ نے اسی دور میں لکھے۔

نوازش علی خاں شیدا نے "اعجاز احمدی" نام کی ایک طویل مثنوی لکھی دکن میں گو مثنویوں کا رواج تھا لیکن حضرت محمد صلعم پر پہلی بار شیدا کے قلم نے مثنوی لکھنے کی جرأت کی۔ واقعہ کربلا پر ایک طویل مثنوی "روضۃ الاطہار" کے نام سے بھی لکھی۔ شاہ فضل اللہ فضل نے "بوستانِ خیال"، قصہ پریم سوکا" اور قصہ "بھرہ بھوکا" مرتب کیا۔ ایک اور مثنوی قادر سامی نے ۷ ہزار اشعار پر مشتمل "سرو شمشاد" لکھی۔ ان کی دوسری مثنوی "طالب اور موہنی" تھی۔ اس طرح اس پُر آشوب دور میں بھی خانوادۂ آصفی کے اس شہزادے نے شعرا اور

ادیبوں کی سرپرستی کی۔

آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ کا عہدِ حکومت باوجود سیاسی انتشار انگیزی کے علمی اور ادبی میدان میں ترقی کرتا رہا۔ نظام علی خاں اور سکندر جاہ کے دور میں تاریخ نگاری خصوصی طور پر مقبول ہوئی۔ اور تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کا عہد وہ عہد تھا جب دہلی اور لکھنو کے دانشور، شعرا، ادیب علما، فضلا ایک ایک کرکے حیدرآباد میں آنے لگے تھے اور اردو شاعری نے نئے آفاق ڈھونڈے تھے۔ مہاراجہ چندو لال شاداں کی ہمت افزائی اور قدر دانی کے سبب شاہ نصیر دہلوی، ذوالفقار علی صفا اور حسین علی ایما حیدرآباد آئے۔ نثر نگاری کو بھی فروغ ہوا اور مغربی علوم و فنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

ساتھ ہی دکنی زبان کے محاورے اردو زبان میں منتقل ہونے لگے۔ دہلی اور لکھنو سے آنے والے شعرا کی وجہ سے اردو زبان میں فصاحت کے ساتھ تکلف شامل ہوا اور کلام میں تصوف کے رنگ کے ساتھ عشقیہ رنگ بڑھنے لگا۔ خیال آفرینی اور فصاحت نے کلام کو بلند مقام بخشا۔ تعلیم کے میدان میں علاوہ ترجموں کے ڈاکٹری کی تعلیم بھی اردو میں ہونے لگی۔ اور اس کے لیے اصطلاحات کے ترجمے ہوئے اور مختلف کتابیں مہیا ہونے لگیں۔

آصف جاہ خامس نواب افضل الدولہ کے دورِ حکومت میں تاریخ، فلسفہ، ریاضی، کیمیا، ہندسہ، طبیعیات سارے فنون اردو نثر میں منتقل ہونے لگے۔ پہلے نثر میں صرف تصوف و فقہ کی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان سے

مختلف فنون کی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے ۔ اس طرح اردو ادب کا خزانہ بیرونی علوم وفنون کے حصول سے مالا مال ہوتا گیا۔

آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں کے دور میں اردو نے ہر میدان میں ترقی کی۔ نظم اور نثر میں ترقی کے نئے باب کھلے ۔ شمالی ہند سے آنے والے شاعر اور ادیب اردو کی خدمت بھرپور طریقے سے کرنے لگے۔ علم پرور اور ادب نواز بادشاہ نے اپنے آبا و اجداد کی طرح اُردو کے ان دیوانوں کی سرپرستی کی جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے شاعری کو سینچا۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، اور جلیل مانک پوری، بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ بادشاہ نے حضرت داغ کی شاگردی بھی قبول کی اور ان ہی کے رنگ میں غزلیں لکھتے رہے۔ نظم و نثر پر عبور حاصل تھا۔ آصف تخلص کرتے تھے اور اردو کے پرگو شاعر تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاد، نواب خاں خاناں آصفی، نواب آصف یاورالملک اس دور کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ حبیب کنتوری، علی حیدر نظم طباطبائی، کاظم حسین شیفتہ، ظہیرالدین ظہیر دہلوی بھی آپ کے دربار سے وابستہ رہے۔

انشاپردازوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی، نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، شبلی نعمانی، نواب عزیز جنگ ولا، انوار اللہ خاں انوار، مانک راؤ وٹھل اور عبدالجبار خاں آصفی اس عہد کے چند مشاہیر تھے۔

شبلی نعمانی کے قلم نے "الغزالی" علم الکلام "موازنہ انیس و دبیر" جیسی کتابیں لکھیں۔ سلسلۂ آصفیہ کے نام سے مشرقی اور مغربی علوم کی کتابوں سے ترجمے کیے گئے۔ علمی اداروں اور انجمنوں کی سرپرستی ہوئی ۔ اخبار اور رسائل جاری

ہوئے ۔ "انجمن ترقی اُردو" کا قیام اسی دور میں ہوا ۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدارس کھولے گئے ۔ 'محبوبیہ گرلز اسکول' اسی زمانے کی یادگار ہے ۔ طلبہ کے لیے وظیفے جاری ہوئے ۔

سب سے اہم کارنامہ آصف جاہ سادس کا اُردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ قرار دینا تھا ۔

آصف سابع میر عثمان علی خاں کا عہد اُردو زبان کا زرین دور کہلاتا ہے ۔ شعر گوئی اور نثر نگاری کا چلن اس دور میں عام ہو گیا ۔ میر عثمان علی خاں خود فارسی اور اُردو میں شعر کہتے اور عثمانؔ تخلص کرتے تھے ۔ جلیلؔ مانک پوری سے اصلاح لیتے ۔ آپ کے کلام کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں ۔ ان کی ادبی سرپرستی اور سخن پروری نے کشن پرشاد شادؔ، ماہ لقا بائی چنداؔ، محمد فیضؔ اور چندو لال شاداںؔ کو بامِ عروج پر پہنچایا ۔ ملکۂ دکن بھی شاعری کا ذوق رکھتی تھیں اور اعجازؔ تخلص فرماتی تھیں ۔

عثمانؔ کا دور اُردو ادب و شاعری کا ایک روشن مینار کہلایا جاسکتا ہے ۔

ادیبوں، شاعروں اور علمی اداروں کی سرپرستی

میر عثمان علی خاں کا عہدِ حکومت اُردو کی ترقی کے لحاظ سے گزشتہ تمام عہدوں سے ممتاز تھا۔ اُردو زبان و ادب کی سرپرستی اس اعلیٰ پیمانے پر ہندوستان بھر میں کہیں اور کسی وقت نہیں کی گئی تھی۔

دہلی کے فرماں روا محمد شاہ، شاہ عالم، جلال الدین اکبر اور بہادر شاہ ظفر

اور لکھنؤ کے آصف الدّولہ اور واجد علی شاہ اُردو شعر و سخن کی قدردانی کے لیے مشہور ہیں لیکن کسی نے اُردو کی تعمیر ان مستحکم بنیادوں پر نہیں کی جس طرح عہدِ عثمانی میں میر عثمان علی خاں نے کی۔

ماضی کی تمام اردو نوازیاں ادبیات، اور شعر و سخن تک محدود تھیں لیکن آصف جاہی سلطنت کے اس فرماں روا نے اُردو زبان کو اس قدر وسعت دی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی زبان کی برابری کرتی رہی۔ اور قدیم و جدید علوم و فنون کی حامل ہو گئی۔ ہندوستان کی کسی اور زبان کو یہ اہمیت اور خصوصیت حاصل نہیں ہو سکی۔

عثمان علی خاں کی ادبی سرپرستی اور قدر افزائی نے اُردو کے جن خدمت گزاروں کی کوششیں سرسبز و شاداب کیں ان میں ان ادیبوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے جنھیں تصنیف و تالیف یا شعر و شاعری کے صلے میں عثمان علی خاں نے منصب اور ماہواروں سے سرفراز کیا تھا۔ شبلی نعمانی اور عبدالحلیم شرر اپنی وفات تک عثمان علی خاں ہی کی بدولت خوش حالی کی زندگی بسر کرتے رہے اور اُردو ادب کو گراں بہا تحریروں سے مزیّن کیا۔

عبدالماجد دریا بادی، خواجہ حسن نظامی، سلیمان ندوی، ظفر علی خاں جیسے انشا پرداز عثمان علی خاں کی سرپرستی کی وجہ سے حیدرآباد سے دُور اپنے اپنے وطن میں اُردو کی خدمت کرتے رہے۔

نواب فصاحت جنگ جلیلؔ، امیرؔ مینائی کے جانشین اور خانوادہ آصفی کے استادِ سخن تھے۔ عثمان علی خاں نے انھیں خاطر خواہ ماہوار تنخواہ کے علاوہ مختلف

اعزازات اور خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ جلیل کا کلام ہند و دکن کے رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ اس طرح کئی انشاپردازوں نے عثمان علی خاں کی قدردانی کے سبب اپنے رشحاتِ قلم سے نام کمایا اور دربارِ عثمانی سے وابستہ رہے۔

کشن پرشاد شاد اور نظم طباطبائی نے اپنے کلام سے اپنا نام زندہ کر دیا۔ نظم طباطبائی دارالترجمہ سے وابستہ تھے۔ صادق جنگ صلم ان کے مقربان خاص میں سے تھے۔ ان کے برج بھاشا کا کلام دورِ عثمانی میں ممتاز تھا۔ ضیا یار جنگ ضیا فارسی کے شاعر تھے جن کی سنجیدہ شاعری نے شعر و سخن کے معیار کو بلند کیا۔ حضرت جوش ملیح آبادی بھی دارالترجمہ سے وابستہ تھے۔ متعدد ادیب اور شاعر حکومت کے کسی نہ کسی محکمے میں ملازم تھے اور علمی اور ادبی دنیا کی خدمت کر رہے تھے۔ عزیز یار جنگ، خورشید علی، مولوی عبدالحق، رائے مانک راؤ، راجہ راجیشور راؤ اصغر حضرت امجد حیدرآبادی، صفی اورنگ آبادی، ضامن، محمد حسین آزاد، ظفر یاب خاں آغا حیدر حسن، نصیر الدین ہاشمی، سید علی اصغر بلگرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں غرض عثمان علی خاں کا فیض جاری و ساری تھا۔

میر عثمان علی خاں نے مختلف اداروں اور انجمنوں کی طرف بھی توجہ کی

حیدرآباد ایجوکیشنل سوسائٹی تخت نشینی کے دو سال کے درمیان انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی اور مختلف سرگرمیوں اور تنظیموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس انجمن نے اردو زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں کام انجام دیا۔ انجمن کے اراکین اردو کے انشاپرداز اور شاعر تھے۔ جنہوں نے اپنی تخلیقات سے حیدرآباد کی اردو دنیا

میں نیا ذوق پیدا کیا۔ تعلیم نسواں کے ضمن میں بھی اس انجمن نے حکومت کی توجہ مبذول کروائی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے سلسلے میں بھی اس نے بہت کوشش کی۔

انجمن ثمرۃ الادب : یہ انجمن بھی دار العلوم کے طلبہ کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ اس انجمن کی لائبریری میں ۵۰۰ کتابیں، اخبار اور رسائل تھے تاریخ، فلسفہ اور سیاست اور تمام اخلاقی و علمی کتابیں یہاں رکھی جاتی تھیں۔ علمی مباحث، تقاریر، اور لیکچر ہوا کرتے تھے۔ مختلف علمی جلسے بھی ہوتے اور طلبہ میں اردو زبان کا ذوق پیدا کیا جاتا تھا۔ حیدرآباد کے باہر سے بھی علما و فضلا یہاں آتے۔ اس انجمن کی طرف سے ایک رسالہ "ثمرۃ الادب" نکلتا تھا جس کے مدیر محمد عبد الواسع صفا اور مہتمم نصیر الدین ہاشمی تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام پر دار العلوم کالج اس میں منتقل ہو گیا۔ ثمرۃ الادب بھی "انجمنِ اتحاد" میں ضم ہو گئی اور کتب خانہ یہاں منتقل کر دیا گیا۔ اس انجمن نے اردو تحریر و تقریر کی طرف توجہ کی اور ذوقِ مطالعہ کو بڑھایا۔

مجلسِ اشاعت العلوم : ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئی اور اردو کی خدمت خاموشی سے کرتی رہی۔ یہاں اسلامی علوم و عقائد کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس مجلس کے بانی انوار اللہ صاحب فضیلت جنگ تھے جو عثمان علی خاں کے استاد اور مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد کے سرپرست تھے۔

انجمنِ اسلامیہ : ۱۹۱۸ء میں قائم ہوئی جہاں اراکینِ مجلس نے اردو تحریر و تقریر کے ذریعے اردو زبان کی ترقی میں نمایاں کام انجام دیے۔ ادبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی عنوانات پر مباحثے ہوتے۔ علمی جلسے منعقد ہوتے۔ اردو

شاعری، تعلیم نسواں اور موجودہ تعلیم جیسے عنوانات پر تقاریر ہوتیں۔
انجمنِ ترقی اُردو کو عثمان علی خاں کی خاص سرپرستی حاصل تھی۔
یہ انجمن ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی جس کے معتمد شبلی نعمانی تھے۔ ان کے انتقال
پر حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے معتمدی کے فرائض سنبھالے اور پھر عزیز مرزا
اور مولوی عبدالحق یکے بعد دیگرے اس کے معتمد بنائے گئے۔ اردو کی ترقی سے
اس انجمن کو راست تعلق تھا۔ انجمن ترقی اُردو کی مرتّبہ اُردو کتابیں ریاست کے
سبھی مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ایک مکمل اور مبسوط لغت کی تیاری کے لیے
عثمان علی خاں نے اس انجمن کو ۱۲ ہزار روپے سالانہ کی منظوری دی تھی۔ اس
انجمن کے ذریعے مختلف مغربی کتابوں کے ترجمے کروائے گئے۔ اُردو کی قدیم اور
نادر کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ اساتذۂ شعر و سخن کے کلام کے انتخابات
مرتّب کیے گئے۔ قلمی نسخوں کی خریدی اور ان کی حفاظت بھی کی گئی۔ انجمن کی
صدارت نواب عماد الملک کے قابل ہاتھوں میں سونپی گئی تھی جنھوں نے انجمن
کی خاطر خواہ امداد کی۔ ان کے انتقال پر نواب مسعود جنگ بہادر اس کے
صدر منتخب ہوئے۔

عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقی کے اہم اسباب

زور کی زبانی

۱. زبانِ اُردو سے نظام سابع کی دلچسپی، مذاقِ شعر و سخن، علم پروری و سرپرستی
۲. اُردو شاعر و انشاپردازوں کی قدر دانی و سرفرازی
۳. انجمنوں اور اداروں کی قدر افزائی اور امداد
۴. جامعہ عثمانیہ و دارالترجمہ کا قیام
۵. اُردو رسائل و اخبارات کی امداد
۶. دکن کی مسلسل اردو خدمات و حمایت
۷. نظام کی سرپرستی کے خاص اثرات اور اس کے خوش گوار نتائج
۸. اُردو زبان کی اصلاح کی پوری پوری کوششیں
۹. حیدرآباد میں اُردو کی عام مقبولیت اور عمومیت
۱۰. شاہی صرفِ خاص، جاگیرات اور تمام دفاتر میں اُردو کی عام ترویج[۱]

۱. زور، سید محی الدین قادری، عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقی ص ۱۸۵

عہدِ آصفی میں اردو صحافت

سرزمینِ دکن ہیرے جواہرات ہی کے لیے مشہور نہیں۔ اس میں شعر و ادب کے خزانے بھی ملتے ہیں ۔ رواداری، وضع داری، خلوص و محبت اور پاسداری کے نگینے بھی ان قلوب میں جگمگاتے ملے ہیں جو محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آصف جاہِ سابع میر عثمان علی خاں کے دورِ حکومت میں سانس لیتے آئے ہیں۔ دکن ہی وہ سرزمین ہے جو اُردو ادب کی پیدائش اور ترقی کے لیے سازگار ثابت ہوئی ۔ اُردو میں تصنیف و تالیف کا کام سب سے پہلے اسی خطۂ دکن میں ہوا ۔ صوفیائے کرام کے بابرکت قلم نے اُردو زبان کی ابتدا اسی دکن سے کی ہے۔ بہمنی سلطنت کے زوال پر بیجاپور اور گولکنڈے نے اُردو کے ارتقا میں شاندار حصہ لیا۔ دکھنی اردو کی سرپرستی فیاضی کے ساتھ کی گئی ۔ اکثر بادشاہ خود شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے اور کلام و نثر کے جادو جگاتے ۔ حکومتوں کی سرپرستی اور علم دوست بادشاہوں کی نوازشوں نے ادب میں گل دیوٹے کھلائے ۔ ادبی ماحول و فضا ہر خاص و عام کے قلب و نظر کو گرماتی گئی ۔

پہلے تاجدارِ دکن محمد قلی قطب شاہ کا نام اُردو زبان کے فروغ اور ادب و شعر کی سرپرستی کے ضمن میں ہمیشہ سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا ۔ شہرِ حیدرآباد اور اُردو زبان گویا ایک جان دو قالب کے مصداق تھے اور مدتوں اس

شہر حیدرآباد کو 'اردو شہر' کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ اس دکن دیس میں رہنے بسنے والوں کی سوچ و فکر، ذوق و مذاق، نشست و برخواست ہر چیز پہ اردو کی چھاپ تھی۔ چناں چہ اردو شعر و ادب کے سانچوں میں ڈھل کر سنورتی اور نکھرتی ہی گئی۔ قطب شاہی سلطنت کی نوازشوں نے دکن میں دکنی ادب کے ذخیرے جمع کردیے۔

محمد قلی کو فنِ تعمیر، شعر و ادب، خوش نویسی کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ سے بھی شوق تھا۔ شعر و ادب کا یہ مربّی خود اعلیٰ پائے کا شاعر تھا۔ ملا وجہی، غواصی ابن نشاطی، ملا قطبی اور تحسین الدین جیسے بلند مرتبت شاعر بادشاہ کے دربار کے جگمگاتے ہیروں میں شامل تھے۔ اردو کے اس دیوانے عاشق نے اردو سے اپنی غیر معمولی محبت کا ثبوت اپنی کلیات کی شکل میں دیا، اس تہذیب و تمدن کے ذریعہ دیا جو آج بھی حیدرآباد کی گھٹی میں موجود ہے۔

محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کے دورِ سلطنت کے دوران تین صدیاں گزر گئیں جن میں اردو زبان ترقی کی منزلوں کو چھوتی گئی۔ اردو کی تخلیق و ارتقا میں چوں کہ شاہانِ وقت کی دل چسپی اور سعی شامل تھی، حیدرآباد فرخندہ بنیاد علم و فضل اور شعر و سخن کا گہوارہ بن گیا۔ دکن کے در و دیوار اردو کے نغمے الاپتے نظر آتے اور چوکھٹیں اردو کو خوش آمدید کہتیں یہاں تک کہ آب و دانہ بھی اردو کا رہینِ منت بن گیا تھا۔ چناں چہ اردو کا مستقبل ان پُر شکوہ سلطنتوں کے ساتھ منسلک ہو چکا تھا۔

ان ہی سازگار حالات میں اردو صحافت کا ستارہ بھی چمکا اور خوب چمکا۔

چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد دورِ آصفی میں جو رسائل نکلے ان میں شمس الامرا کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے شعرا اور مصنفین کی ہمت افزائی کی۔ علم ادب کے فروغ کے لیے دن اور رات یک جا کر دیے۔ ۱۸۲۶ء سے انگریزی سائنسی کتابوں کے اردو میں ترجمے ہوئے۔ مولوی سید علی بلگرامی جیسے عالم و فاضل زبان دان کی نگرانی میں ایک سررشتہ 'علوم و فنون' کے نام سے قائم ہوا اور شائع شدہ کتابوں کو "سلسلۂ آصفیہ" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ کئی کتابیں انگریزی، فرانسیسی اور عربی زبان کی اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد مولوی شبلی نعمانی نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ اس وقت سے ہی کتابوں کی اشاعت نے حیدرآباد میں رسائل کے اجرا کے لیے ماحول پیدا کر دیا۔ پھر ۱۸۵۹ء سے باقاعدہ رسالے شروع ہوگئے۔

جہاں تک حیدرآباد میں اردو صحافت کا تعلق ہے اس کی ابتدا ۱۸۵۹ء میں "رسالۂ طبابت" کی اشاعت سے ہوگئی تھی۔ اس میں طب سے متعلق مضامین اور امراض کے بارے میں اطلاعات اور معلومات بہم پہنچائی جاتیں۔ اس رسالے کے نگران مسٹر جارج اسمتھ تھے۔ اس طبی رسالے کے بعد ۱۸۶۶ء میں "مراۃ القوانین" جاری ہوا۔ مہدی علی صاحب نے اس میں قانونی نکات اور نظریے پیش کیے اور قانون سے متعلق مضامین بھی شامل ہوتے تھے۔ ۱۸۷۴ء میں ایک ماہ نامہ "مخزن الفوائد" کے نام سے سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک نے جاری کیا جو علمی، ادبی اور معلوماتی مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس ماہ نامے کا ایک اہم اور منفرد مقام تھا اور اس کے سبب صحافت میں ایک نیا موڑ آیا۔

ان رسالوں کی اشاعت کے بعد اخبار بینی کا شوق بڑھتا گیا۔ اخبار دراصل اعلیٰ اقدار اور اصول کے صحیفے ہوتے ہیں جو کسی دور کی تہذیب، سماجی اور ادبی

زندگی کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مختلف خبروں کی نشر و اشاعت کے علاوہ ملک و قوم کو درپیش مسائل کے لیے اخبار عوام میں رائے عامہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ عوام کے لیے معلومات آفرین مواد پیش کرتے ہیں۔ مصائب میں ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دیتے ہیں اور علم و دانش کے فانوس جلاتے ہیں۔ یہ شعر و ادب کی محفلیں سجاتے ہیں اور تہذیب و تمدن کے موتی لٹاتے ہیں۔ عہد آصفی کے اخبار و رسائل اور جریدے صرف خبرنامے ہی نہیں۔ بلکہ قومی تحریکوں اور تنظیموں کی روداد بھی ہوتے تھے۔ جہاں زندگی کی عکاسی ہوتی تھی۔ ماہ وار رسالے مضامین تنقید و تبصرے نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہوتے اور ہر مذاق کی تسکین کرتے یہ اخبار اور رسائل کچھ روزنامے ہوتے' کچھ ہفتہ وار' کچھ پندرہ روزہ اور کچھ ماہ نامے ـــ حیدرآباد کی صحافت کا مطالعہ کریں تو تین دور نمایاں نظر آتے ہیں:

۱. جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے کا دور
۲۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد کا دور
۳۔ سلطنتِ آصفیہ کے سیاسی انتشار اور زوال کا زمانہ ۱۹۴۸ء

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے کا دور

یہ وہ دور ہے جب اردو اخبار و رسائل کی ابتدا ہوئی تھی۔ اخبار بینی اور مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ ادبی اصلاحی اور تعمیری مضامین تحریر کیے جانے لگے۔ شعر و ادب سے عوام کی دلچسپی بڑھی۔ ادب صحافت میں داخل ہوا تو اخبار و رسائل کو مقبولیت حاصل ہوئی

انیسویں صدی کے آخری پچیس تیس سال میں حیدرآبادی صحافت ملتی ہے " آفتاب دکن"

حیدرآباد سے جاری ہونے والے اخبار یا روزنامہ تھا جو قاضی محمد قطب نے ۱۸۶۰ء میں جاری کیا۔

سید انوار الحق حقی کا بیان ہے کہ سب سے پہلا اخبار ۱۸۷۷ء میں "خورشیدِ دکن" تھا لیکن پہلے روزنامے کی حیثیت "ہزار داستان" کو حاصل ہے جو ۱۸۸۳ء میں سلطان محمد عاقل دہلوی کی ادارت میں جاری ہوا۔

قاسم علی سجن لال کی تحقیق کے مطابق "آفتابِ دکن" اردو کا پہلا روزنامہ قرار پاتا ہے۔ آفتابِ دکن، خورشیدِ دکن اور ہزار داستان کے بعد اخباروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ۱۸۶۹ء میں "حیدرآباد اسٹیٹ گزٹ" کے نام سے زین العابدین شیرازی ماہ وار شروع کیا (جو ۱۹۴۸ء تک جاری رہا

۱۸۷۸ء میں اخبار "شفق" فارسی میں ہفتہ وار شائع ہوتا رہا۔ ۱۸۸۲ء

میں میر کاظم علی نوازی کے زیرِ اہتمام "ادیب" جاری ہوا۔ لیکن پھر بند ہو گیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں خورشید علی نے دوبارہ اسے جاری کیا۔ اس رسالے سے رباعی گو شاعر احمد حسین امجد بھی وابستہ ہو گئے تھے۔ کاظم علی صاحب مشہور صحافی تھے۔ "ادیب" سے پہلے انھوں نے ۱۸۷۷ء میں "خورشیدِ دکن" روزنامہ جاری کیا تھا۔

ابتدائی زمانے کے اخباروں میں پیکِ آصفی، سفیرِ دکن، افسر الاخبار اخبارِ آصفی اہم اخبار مانے جاتے ہیں۔ "پیکِ آصفی" ۱۸۸۳ء میں حسن بلگرامی نے نکالا تھا۔ "سفیرِ دکن" ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا۔ "اخبارِ آصفی" محمد سلطان عاقل کی نگرانی میں شائع ہوا۔ اور "افسر الاخبار" کرنل افسر الملک نے جاری کیا۔

۱۸۸۷ء میں بی کشن راؤ نے "دکن پنچ" ہفتہ وار جاری کیا۔ ۱۸۸۸ء میں "حسن" اور "شوکت الاسلام" جاری ہوئے۔ "شوکت الاسلام" رسالہ "حسن" حیدرآباد کا مشہور اور نامور رسالہ تھا؛ اس کا شمار معیاری رسالوں میں ہوتا تھا۔ یہ علمی ادبی ماہ وار رسالہ نواب عماد نواز جنگ کی ادارت میں نکلتا تھا۔ شمالی ہند کے ادیبوں اور شاعروں کا بھی تعاون حاصل تھا۔ علم الانسان، تاریخ، مذہب، اور سائنس اور سیاست سے متعلق فکر انگیز مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کی خوبی یہ تھی کہ اس کے معیار کا کوئی رسالہ شمالی ہند میں بھی سوائے "تہذیب الاخلاق" کے موجود نہ تھا۔ یہ ادبی رسالہ ۱۸۹۰ء کے بعد بند ہوگیا۔ "مشیر دکن" ۱۸۹۲ء میں بی کشن راؤ نے روزنامہ جاری کیا۔

"مشیر دکن" ہندو مسلم اتحاد کا علم بردار تھا اس اخبار کی اشاعت سے اردو صحافت ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اور اخبار ضروریات زندگی کا جزو بن گئے۔ اپنی صلح کل پالیسی کی بدولت مشیر دکن صحافتی، ادبی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی زندگی کا عکاس تھا۔ کشن راؤ نے ابتدا میں "دکن پنچ" (۱۸۸۷ء) ہفتہ وار جاری کیا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں کچھ عرصے کے لیے بند ہوگیا جب کہ کشن راؤ شہر بدر کر دیے گئے۔ دوبارہ ۱۸۹۹ء سے چھپنا شروع ہوا۔ پھر واسدیو راؤ نے اسے جاری رکھا۔ ان کے بعد وسنت راؤ اس اخبار کو چلانے لگے۔ اس اخبار کی زبان عام فہم اور سہل ہونے کی بنا پر مقبول عام تھا۔ اس کے روح رواں سردار علی تھے جنھوں نے "تجلّی" کے نام سے ایک ماہ نامہ بھی نکالا تھا۔ "مشیر دکن" سے بھجنگ راؤ

اور میر حسن بھی وابستہ تھے۔

۱۸۹۲ء میں مولوی فدا حسین نے "آئینِ دکن" جاری کیا۔ یہ قانونی ماہ نامہ تھا جو پہلے اورنگ آباد اور پھر حیدرآباد سے شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں اپنے وطن قائم گنج منتقل ہونے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور ماہ نامہ بھی بند ہو گیا۔

پھر یکے بعد دیگرے "محبوب القلوب" "ملک و ملت" جن کے مالک قاضی رفیع الدین اور ایڈیٹر سعید احمد ناطق لکھنوی تھے۔ یہ ملک و ملت کی ادبی اور دینی خدمات انجام دے رہے۔ اور سرکاری امداد سے چلتے رہے۔

"جامِ جمشید" ابراہیم خاں کے زیرِ ادارت سیاسی ہفتہ وار جاری ہوا! لیکن دس برس بعد یہ بند ہو گیا۔ پھر ۱۸۹۴ء میں "سحر البیان" مولوی مجیب احمد تمنائی کے زیرِ ادارت ہر مہینے کے آخر میں شائع ہوتا تھا۔ اس میں سوانحی خاکے، ڈرامے، اور مختلف موضوعات پر مضامین ہوتے تھے۔ یہ رسالہ بہت جلد بند ہو گیا۔ پھر ماہ نامہ "منتخبِ روزگار" ۱۸۹۵ء میں عاشق علی بیگ کے زیرِ اہتمام جاری ہوا۔ یہ ایک ادبی اور معیاری رسالہ تھا جو ۳ حصوں میں منقسم ہوتا تھا۔ ادبی علمی اور تعلیمی

پھر "پیامِ محبوب" اور "شمس الکلام" جاری ہوئے جن کے مدیر مولوی غلام حسین داد اور مولوی سلیمان مہدی خان تھے۔ "پیامِ محبوب" متفرق موضوعات پر مضامین ناول اور غزلیات پر مشتمل تھا اور "شمس الکلام" صرف غزلیات پر۔

۱۸۹۵ء میں مہاراجہ کشن پرشاد کی سرپرستی میں ادبی رسالہ "دبدبۂ آصفی" شروع ہوا۔

۱۸۹۶ء ہی میں مولوی عبدالحلیم شرر نے حیدرآباد آکر "دلگداز" رسالہ جاری کیا اور اپنے تین اصولوں پر مبنی یا لی ٹکس، سوسائٹی اور لٹریچر کا تجربہ کیا۔ معنوی اعتبار سے بھی شرر نے اسے "دلگداز" بنا دیا تھا۔ سرسید احمد، شبلی، حالی اور نذیر احمد کی رہنمائی میں اردو ادب میں انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ ان تبدیلیوں کو شرر نے "دلگداز" میں پیش کیا۔

افسر" ۱۸۹۷ء میں افسرالملک (افسر جنگ) کی سرپرستی میں پہلے فوجی پرچے کی صورت میں شائع ہوا۔ بعد میں محب حسین نے اس کی ادارت سنبھالی اور پھر مولوی عبدالحق نے تو اس میں ادبی مضامین نے جگہ لے لی۔ ماہ نامہ "افسر" انیسویں صدی کے حیدرآباد رسائل میں خاص اہمیت رکھتا تھا چار سال بعد یہ ماہ نامہ بند ہوگیا۔ "نظارۂ عالم" منشی قدرت اللہ نے ۱۸۹۷ء میں جاری کیا۔

کشن پرشاد نے ۱۸۹۸ء میں دوسرا ادبی رسالہ محبوب الکلام" جاری کیا۔ ہیرا لال اس رسالے سے بھی منسلک رہے۔ "محبوب الکلام" کو چندا پرشاد کا تعاون حاصل رہا۔ امیر مینائی کے ساتھ جب فصاحت جنگ جلیل حیدرآباد آئے تو کشن پرشاد نے دونوں رسالوں کی ترتیب کا کام انھیں سونپا۔ جلیل کے بعد رتن ناتھ سرشار اس ماہ نامہ سے وابستہ ہوگئے۔ (۱۹۱۶ء سے دبدبۂ آصفی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں "اودھ پنچ" کی بذلہ سنجی اور ظرافت بھی داخل ہوگئی تھی۔) ان رسالوں میں علاوہ کشن پرشاد اور جلیل کے شاہ عثمان کا کلام بھی چھپتا تھا۔

۱۹۰۰ء میں عزیز جنگ ولا نے "عزیز الاخبار" کے نام سے ہفتہ وار جاری کیا جدت پسندی اور دوسری نمایاں خصوصیات کی وجہ سے مقبول ہوا۔ اس میں زراعت

کے متعلق معلوماتی مضامین شائع ہوتے رہے زراعت کے سلسلے میں اپنی صحافت ذریعہ عزیز جنگ ولاؔ نے ترقی کے امکانات واضح کیے۔ اردو صحافت میں "عزیز الاخبار" کے ساتھ ان کا پندرہ روزہ "تکمیل الاحکام" نمایاں مقام رکھتا

۱۹۰۲ء میں صادق حسین کی ادارت میں روزنامہ "علم و عمل" جاری ہوا محب حسین کے باعث "علم و عمل" عوام میں مقبول ہوا۔ محب حسین کی کوششوں کے سبب حیدر آبادی صحافت نے نیا موڑ لیا۔ ۱۹۰۰ء تک حیدر آباد صحافت اور عوام سیاسی لیل و نہار سے ناواقف تھے۔ محب حسین نے علم کی اہمیت کو تسلیم کرواکر عمل کی ترغیب دی۔ اب تک یونیورسٹی کا قیام افسانہ تھا۔ پرانی قدریں حیدر آبادی تہذیب کا نچوڑ تھیں۔ ایک عالم بے خبری تھا جس میں یہ رسالہ جاری ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں جب محب حسین اس سے وابستہ ہوگئے تو اس رسالے سے زبان و بیان اور جاگیر دارانہ معاشرت میں انقلاب رونما ہوا۔ معاشرہ کی اصلاح کی خاطر محب حسین نے جاگیردارانہ ذہنیت اور اندازِ فکر پر اپنی تحریروں سے ضرب لگائی۔ توہم پرستی اور ذہنی جمود کے خلاف قلم اٹھایا اور فکر و دانش کے دروازے کھول دیے۔ سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ اور ایک "ذمہ دارانہ حکومت" کا مطالبہ شروع ہوا۔ محب حسین نے اصلاحی مقاصد کے ساتھ سیاسی شعور کو اجاگر کر دیا۔ حیدر آباد میں انڈین کانگریس کے قیام کا ماحول بنایا۔ اور پھر "پیام" "رعیت" اور "امروز" جیسے انقلابی اور قومی اخبارات کی اشاعت کو ممکن کر دیا۔ اپنی حب الوطنی، آزادی سے محبت اور عوامی اور قومی تحریک سے وابستگی کا اظہار انھوں نے "علم و عمل" کے ذریعے حیدر آبادی عوام پر آشکار کیا۔ جد و جہد آزادی کی تاریخ میں محب حسین کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔

"جلوۂ محبوب" مولوی غلام صمدانی گوہر نے جاری کیا۔ غزلوں، ناولوں لطیفوں اور عام مضامین پر مشتمل دل چسپ رسالہ تھا۔

"نسیم دکن" مولوی نادر علی برتر نے ناول، مضامین اور غزلیات پر مشتمل رسالے کو راجہ لچھمن راؤ راجہ رائے رایاں بہادر امانت ونت کی سرپرستی میں شائع کروایا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں رسالہ "افسانہ" نکالا گیا۔

۱۹۰۴ء میں ظفر علی خاں نے "دکن ریویو" جاری کیا۔ یہ رسالہ (ماہ نامہ) ترجموں کے لیے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اچھے ناول اور کتابوں کے ترجمے نایاب لیکن اس رسالے میں ترجمہ شدہ ناولوں اور کتابوں کو شائع کیا جاتا تھا۔ چار سال بعد یہ بند ہو گیا لیکن پھر ۱۹۰۶ء میں بمبئی سے شائع ہونے لگا۔ ۱۹۰۷ء میں پھر دکن سے جاری ہونے لگا۔ اعلیٰ درجے کے انگریزی ناولوں کے تراجم کا یہ ماہ وار رسالہ ۱۹۰۹ء میں سید مودود احمد قادری کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا۔) ۱۹۰۴ء میں دکن ریویو کے ساتھ رسالہ "افسانہ" کو انھوں نے ضم کر دیا تھا جو ۱۹۰۳ء میں نکلتا تھا۔ دکن کے ادبی رسائل کی تاریخ میں "دکن ریویو" اہم ترین رسالہ تھا۔

۱۹۰۵ء میں رضی الدین کیفی نے "صحیفہ" جاری کیا اور صحافت کو بلندیوں سے ہم کنار کر دیا۔ تاریخی اور ادبی مضامین پر مشتمل تھا۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن معارف کی طرف سے دوبارہ اکبر علی کی ادارت میں جاری ہوا۔

"صحیفہ" کی پیشانی پر تحریر ہوا کرتا تھا "سب سے پہلا خادم ملک و ملت "صحیفہ" اکبر علی کے مزاج کا آئینہ دار تھا جو اصول پسند لیکن قدامت پرست آدمی تھے۔ آصفیہ تاج کے وفادار تھے اور مسلمانوں کے عالمی مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے۔

دکن کے دل دادہ اور دکنی مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اکبر علی بلقان اور طرابلس کی جنگ کے زمانے میں تحریکِ ہلالِ احمر کے روحِ رواں تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں صحیفہ روزنامہ کی شکل دی اور چندہ جمع کر کے مجاہدین کو روانہ کرتے رہے۔ بلقان کی جنگ کے خاتمے پر حیدرآباد "ایجوکیشنل کانفرنس" اور "انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" کی بنیاد رکھی۔ کانفرنس دراصل محمد مرتضیٰ کی کوششوں کا نتیجہ تھی جس میں اکبر علی نے بھی مدد کی۔

"صحیفہ" ذمہ دار اور منفرد روزنامہ تھا جس میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو خبریں اور حالات شائع ہوتے تھے۔ "صحیفہ" کا ماحول علمی و ادبی ہوتا تھا۔ آصفِ سابع کی تازہ غزلیں چھپتی تھیں جس پر استاد حضرت جلیلؔ کی رائے "سبحان اللہ لاجواب غزل ہے" درج رہتی تھی۔ آصف سابع کے دورۂ دہلی کے وقت اکبر علی بھی ہمراہ تھے اور تازہ واقعات صحیفہ کے لیے روانہ کرتے تھے۔ "سفر شاہانہ" میں لکھتے ہیں کہ جب حضورِ نظام رام پور، دہلی، اجمیر اور لکھنؤ کے دورے پر نکلے تو شمالی ہند کے سیاسی حالات خراب تھے۔ لہٰذا پی۔ ٹی۔ آئی پر بھروسہ نہیں تھا کہ وہ صحیح خبریں روانہ کریں گے۔ اکبر علی ایک راست گو صحافی تھے۔ ان کی صاف گوئی اُردو صحافت کو لمحۂ فکر دیتی تھی۔

اس دور کے دوسرے اہم رسالوں میں معیار الانشاء، ادیب الاخلاق (۱۹۱۱ء) تاج (۱۹۱۴ء) المعلم (۱۹۱۴ء) رسالہ افادہ (۱۹۱۶ء) رسالہ ذخیرہ (۱۹۱۵ء) ثمرۃ الادب (۱۹۱۸ء) شامل ہیں۔

۲۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد کا دور

اگست ۱۹۱۹ء کی صبح جامعہ عثمانیہ کا سورج طلوع ہوا۔ علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ انجمن اتحاد طلبا کی بنا پڑی۔ حیدرآبادی صحافت میں جامعہ عثمانیہ کے نوجوان طالب علموں نے قابلِ فخر حصہ لیا۔ جب یہ نوجوان صحافت، ادب و سیاست میں داخل ہوئے تو علم کے چراغوں میں نئے تجربے، نئے نظریے اور جدید سوچ کا روغن شامل ہوا۔ یہ دور حیدرآبادی صحافت کا شاندار دور کہلایا جاسکتا ہے۔ متعدد کامیاب اخبار و رسائل شائع ہونے لگے۔ ہر نوجوان اپنے مسلک کا اظہار صحافت کے ذریعہ کرتا۔ اس طرح مختلف فکر و خیال کی نمائندگی ہوتی رہی۔

۱۹۱۹ء میں مسز صغرا ہمایوں مرزا نے خواتین کے لیے "النساء" جاری کیا تاکہ حیدرآباد کے نئے ماحول میں زندگی پیدا ہو۔ نوجوان لڑکیوں میں لکھنے کی صلاحیت اور ادب کی طرف راغب کرنے کے لیے انھوں نے خواتین کے رشحاتِ قلم کو اس میں شائع کیے۔ "انجمنِ خواتینِ دکن" کے قائم ہونے پر یہ رسالہ اس انجمن کا آرگن بن گیا جس کے ذریعے انجمن کی خبریں پہنچائی جاتی تھیں۔ حیدرآباد کے ادبی رسائل میں خواتین کے لیے سب سے پہلے "معلم نسواں" محب حسین نے شروع کیا تھا۔ "النساء" میں عورتوں کی تعلیم، پردہ، سلیقہ، صبر و استقلال وغیرہ پر اخلاقی اور مذہبی مضامین لکھے جاتے۔ اس میں لکھنے والی خواتین جامعہ عثمانیہ کی نوجوان لڑکیاں ہوتی تھیں۔

۱۹۲۰ء میں غوث الدین صاحب نے بچوں کے لیے "نونہال" جاری کیا تاکہ بچوں میں زبان و ادب کا شوق پیدا ہو۔ بچوں اور بڑوں دونوں میں مقبول رہا۔

اخبار "رہبرِ دکن" ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ حکومت اسے وقعت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ خبریں مصدقہ ہوتیں اور حکومت کے نظم و نسق اور کوتاہیوں کو واضح کرتے ہوئے اصلاحی تجاویز پیش کیے جاتے تھے۔ آصف سابع بھی اسے ملاحظہ کرتے اور عام حالات سے واقف ہوتے اور شکایات کا ازالہ کرتے۔ "رہبرِ دکن" نوخیز ادیب و شعراء کے نگارشات کو شائع کرتا تھا۔ مضامین دلچسپ ہوتے۔ خلافِ مذہب اور مخرب الاخلاق تحریکات کی مخالفت کرتا۔ عوام میں اخبار بینی کا شوق پیدا کرتا۔ ایک جاذبِ نظر اخبار تھا۔ رہبر سلطان کا کلام بھی چھپتا تھا بیرونی تجارتی فرمس کے اشتہارات دکن کا منفرد اخبار تھا۔ اردو کے ارتقا میں "رہبرِ دکن" ہمیشہ روزنامہ رہبرِ دکن احمد محی الدین کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ سیاسی تبدیلیوں کے باعث ۱۹۴۸ء میں بند ہوگیا۔

۱۹۲۳ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ اور مرزا رفیق بیگ نے نکالا جس میں صنعت و حرفت پر مضامین کے علاوہ ادب کا کافی سات برس تک یہ رسالہ صنعت اور علم کی خدمت کرنے کے بعد بند ہوگیا۔

۱۹۲۳ء میں سید محمد ضامن کنتوری نے رسالہ "لسان الملک"

۱۹۲۳ء ہی میں رسالہ "ترقی" محمد انوار اللہ کی ادارت میں نکلا جس میں تحقیقی اور معیاری مضامین نکلتے تھے۔ علمی حلقوں میں یہ

۱۹۲۳ء میں انجمن اربابِ اردو کی طرف سے رسالہ "تحفہ"

شائع ہونے لگا۔ اس انجمن کی بنا چند نوجوانوں نے ڈالی تھی جہاں ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ اس انجمن کو تجربہ کار اور باشعور ادیبوں اور شاعروں کا بھی تعاون حاصل تھا۔ یہ خالص ادبی اور علمی رسالہ تاریخ جامعہ عثمانیہ کے لیے تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا۔ عالی رفاعی نے عوام کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام پہ فخر کا احساس بھی ملتا ہے اور زبانِ اُردو سے والہانہ عشق کا پتہ بھی چلتا ہے نظام سابع سے وفاداری اور حیدرآباد کی برتری کے قصیدے بھی ملتے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر زورؔ مولوی عبدالستار نائب صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ بھی اس کے لکھنے والوں میں شامل تھے۔ "تحفہ" میں طلبہ اور اساتذہ دونوں کی نمائندگی ہوتی تھی اور ان کا اشتراک ملتا تھا۔ ادبی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ انشائیے اور معلوماتی مضامین بھی ہوتے تھے۔ ادب، زبان کا شستہ معیار تھا۔

۱۹۲۶ء میں مجلّہ عثمانیہ جامعہ عثمانیہ کے نوجوان طالب علموں کا ترجمان ہوا۔ ڈاکٹر زورؔ اور معین الدین قریشی شعبۂ اُردو کی ادارت کے لیے منتخب کیے گئے۔ ۱۹۴۷ء تک یہ سہ ماہی رسالہ تھا۔ پھر سالنامہ کی شکل دی گئی ہر سال شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ سے شائع ہوتا تھا۔ جامعاتی رسالوں میں مجلّہ عثمانیہ کو صفِ اوّل کا مقام حاصل تھا۔ وحیدالدین سلیم اس کے نگران تھے۔ اردو ادب و شاعری میں یہ اپنا بلند مقام بنا چکا تھا۔ جب جامعہ عثمانیہ سے اُردو کی بنیادی اہمیت ۱۹۴۸ء کے بعد گھٹ گئی تو مجلّے کی اہمیت بھی کم ہوگئی۔

۱۹۲۷ء میں پیرزادہ شاہ یوسف الدین قادری نے "ارشاد" جاری کیا جو

اصلاحی اور ادبی جریدہ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد پیرزادہ جاوید قادری اس کے ایڈیٹر ہوئے اور مذہبی پہلو کو جاری رکھتے ہوئے سائنٹیفک اور عقلی موڑ دے رائج رکھا۔ قومی، سیاسی، تاریخی اور ادبی عنوانات پر مضامین شائع ہوتے۔

۱۹۲۷ء ہی میں محمد سردار علی نے "تجلی" جاری کیا جو دکن کا معیاری ماہ نامہ تھا۔

۱۹۲۷ء میں "نظام گزٹ" متانت، سنجیدگی اور رواداری کے ساتھ آصف سابع کے خیالات کی ترجمانی کرتا رہا۔ ان کی تحریرات شائع کرتا رہا۔ مخصوص انداز فکر اور تحریر آصف سابع کی نجی اور اندرونی حالات کا آئینہ دار ہوتے تھے۔ کلام بھی شائع ہوتا رہا۔

"نظام گزٹ" کے بانی حبیب اللہ رشدی تھے جنھوں نے وقار احمد کے تعاون سے پہلے ہفتہ وار پھر روزنامہ کی صورت میں جاری کیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہوتے ہی حبیب اللہ رشدی نے متین، سنجیدہ اور ترقی پسندانہ رویے سے صحافت کا سفر شروع کیا۔ محتاط اور میانہ روی نظام گزٹ کی پالیسی تھی۔ ۱۹۴۸ء کے بعد جب رشدی پاکستان چلے گئے تو وقار احمد نے نظام گزٹ کی ادارت سنبھالی۔ وقار احمد جامعہ عثمانیہ کے دور اول کے طالب علموں میں سے تھے۔ سلجھے ہوئے مذاق کے ساتھ انھوں نے صحافت میں قدم رکھا اور عوام اور سرکار دونوں میں مقبولیت حاصل کی۔ صلح کل مشرب کی وجہ سے صحافیوں میں عزت و احترام حاصل تھا۔ انجمن صحافت کے صدر رہے اور متعدد حیدرآباد میں صحافتی نمائندے کی حیثیت سے رکن نامزد ہوئے۔ پولیس ایکشن کے بعد صحافتی مشاورتی بورڈ کے رکن رہے۔ بابائے صحافت مولوی وقار احمد کے انتقال کے بعد ۱۹۵۹ء کے بعد بھی عبدالرحمٰن حلمی کی نگرانی میں یہ اخبار جاری رہا۔

یم. نرسنگ راؤ نے ۱۹۲۷ء میں "رعیت" جاری کیا تھا جو ہفتہ وار تھا اور بشیر احمد طاہر اس اخبار سے وابستہ تھے۔ "رعیت" کے قلمی معاونین میں فضل الرحمٰن حسن الدین اور رحیم الدین کمال بھی تھے۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں "رعیت" کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں یہ روزنامے میں تبدیل ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں بند ہوگیا۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک "رعیت" کا دور بھی حیدرآباد کی سیاست کی طرح غیر یقینی رہا۔ دکن میں قومی تحریک کو بڑھانے "ذی شعور" افراد کو متحد کرنے اور جذبہ آزادی کو فروزاں کرنے کے لیے انھوں نے صحافت کا سہارا لیا تھا۔ "رعیت" نے اسٹیٹ کانگریس کی تشہیر کی اور کانگریسی خیالات اور افکار عوام تک پہنچائے۔ چنانچہ رعیت کا رجحان سیاسی تھا۔ زبان و بیان کی وجہ سے مقبول نہ ہوسکا۔ "رعیت" نے ریاستی سچائی اور اخلاص اور وسیع النظری کی روایت ڈالی۔ آخر آخر میں شعیب اللہ خاں نرسنگ راؤ کے شریک کار رہ گئے تھے۔ "رعیت" کے بند ہونے پر شعیب اللہ خاں نے "امروز" جاری کیا شعیب اللہ خاں جامعہ عثمانیہ کے سپوت تھے۔ جنھوں نے بعد میں صحافت کو اپنایا۔ ایک ہفتہ وار "تاج" جاری کیا اور اس کے ذریعے اتحاد المسلمین کی سرگرمیوں پر تنقید کی۔ "تاج" اخبار جب ممنوع قرار پایا تو شعیب اللہ خاں نے "رعیت" کا ساتھ دیا۔ جب اس پر بھی پابندی عاید ہوگئی تو بی. رام کشن راؤ اور نرسنگ راؤ کی ایما پر "امروز" جاری کیا۔ ان کے قتل نے صحافت میں ہلچل مچادی۔ "امروز" کو کانگریس پارٹی کی سرپرستی حاصل تھی شعیب اللہ خاں کی یاد میں انیس الرحمٰن نے ۱۹۴۸ء کے ہنگامی دور میں "شعیب" کے نام سے اخبار جاری کیا تھا۔

حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کمیٹی اور مجلس اتحاد المسلمین (بہادر یار جنگ کی قیادت میں) کے قیام تک اخبارات کا نقطۂ نظر اصلاحی اور تعمیری تھا۔ سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو صحافت بھی متاثر ہوئی۔ اردو اخبار گروہوں میں بٹ گئے۔ محب حسین نے صحیفہ کے ذریعے جو قومی، اصلاحی اور سیاسی خیالات کو پھیلانے اور عام کرنے کی کوشش کی تھی اسے اسٹیٹ کانگریس کے طرف داروں نے "رعیت" "پیام" اور "امروز" جیسے اخباروں کے ذریعے ایک منظم تحریک میں ڈھال لیا۔ بہادر یار جنگ کے بعد قاسم رضوی نے جب رضاکار تحریک چلائی، جس کے نتیجے میں پولیس ایکشن ہوا، تو آریہ سماج اور آریہ پرتی ندھی سبھا نے سیاسی الجھنیں پیدا کرنی شروع کیں۔ آخرکار وہ خطرناک موڑ آیا جب پولیس ایکشن ہوا۔ ہندوستانی افواج نے سلطنت آصفیہ پر چڑھائی کر دی اور حیدرآباد انڈین یونین میں ضم کر لیا گیا۔ "رہبرِ دکن" "پیام" اور "رعیت" نے صحافت میں سیاست کو موثر طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ قوم پرستی کے جذبات بھڑکے تو ان اخباروں پر عتاب نازل ہوا۔ "رعیت" بند ہوا تو ایم نرسنگ راؤ اور بی رام کشن راؤ کی ایما پر شعیب اللہ نے "امروز" جاری کیا تھا لیکن ان کے قتل پر صحافت میں ہلچل مچ گئی۔ ہر طرف بے چینی، مایوسی اور انتشار برپا تھا۔ ایسے حالات میں حیدرآبادی صحافت نے پھر کروٹ بدلی۔ ذہنی الجھنوں اور کرب ناک ماحول پر قابو پا لیا۔ مایوسی میں امید کے چراغ جلائے۔ نئی توقعوں نے نئے راستے تلاش کیے۔



اے کہ تیرے نام کا ڈنکا بجاتا ہے دکن
اے کہ تیری ذات ہے فخرِ سلاطینِ دکن

ظفر علی خاں

۱۹۲۸ء میں روزنامہ "صبحِ دکن" احمد عارف کے زیرِ ادارت جاری ہوا جامعہ عثمانیہ کے نوعمر قلم کاروں نے دکھنی ماحول میں اس اخبار کو مقبول بنایا۔ آصفِ سابع کی خصوصی تحریریں اور فارسی کلام شائع ہوا کرتا تھا۔ علمی ادبی مضامین کی زیادہ اہمیت تھی۔ اعتدال پسندی اور میانہ روی کے باعث عوام اور سرکاری حلقوں میں مقبول رہا۔ "صبحِ دکن" کو حیدرآباد کے بڑے اور نامور ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے زمانے میں یہ اخبار دن میں دو مرتبہ شائع ہوا کرتا تھا معین الدین قریشی، اکبر وفا قانی اور شاہد صدیقی اس سے وابستہ تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن سے پیدا شدہ حالات کا شکار ہو گیا۔

۱۹۲۹ء میں شمس اللہ قادری نے جو تاریخی اور تحقیقی کاموں کی وجہ سے شمس المورخ کہلاتے تھے، سہ ماہی رسالہ "تاریخ" جاری کیا۔ اس میں تاریخ اور ادب سے متعلق مضامین چھپتے تھے۔ یہ رسالہ ان کی تحقیقی اور تاریخی ذوق کا آئینہ دار تھا۔ احمد اللہ قادری اس کے سب ایڈیٹر تھے۔ تاریخ میں دوسرے مورخوں کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔

۱۹۲۹ء میں مکتبہ ابراہیمیہ کی جانب سے "مکتبہ" شائع ہوا۔ اس میں جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر اور اساتذہ مجلسِ ادارت میں شامل تھے۔ اسی وجہ سے "مکتبہ" کو نوجوان ادیبوں کا تعاون حاصل رہا۔ "مکتبہ" جدید اور نئی صنف افسانہ کی ترقی میں کوشاں رہتا۔ عبدالقادر سروری اس کے مدیر اور سید محمد صاحب عمر یافعی شریک مدیر تھے۔ یہ دور کا معیاری رسالہ تھا۔ اس رسالے کے ذریعے

اچھے افسانوں کے پڑھنے اور لکھنے کا ذوق ملک بھر میں پیدا کر دیا۔ بلند پایہ افسانہ نگاروں نے اپنی نگارشات سے اسے نوازا تھا۔ فن افسانہ نگاری کے تدریجی ارتقا کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوا۔ افسانوں کے علاوہ ڈرامے اور مضامین بھی ہوتے تھے۔ اور ناول بھی اقساط میں چھپتے تھے۔

"وقت" اور "منشور" عبدالرحمٰن رئیس نے ۱۹۲۹ء میں جاری کیا۔ رئیس آتش بیاں مقرر تھے۔ ذہین اور باذوق ساتھیوں کے تعاون سے انھوں نے ان دونوں اخباروں کو حیدرآباد کے مقبول اخباروں میں شامل کر دیا۔ پھر "مجلس" غفران احمد انصاری نے جاری کیا۔

۱۹۳۰ء میں سعد اللہ قادری نے "سلطنت" جاری کیا جسے ممتاز محقق شمس اللہ قادری کی سرپرستی حاصل تھی۔ "سلطنت" نے خود کو سیاسی زندگی سے دور رکھا۔ آصفِ سابع کے فرمان اور کلام شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں یہ بند ہو گیا۔

۱۹۳۱ء میں بیگم ابوبکر خویشگی کی ادارت میں "ہم جولی" شائع ہوا جس میں تحریکِ نسواں کو تقویت بخشی گئی۔ یہ دکن کی خواتین کا پسندیدہ ماہانہ رسالہ تھا۔ جس میں تعلیم، امورِ خانہ داری سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ "النساء" کی طرح "ہم جولی" خواتینِ دکن میں شعورِ حیات اور ذوقِ ادب کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں بند ہو گیا۔ محی الدین قادری زورؔ، فرحت اللہ بیگ، فصاحت جنگ جلیلؔ، جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ مرزا ہادی رسوا، صغرا بیگم ہمایوں مرزا، سید وزیر حسن کا تعاون بھی ملتا رہا۔

عبدالرزاق بسمل جامعہ عثمانیہ کے نوجوان ادیب شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے "شباب" جاری کیا۔ جامعہ عثمانیہ کی طالبات کے رشحاتِ قلم کو اس میں جگہ دی۔ یہ برسوں کامیابی سے چلتا رہا۔ "ناہید" کے نام سے خواتین کے لیے چند صفحے مختص تھے۔ جہاں بانو نقوی، حجاب امتیاز علی کے افسانے شائع ہوتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں 'الموسیٰ' کی اجرائی ہوئی جو سٹی کالج کا آرگن تھا۔ مرزا سرفراز علی مدیر اور یونس سلیم نائب مدیر تھے۔ ابتدا میں سہ ماہی رسالہ تھا پھر ۱۹۴۸ء سے حالات بدلنے لگے تو سالانہ کردیا گیا۔ اس رسالے میں اساتذہ اور طلبا مضامین لکھتے رہے۔ یہ رسالہ آج بھی جاری ہے لیکن "سٹی کالج میگزین" کے نام سے ۱۹۵۰ء میں دوبارہ شائع ہونے لگا اس میں علمی، ادبی تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اکبرالدین صدیقی اس کے مشیر تھے۔

۱۹۳۴ء میں اکبر وفاقانی نے نیم ماہی رسالہ "حُسنِ کار" جاری کیا۔ جامعہ عثمانیہ نے حیدرآبادی زندگی کو نئی تہذیب اور نئے سماج سے روشناس کرایا۔ نئے ذہن کی تعمیر کی۔ ان ہی میں سے ایک اکبر وفاقانی تھے جو مجلہ عثمانیہ کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ 'حُسنِ کار' علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ حُسنِ کار میں شاعری، ادب، موسیقی، آرٹ اور تعمیر کاری داخل تھے۔ ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے 'حُسنِ کار' کو سنوارا۔ خالص ادبی رسالہ تھا جس میں افسانے، مضامین اور تنقیدوں کے علاوہ ادبی مسائل پیش ہوتے تھے۔ "نسوانی گفتگو" کے عنوان سے خواتین کے لیے صفحات مختص تھے جس ناظرہ مرتب

کرتی تھیں۔ دو سال بعد یہ نیم ماہی رسالہ بند ہوگیا۔

روزنامہ "پیام" حیدرآباد کی صحافتی اور ادبی زندگی میں نئی قدروں کے ساتھ ۱۹۳۵ء میں قاضی عبدالغفار کی ادارت میں جاری ہوا جو قوم پرست مسلمان تھے اور محمد علی جوہر کے تربیت یافتہ تھے۔ سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے۔ "پیام" جب جاری ہوا حیدرآبادی صحافت ولولہ انگیز ہو چلی تھی۔ قاضی صاحب اعتدال پسند تھے اور سنجیدہ تھے اور اسی پالیسی کو اپنایا بھی۔

"پیام" ملک گیر مسائل کا احاطہ کرتا تھا۔ الاقوامی مسائل پر اداریے اور تبصرے لکھے جاتے تھے۔ تحریریں آبِ حیات کا کام کرتی تھیں۔ پیام کی اشاعت کے ساتھ صحافتی زبان بھی معیاری اردو کے مطابق ہوگئی۔ اندازِ بیان اور طرزِ نگارش کے ذریعہ صحافت اور ادب کے فرق کو مٹا دیا ہی نہیں قاضی صاحب نے حیدرآبادی صحافت کو سائنٹفک بنیادوں پر چلانے کی کوشش کی۔ "پیام" ہی کی تقلید میں دوسرے روزناموں نے خصوصی کالم' اداریے کالم تبصرے وغیرہ شروع کیے۔ مزاحیہ کالم کی مقبولیت نے حیدرآبادی اخباروں کو مزاح کا نیا اور شستہ انداز عطا کیا۔ قاضی صاحب مردم شناس تھے لہٰذا نوجوانوں کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا اور صحافت کے اصولوں اور قدروں سے واقف کرایا۔ بہت سے نوجوان ادیب و شاعر پیام سے وابستہ تھے۔ جب سر مرزا اسماعیل ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم بنے تو انھوں نے قاضی صاحب کو صحافتی زندگی سے محکمہ اطلاعات بلوالیا۔ چنانچہ انھوں نے اختر حسن صاحب کو "پیام" کی ذمہ داری سونپی۔ ۱۹۴۷ء میں "پیام" اختر حسن کی ادارت میں ترقی پسند ادب کی نہج پر چلنے والا پیام ہوگیا۔ قاضی

صاحب نے جن اصولوں کی بنا ڈالی تھی اختر حسن نے اسے قائم رکھا۔ وسیع النظری اور فراخ دلی کے باعث صحافت کا سر بلند رکھا۔ (۱۹۴۷ء — ۱۹۵۷ء) تک کئی نشیب فراز آئے۔ مجلس کی آنکھوں میں پیام کھٹکنے لگا۔ حکومت بھی خوش نہیں تھی۔ کمیونسٹ نظریوں کا ترجمان "پیام" ترقی پسند خیالات کی وجہ سے مقبول تھا۔ اپنے مسلک کا بے باکی سے پرچار کرتا رہا۔ ایک دن پیام کے دفتر کو آگ لگی۔ پھر "امروز" کے دفتر کو جلا کر راکھ کر دیا اور شعیب کا قتل ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء کے سیاسی انتشار نے "پیام" پر پابندی عائد کر دی۔ پھر پیام جاری ہوا۔ اور اختر حسن جیل بھجوائے گئے اس شبہ پر کہ وہ ہندوستان کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ ناساعد حالات کا سلسلہ جاری رہا۔

فصیح الدین احمد کی ادارت میں ہفتہ وار "پرچم" ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔ آزاد حیدر آباد کا ترجمان تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے اکثر نوجوان اس سے وابستہ تھے۔ ۱۹۴۸ کے انتشاری دور میں پرچم بند ہو گیا۔ پرچم جذباتی نقطۂ نظر کا علم بردار تھا۔

اردو زبان و ادب کے قائد سید محی الدین قادری زور نے ۱۹۳۱ء میں اُردو کی خدمت کے لیے ادارۂ ادبیات اُردو کی داغ بیل ڈالی تو اس کے لیے "ایوانِ اُردو" کی تعمیر ناگزیر ہو گئی۔ ایک عزمِ صمیم، بلند حوصلگی اور والہانہ پن سے انھوں نے اُردو کی خدمت کی ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ میں "تنقید و ادب کی تاریخ میں اور اُردو تحقیق کے ساتھ اُردو صحافت میں بھی ڈاکٹر زور نے عظیم

کارنامے انجام دیے ہیں۔ ادارے کے قیام کے بعد ۱۹۲۸ء میں ماہ نامہ 'سب رس' کا اجرا عمل میں آیا۔ اور ۵۵ سال گزرنے کے بعد بھی 'سب رس' اسی آب وتاب کے ساتھ اُردو زبان اور ادارے کی ترجمانی کر رہا ہے۔ 'سب رس' کے نگراں خود ڈاکٹر زور تھے اور مدیر صاحبزادہ میکش جو نہ صرف جامعہ عثمانیہ کے طالب علم تھے بلکہ خود ڈاکٹر زور کے شاگرد بھی تھے۔ 'سب رس' میں ہر نئے رجحان کی نمائندگی ہوتی۔ لیکن سیاست سے وہ الگ ہی رہا۔ دکنی ادب کا علم بردار رہا اور حیدرآبادی تہذیب وشائستگی کا مظہر۔ 'سب رس' نے بچوں کے لیے بھی شمارے مختص کیے تھے لیکن پھر وہ بند کر دیے گئے۔ 'سب رس' کے حصۂ خواتین میں سلجھی ہوئی خواتین ادیب اور شاعر خاموشی سے اپنا کام کرتی رہیں جن میں رابعہ بیگم، سکینہ بیگم، بشیر النسا بیگم، جہاں بانو نقوی اور لطیف النسا بیگم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۳۹ء میں غلام محمد خان نے "ہندوستانی ادب" ماہ نامہ جاری کیا۔ یہ جامعہ عثمانیہ کے فرزند تھے۔ ۱۹۳۲ء کے مجلہ عثمانیہ کے مدیر بھی تھے۔ جامعہ سے نکلنے کے بعد صحافت میں داخل ہو گئے۔ ابتدائی زمانے میں اعلیٰ معیار کی وجہ سے یہ شہرت رکھتا تھا بعد میں ڈائجسٹ کی شکل اختیار کر گیا۔ غلام محمد خان کے انتقال پر یہ رسالہ بند ہو گیا۔

۱۹۴۰ء میں میر حسن الدین نے "مملکت" کے نام سے ہفتہ وار رسالہ جاری کیا جو دس سال تک مسلسل جاری رہا۔ سیاسی نقطۂ نظر کے تحت سنجیدہ مسائل پر بحثیں ہوتیں۔ فلسفیانہ مضامین بھی شائع ہوتے۔ "مملکت" اخبار "پیام" کا ہم عصر اور رقیب تھا۔ میر حسن الدین جامعہ عثمانیہ کے فرزند تھے اور فلسفہ کے

کے طالب علم تھے۔ اس وقت کی ملکی اور غیر ملکی سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن صاف گو آدمی ہونے کی وجہ سے سیاست میں جم نہ سکے۔ "نمک پارے" طنز و مزاح کا کالم "مملکت" کی مقبولیت بڑھاتا گیا۔ اقبال کے توسیعی لکچروں کا ترجمہ حسن الدین کرتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے رسالہ "سیاست" شائع کیا تھا جس میں سیاسی اور اجتماعی زندگی کے مسائل پر بحث ہوتی تھی یہ رسالہ اندر دان علم دوست طبقے میں بہت مقبول ہوا۔ اسکالرز، پروفیسرز اور طلبائے کے مضامین اور تحقیقی مقالے چھپتے تھے۔ مغربی زبانوں کے سرمایئے کے اُردو ترجمے اس میں منتقل کیے جاتے تھے۔ یہ رسالہ یوسف حسین خاں کی اعانت سے شائع ہوا تھا۔ جب وہ علی گڑھ چلے گئے تو رسالہ بند ہو گیا۔

۱۹۴۱ء میں علی احمد نے "داستان گو" جاری کیا جو افسانوی ادب کی توسیع میں نمایاں کام انجام دیتا رہا۔ اس کے قلمی معاونین میں وجد اور مخدوم بھی شامل تھے۔ ۱۹۴۱ء میں رسالہ طبابت کے بعد لئیق احمد نعمانی نے جریدہ صحت عامہ" نکالا اس میں طب اور حفظانِ صحت کے تعلق سے مضامین لکھے جاتے تھے دس سال تک یہ جاری رہا۔

جنگ فنڈ حکومت حیدرآباد کی اعزازی کمیٹی کی طرف سے فوجیوں کی دلچسپی کے لیے مزاح نگار مرزا عظمت اللہ بیگ نے ۱۹۴۲ء میں "جیت" ملو نامہ نکالا جو چار سال تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ "تماشا" بھی نکالنے لگے تھے جو صبغتہ اللہ بیگ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ "تنظیم" علی اشرف نے نکالا تھا جو

سلامت روی کا آئینہ دار تھا۔

انجمن ترقی اردو کی جانب سے "ہماری کتابیں" ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ اس رسالے کی مدیر سید علی شبیر حاتمی تھے۔ یہ ایک معیاری اور ادبی رسالہ تھا جس میں مختلف ادیبوں شاعروں کی تصانیف اور ادبی مسائل پر تنقیدیں ہوتیں اور تفصیلات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ اس کے مقالات، مضامین، علمی استفسارات تبصرے تعارف لائق مطالعہ ہوتے تھے۔

روزنامہ "میزان" حبیب اللہ اوج کی ادارت میں ۱۹۴۳ء سے نکلنا شروع ہوا جو غلام محمد کی ملکیت تھا۔ بیک وقت اردو، انگریزی اور تلنگی میں شائع ہوتا تھا۔ اوج جامعہ عثمانیہ کے فرزند تھے اور اپنی ذہانت اور محنت سے حیدرآباد میں اردو صحافت کو نیا آہنگ و لہجہ عطا کیا۔ میزان میں بچوں کا صفحہ بھی ہوتا تھا۔ بچوں کی ذہنی اور تحریری و تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے انھوں نے مقابلوں کو منعقد کیا جس کی رپورٹیں "میزان" میں چھپتی تھیں۔ ۱۹۴۸ء میں میزان بند ہوگیا۔ میزان کی پالیسی اتحاد، اخوت و مساوات پر مبنی تھی بے باک اور آزاد اخبار تھا۔ چنانچہ حکومت نے اس پر پابندی لگادی تھی۔

محمد عثمان اور حسینی شاہد کی ادارت میں ۱۹۴۶ء میں "رباب" جاری ہوا اور ادبی حلقوں میں مقبول رہا۔ "رباب" ترقی پسند ادب کی ترجمانی کرتا تھا۔ بہت جلد بند ہوگیا۔ ۱۹۴۶ء میں احمد مکی نے ترقی پسند رسالہ "داستان" جاری کیا۔ زینت ساجدہ بھی ان کی شریک کار تھیں۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ بند ہوگیا۔ پھر احمد مکّی نے فلمی رسالہ "فلم زار" جاری کیا۔

مختار احمد کرمانی نے ۱۹۴۷ء میں "ایوان" جاری کیا۔ بعد میں احمد مکی بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔ اس دور کی سماجی، ادبی، ثقافتی رجحانات کا آئینہ دار تھا۔

ترقی پسند ادب کا ترجمان "سبیرا" ۱۹۴۷ء میں غوث محی الدین نے جاری کیا۔ ترقی پسند ادیب اور شعرا کا تعاون حاصل تھا۔ علی سردار جعفری، مخدوم، کیفی، قاضی عبد الغفار، عابد علی خاں، فراق، کنول، میکش، الہام، صدیقہ بیگم، افضل عابدی، وغیرہ کے رشحات قلم چھپتے تھے۔ ملک راج آنند، غلام ربانی تاباں، ابن انشاء، ساحر لدھیانوی وغیرہ کے نام بھی اس میں شامل تھے۔ افسانے، مضامین اور کلام چھپتے تھے۔

"الہدیٰ" ۱۹۴۷ء میں پندرہ روزہ رسالہ عبد الحمید خاں کی ادارت میں نکلا تھا۔ بے باک اظہار رائے اور مخصوص لب و لہجے کی وجہ سے حیدر آباد کے ادبی و سیاسی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں "الہدیٰ" بند ہو گیا۔

"معطار د" خواجہ معین الدین علیہ انصاری کی ادارت میں ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا اور جلد ہی ۱۹۴۸ء میں سیاسی تبدیلی کے باعث بند ہو گیا۔

اخبار "مستقبل" (۱۹۴۷ء) "تعمیر دکن" فیض الدین کی ادارت میں جاری ہوا۔ انقلاب مرتضیٰ مجتہدی، "محب وطن" لچھی ریڈی، "آواز" احمد عبد القادر، "جناح" اظہر رضوی سب ۱۹۴۷ء میں جاری ہوئے۔

بچوں کا معیاری رسالہ "تارے" مسلم ضیائی کی ادارت میں ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد بھی جاری رہا لیکن جب مسلم ضیائی پاکستان چلے گئے تو رسالہ بند ہو گیا۔

نظر حیدرآبادی نے ۱۹۴۷ء میں پولیس ایکشن سے پہلے "سنگم" جاری کیا۔ یہ نیم ماہی رسالہ تھا جو ۱۹۴۸ء کے بعد بند ہو گیا، جب نظر حیدرآبادی پاکستان چلے گئے۔

"مینا" تمکین کاظمی کی ادارت میں ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ مختصر سی مدت کے بعد یہ ماہ نامہ بند ہو گیا۔ "آہنگ" خورشید احمد جامی کی ادارت میں ہر ہفتہ شائع ہوتا تھا۔

"تعمیرِ دکن" فیض الدین نے پولیس ایکشن کے قبل نکالا جو ایک جرأت مند صحافی تھے۔

"انقلاب" بھی مرتضیٰ مجتہدی کی ادارت میں پولیس ایکشن سے قبل نکلا تھا۔

"رہبرِ وطن" ۱۹۴۶ء میں سید مصطفیٰ قادری خطیب کی ادارت میں نکلتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں "ہمدم" روزنامہ جاری ہوا جو ان کے انتقال تک نکلتا رہا۔

سلطنتِ حیدرآباد کے سیاسی انتشار اور انقلاب کا زمانہ ۱۹۴۸ء

سلطنتِ حیدرآباد کے سیاسی انتشار، انقلاب اور زوال یعنے ۱۹۴۸ء تک حیدرآبادی صحافت میں تین مکاتیبِ خیال کی نشاندہی ہوتی ہے۔

۱۔ "نظام گزٹ" اور "صبحِ دکن" سلطنت "سلطنت" کے فرماں روا میر عثمان علی خاں کی تحریروں کو شائع کرتے اور سلطنت سے وفاداری اور پرچم آصفیہ کا احترام کرتے تھے۔ دبدبۂ آصفی" "صحیفہ" "تحفہ" اور "پرچم" بھی اس فہرست میں داخل تھے۔)

۲۔ "رہبرِ دکن" "مجلس" "اتحاد" "جناح" اور "آواز" "اتحاد المسلمین" کی ترجمانی کرتے تھے۔ مسلم مفادات اور آزاد حیدرآباد کا تصور عام کرتے تھے۔

۳۔ "رعیت" "پیام" "علم و عمل" "وقت" اور "امروز" ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے کوشاں تھے۔ "پیام" نے ترقی پسند نظریات کو فروغ دیا اور کمیونسٹ تحریک آگے بڑھی۔ ۱۹۴۸ء میں اس اخبار نے تہلکہ مچا دیا۔

حیدرآباد ۱۹۴۸ء میں انڈین یونین میں شامل کر لیا گیا اور جمہوری خودمختار ہندوستان کا جزو بن گیا۔ حیدرآباد میں صحافت ہمیشہ آزاد رہی۔ تعلیم کے دروازے کھل جانے کی دیر سے سماج کی اخلاقی اور تہذیبی قدروں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اردو تہذیب میں رواداری کا عنصر ہمیشہ بدرجۂ اتم موجود رہا ہے۔ اخلاص و دوستی کے ماحول میں نظریاتی اختلافات کے باوجود صحافیوں نے اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھائی۔

عہدِ آصفی کا ادب اور خواتینِ دکن

ساتویں صدی ہجری یعنی ۱۲ ویں صدی عیسوی ہی میں دکن میں اُردو زبان کی ترویج ہوچکی تھی اور اردو بول چال کے درجے سے گزر کر تحریر کی گل کاریاں کھلا رہی تھی۔

دکن کی خواتین شعر گوئی، نثر نگاری، انشا پردازی، خطابت اور صحافت کے ذریعے اور مختلف انجمنوں میں اُردو کی خدمت کر رہی تھیں۔ یہی نہیں انھوں نے اُردو شاعروں اور مصنفوں کی قدردانی میں ان کی سرپرستی بھی کی اور نظم اور نثر کی کتابیں بھی مرتب کیں۔

عادل شاہی ملکہ خدیجہ سلطان شہربانو نے جو قلی قطب شاہ کی پوتی، سلطان عبداللہ کی بہن اور سلطان محمد عادل شاہ کی بیگم تھیں۔ اپنے دربار میں کئی نامور شاعر جیسے ملک خوشنود، داود اور رستمی کی سرپرستی کی۔ ملکہ کی علمی فیاضی کا ذکر "خیابانِ نسواں" میں پڑھا جاسکتا ہے۔

ماہ لقا بائی چندا ایک باکمال شاعرہ، صاحب جاگیر و منصب اُردو دنیا میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی تھیں۔ وہ ماہرِ فنِ موسیقی شاہی طوائف ضرور تھی مگر پاک طینت اور با اخلاق اس کی علمی قابلیت، نازک خیالی، بلند پروازی، لطافت و پاکیزگی نے اس کی شاعری میں دل آویزی اور موسیقیت اور جاذبیت پیدا کردی تھی۔ شیر محمد خاں ایمان سے اسے تلمذ حاصل تھا۔ ایک بیان کے مطابق چند وزرائے حیدرآباد اس کے اصحاب

میں شریک تھے۔ ارسطو جاہ نے اس کا دیوان مرتب کروایا تھا اور میر عالم نے اس کی مدح میں مثنوی لکھی تھی۔ اس کے دیوان کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ چندا کے پاس ہر وقت شعر و شاعری کی محفل جمی رہتی تھی۔ اس نے شعراء اور مصنفین کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی کی۔ اسے تاریخ سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ اس کی سرپرستی میں "دل افروز" کے نام سے تاریخ لکھی گئی۔

کہتے ہیں کہ اڈیکمیٹ چندا کی جاگیر تھی۔ وہ مقام جہاں آج جامعہ عثمانیہ کی عالی شان عمارت کھڑی ہے اور جو ایک تعلیمی مرکز بن گیا ہے اسی جاگیر کا حصہ تھا اور جہاں نامپلی اسکول واقع ہے وہ کسی زمانے میں ماہ لقا کی پروردہ بیٹی حسن لقا بائی کا باغ تھا۔ ماہ لقا کی سوانح عمری "حیاتِ ماہ لقا بائی" غلام صمدانی خان گوہر نے قلم بند کی ہے۔ "دکن میں اُردو" "مرقعِ سخن" اور "فہرست دکھنی مخطوطات" میں چندا کے حالات درج ہیں۔

محترمہ نورالنساء بیگم مختار الملک اول کی صاحبزادی کی دلچسپی کی وجہ سے تذکرۂ جملی مرتب ہوا۔

شرف النساء اور محترمہ فاطمہ بیگم اسی زمانے کی مرثیہ گو خواتین تھیں۔

نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس کی سرپرستی میں اردو کا مستقبل روشن اور شاندار تھا۔ حیدرآباد کی تہذیب اس کا مزاج، اس کی سوچ غرض کہ سب پر اُردو کی چھاپ تھی۔ اہل علم و فن نے گوشے گوشے میں علم کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں۔ شاعروں

کا سامان ہوتا تھا اور ہر خاص و عام میں شعر و سخن کا ذوق تھا۔

۱۹۱۱ء میں جب آصف سابع نواب میر عثمان علی خان تخت نشین ہوئے تو حیدرآباد تہذیب و تمدن کا مامن اور علم و فن کا سرچشمہ بن گیا تھا۔ یہ زمانہ اردو ادب و زبان کی ترقی کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور بلا شبہ عہدِ زرّین کہلانے کا مستحق بھی۔

بہ قول جناب حبیب الرحمٰن صاحب "بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اُردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے تعلق سے جن افراد کے نام لیے جاتے ہیں ان میں نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کا نام ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔"

۱۹۱۸ء - ۱۹۱۹ء میں جب جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل آیا۔ تو اس گنجینۂ علم و فن میں دُور دُور سے علم کے پروانے کھنچے چلے آئے۔ شاعروں اور ادیبوں نے عروسِ دکن کو بیش بہا جواہر پاروں سے سنوارا۔ نوخیز ادیبوں اور شاعروں کو نئی جولان گاہیں ملیں۔ اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر عثمان علی خاں نے دنیا بھر کے علوم اُردو زبان میں منتقل کر دیے اور اس کا دامن علمی، فنی اور تکنیکی اصلاحات بھر دیا۔

یہ وہ دَور تھا جب ہر طرف انقلاب رونما ہو رہے تھے۔ سیاسی، سماجی، علمی، ادبی، تہذیبی اور صنعتی ترقی کے لیے جدّ و جہد کا آغاز ہو رہا تھا۔ آصف سابع نے پہلی بار طبقۂ خواتین کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ جہالت، توہم پرستی اور تعصّبات کے پردوں کو گرا کر انھوں نے خواتین کے لیے تعلیم ضروری قرار دی اور تعلیم کے مواقع فراہم کیے۔ زنانہ مدارس کھلے اور جامعۂ عثمانیہ کے ساتھ کلیہ اناث بھی وجود میں آیا جو آج زنانہ کالج یا ویمنس کالج کہلاتا ہے۔

اس طرح خواتین کا احساسِ خوابیدہ بیدار ہوا۔ تعلیمی اور تمدنی حالت میں نمایاں فرق ہوا اور انھیں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کا موقع ملا۔
نامپلی اسکول اور محبوبیہ گرلز اسکول کے ذریعے جس کی بنیاد میر محبوب علی خاں کے عہدِ حکومت میں ڈالی گئی تھی' لڑکیوں کی تعلیمی حالت سنبھلنے لگی۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد وہ زنانہ کالج اور عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے' ایم۔ اے اور سائنس کی ڈگریاں حاصل کرنے لگیں۔ قدامت پرستی کو خیرباد کہہ کر لڑکیوں نے طرزِ جدید پر اپنی زندگی کو ڈھالنا شروع کیا۔ عمل کے ہر میدان کو دبیڑیں۔ جب علم نے سنوارا تو ادب کے خزانے بھی ان کے رشحاتِ قلم سے بھرنے لگے۔ تعلیم کی روز افزوں ترقی' تہذیب و تمدن کے مینار بھی روشنی کرتی چلی گئی جو خواتین گھر کی چہاردیواری میں موتی بکھیر رہی تھیں وہ بھی پردے سے باہر آئیں۔
جب عثمانؔ' جلیلؔ' صراجؔ' نظم طباطبائی اور کشن پرشاد شادؔ جیسے نامور شاعروں نے کلام میں نگینے جوڑے۔ قصیدے' مثنوی' غزل' نظم غرض ہر صنفِ سخن میں شعرا کی نازک خیالیاں فضائیں تحلیل ہوئیں تو کیا وجہ تھی کہ
دنیا علم و ادب کے اس سرچشمے سے سیراب نہ ہو۔
اور پھر وہ ہوا جو اب تک نہ ہوا تھا۔
نسوانی فکر و جذبات نے اردو ادب میں دل آ
معاشرت کو سنوارنے کی باتیں عمل کی حد تک پہنچیں۔ خوا
میں کہکشاں ہوئیں اور قومی تحریکوں میں حصہ لینے لگیں۔ اور پھر دکن دیس کی خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ زندگی کے سفر پر رواں دواں ہوئیں منزلیں طے کرتے چلتے گئے۔ نئی

منزلیں ملتی گئیں۔ نئے آفاق پیدا ہوتے گئے۔ سراج، طباطبائی اور شاد کی شعلہ نوائیوں کے ساتھ خاتون شعراء کی رنگین بیانیاں عہدِ آصفی کے ادبی ماحول میں رنگ بھرنے لگیں۔ دکن کی بہتی اور عظیم شاعرہ بشیرالنساء بیگم بشیرؔ کا احساسِ تشکر و عقیدت پھول بن کر شہرِ عثمان پر برسنے لگا۔

نہ پوچھ اس کی حقیقت کہ آج کیا ہے دکن
وقارِ ہند کا باعث بنا ہوا ہے دکن
وہ کوہِ نور، وہ ہیرے نہ ہوں یہی تو کیا غم
جواہراتِ ادب سے بھرا ہوا ہے دکن
معاشرت میں، تمدن میں ہر اک فن میں
ترقیوں کے منازل پہ آ گیا ہے دکن
یہ فیض ہے شہہِ عثماں کی حکمرانی کا
کہ یادِ عظمتِ رفتہ دلا رہا ہے دکن

(بشیرؔ)

محلوں میں رہنے والی آصف سابع کی شریکِ حیات دولھن پاشا بیگم صاحبہ شاعری جس کے بام و در میں گنگناتی تھی اور اردو جس کے ایوانِ شاہی میں نازوں سے پلی تھی، اردو میں شعر کہتی تھیں اور اعجازؔ تخلص کرتی تھیں۔ عہدِ آصفی کی خواتین میں آپ کا نام احترام سے کیا جاتا تھا۔ زبان و بیان کی شستگی اور سلاست کا نمونہ قارئین کے لیے پیش ہے :

سارا عالم ہے بندۂ اخلاق   کوئی سلطان سا خوش مزاج نہیں

پہنچے ہے اب خسروِ دکن کے سوا کوئی شایانِ تخت و تاج نہیں

آصفِ سابع کی بہو اور شہزادہ اعظم جاہ کی ملکہ شہزادی درِ شہوار دردانہ بیگم جب بیاہ کر ترکی سے حیدرآباد آئیں تو اردو ماحول اور اردو زبان سے ناواقف تھیں۔ پادشاہ بیگم صوفی ان کی معلمہ مقرر ہوئیں۔ رفتہ رفتہ جب واقفیت بڑھی تو نسوانی جلسوں میں اردو میں تقریر کرنے لگیں اور پھر اردو نثر نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ سلیس اردو میں لکھتی اور پڑھتی رہیں۔

شہزادی جہاں دار النساء بیگم جو لیڈی وقار الامراء کہلاتی تھیں، آصف جاہِ خامس افضل الدولہ کی صاحب زادی تھیں۔ ذی علم اور دانش مند خاتون تھیں۔ اردو سے دلچسپی تھی اور سلیس اور عام فہم زبان میں لکھتی بھی تھیں۔ خواتینِ دکن کی کانفرنسوں میں بہ حیثیت صدر خواتین دکن کے مسائل پر گفتگو بھی کرتی تھیں۔

عہدِ آصفی سے قبل حیدرآباد کی سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات ایسے نہ تھے کہ عورت پردے سے باہر آکر اپنا لوہا منوا سکتی یا اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھا سکتی۔ پرانے رسم و رواج کی بیڑیاں ان کے پیروں میں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ توہمات میں گھری ہوئی خواتین چڑھتے ہوئے سورج اور پھیلتے ہوئے اجالے سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی کے تقاضوں سے بے تعلق ان کی سوچ اور فکر گھر کی چار دیواری سے آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔ طبقۂ نسواں کی اس زبوں حالی اور

محرومیوں نے محترمہ طیبہ بیگم بلگرامی کے احساس کو جھنجھوڑا۔ طیبہ بیگم مرحومہ آصف سابع کے آتالیق نواب عماد الملک بہادر کی صاحبزادی تھیں جو عالم اور مفکّر ہونے کے علاوہ حامیانِ اُردو اور تعلیم نسواں میں سے تھے۔

طیبہ بیگم نے نامپلی گرلز اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدراس یونیورسٹی سے لگ بھگ ۱۹۰۶ء میں گریجویشن کیا۔ یہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے بی. اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اُردو، فارسی، عربی، اور انگریزی میں مہارت رکھتی تھیں۔ شستہ علمی ماحول میں انھوں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا۔ اپنے ادبی مضامین، ناول اور فکر انگیز تقاریر کے ذریعے انھوں نے سماج اور معاشرے کی خرابیوں، جمود وجہالت اور دقیانوسی رسم و رواج سے خواتین کو چھٹکارا دلانے کا بیڑا اٹھایا۔ غریب لڑکیوں اور خواتین کی علمی، اخلاقی اور معاشی حالت کو درست کرنے ۱۹۱۳ء میں "انجمن خواتینِ اسلام" قائم کی جسے ان کی دو صاحبزادیاں معصومہ بیگم اور سکینہ بیگم سنبھالتی رہیں۔

تصنیف و تالیف علمی خدمات کا نچوڑ ہیں۔ کسی ملک و قوم کے دماغی اور ذہنی ارتقاء کے معیار کا اندازہ اس دور کی تصنیفات و تالیفات سے ہی ہوتا ہے۔ اس دور کی معاشرت اور تمدّن کی بہترین عکاسی طیبہ بیگم نے اپنے ناول "انوری بیگم" میں کی ہے۔ ان کا دوسرا ناول "حشمت النساء" بچّوں کے مستقبل کو سنوارنے کا ایک کامیاب تجربہ ہے۔ "اسرارِ سلیمانی" ان کے ترجموں کا مجموعہ اور "رسائلِ طیبہ" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے "اِدارہ ادبیاتِ اُردو" نے شائع کروایا ہے۔

اپنے ان ناولوں، مضامین، ترجموں اور تقاریر کی وجہ سے مرحومہ نے دنیائے

ادب میں ایک خاص مقام پیدا کرلیا۔ چناں چہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے دورِ آصفی میں ادب کے ذریعے ایک خوب صورت انقلاب برپا کیا۔

حیدرآباد کی تاریخ اپنی خواتین کی بیداری اور ترقی کا دل چسپی سے مشاہدہ کررہی تھی۔ ادب و ثقافت منتظر تھا کہ نسواتی تحریر اور قومی تحریک کے جادو کیسے سرچڑھ کر بولتے ہیں۔

صغرا بیگم ہمایوں مرزا کی عورتوں کے مسائل سے دل چسپی نے انھیں طیبہ بیگم بلگرامی (بیگم خدیو جنگ) کے ساتھ مل کر پردہ نشین خواتین کے اندھیرے راستوں میں اُجالے پیدا کرنے کی لگن پیدا کردی تاکہ وہ اپنی منزل خود پہچان سکیں۔ چناں چہ وہ "انجمن خواتین اسلام" کی سکریٹری بن گئیں پھر "انجمن خواتین دکن" کے قیام پر اس کی صدر بن گئیں۔

صغرا بیگم ایک سلجھی ہوئی ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ اردو ادب کو انھوں نے "موہنی" "زہرہ" "آوازِ غیب" "بی بی نوری کے خواب" "سفینۂ نجات" "پندِ نصائح" "خیرِ نسواں" اور "سرگذشتِ ہاجرہ" جیسی کتابیں دیں۔ مختلف سفرنامے لکھے۔ "النساء" اور "زیب النساء" نامی دو رسالے جاری کرکے لڑکیوں اور خواتین کے مسائل پیش کیے۔ شاعری کا بھی ذوق تھا۔ حیا تخلص کرتیں اور استاد جلیل سے تلمذ حاصل رہا۔

ان دونوں خواتین نے جذبِ دل اور زورِ قلم سے طبقۂ نسواں کو "خودی کی بلندی" اور "پروازِ فکر" کی دعوت دی۔

اس ضمن میں مَیں اگر بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو کا ذکر کروں تو بے جا نہ

ہوگا۔ دکن کی یہ وفادار اور قابلِ فخر بیٹی نے گو انگریزی زبان میں گیت گائے لیکن اردو زبان اور اردو شاعروں اور مصنفوں کی سرپرستی بھی کی۔ اقبال، جوش، حفیظ اور امجد کے کلام کی قدرداں تھیں۔ انھوں نے اردو میں دھواں دھار تقاریر بھی کیں۔ نیشنل کانگریس کی رکن بن کر جیل کی سختیاں بھی جھیلیں بعد میں کانگریس کی صدر بھی رہیں۔ عہدِ آصفی کی ایک جری خاتون کے یہ کارنامے بے شک حیدرآباد کے لیے طرۂ امتیاز ہے۔

کلثوم بیگم بیگم مہدی یار جنگ علم دوست بلگرامی خاندان کی بہو اور مرزا موسیٰ خاں کی پوتی اور آغا محمد علی خاں سابق صوبہ دار کی صاحب زادی تھیں۔ علمی قابلیت اور علمی تبحر جس خاندان کا ورثہ تھا، اس ماحول میں کلثوم بیگم کو فارسی، اردو اور انگریزی سے دل چسپی کا ہونا قرینِ قیاس تھا۔ وہ لکھتی بھی تھیں۔ چناں چہ جہاں بانو نقوی کی کتاب "رموزِ خانہ داری" پر پیش لفظ بھی قلم بند کیا تھا۔

بیگم ولی الدین مولوی محب حسین اڈیٹر "معلمِ نسواں" کی دختر اور ولی الدین صاحب کی رفیقِ زندگی تھیں۔ علمی ماحول اور اپنے والد کی تحریکِ نسواں سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ چناں چہ انھوں نے ایک زنانہ رسالہ "خادمہ" کے نام سے جاری کیا جو علمی، مذہبی اور اخلاقی رسالہ تھا۔

معصومہ بیگم پروفیسر حسین علی خاں کی شریکِ حیات اور نواب عماد الملک

کی بڑی نواسی تھیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر دسترس حاصل تھی اور دونوں میں تقریر کے گل کھلاتی تھیں۔ کئی انجمنوں کی صدر اور سکریٹری رہیں اور زنانہ کانفرنسوں میں حصہ لیتی رہیں۔ انجمن خواتین اسلام" کی جس کی بنیاد ان کی والدہ طیبہ بیگم بلگرامی نواب عماد الملک کی صاحب زادی نے رکھی تھی، آخر دم تک اپنی بہن سکینہ بیگم کے ساتھ خدمت کرتی رہیں۔ ادب سے گہرا دل چسپی تھی۔ ادب کے ساتھ سیاست کے میدان کی بھی جانی پہچانی شخصیت تھیں۔ آندھرا پردیش لیجسلیٹو اسمبلی کی رکن بھی رہیں۔

بدر النساء بیگم۔ اردو کے دل دادہ اور بنگالی زبان کو عزیز رکھنے والے آغا حیدر حسن صاحب کی شریکِ حیات اور امیر حسن صاحب کی نواسی تھیں۔ اپنے ماحول سے بے خبر نہیں تھیں چناں چہ اردو کی اچھی قابلیت رکھتی تھیں۔

۱۹۲۹ء میں ادارہ ادبیات اردو کے زیرِ سرپرستی اردو نسوانی دنیا میں عملی و علمی سرگرمی اور علم و ادب کا صحیح سنجیدہ اور سلجھا ہوا ذوق پیدا کرنے کی غرض سے جب شعبۂ نسواں" قائم کیا گیا تو اس کی مجلسِ عاملہ کی صدر محترمہ راحیلہ بیگم انوار اللہ رہیں۔ جن کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا چرچا تھا۔ اردو فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھتی رہیں۔ "سوتیلی ماں" ان ہی کے قلم کی رہینِ منت ہے۔ ان کے خیالات سلجھے ہوئے اور پاکیزہ ہوتے تھے۔ کئی عرصے تک آپ محبوبیہ گرلز اسکول میں اردو اور فارسی بھی پڑھاتی رہیں

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی شریکِ حیات تہنیت النساء بیگم نے بھی اردو

ادب میں اپنی دل کش شاعری سے ایک نمایاں مقام پیدا کیا۔ یہ پرانی تہذیب کی دل دادہ ہیں۔ غزل کی پیرائے میں نعت اور قصیدے لکھتی رہیں۔ اپنے واردات قلبی بے ساختگی سے پیش کرتی ہیں۔ کلام خلوص و تاثر سے بھرپور اور عشق رسول سے لبریز ہوتا ہے۔ لطافت اور موسیقی ان کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے۔ "ذکر و فکر" "صبر و شکر" اور "تسلیم و رضا" ان کے نعتیہ کلام کی قندیلیں ہیں۔ بقول "آغا حیدر حسن" ہر نعت ایک چراغ ہے۔ کیسا چراغ جس کی اللہ میاں قرآن میں تعریف فرماتے ہیں کہ بلور کی قندیل ہے اور اس میں زیتون کے تیل کا چراغ روشن ہے۔ زور بیگم کے نعتوں کی قندیلیں حرم نبوی میں نظر آتی ہیں۔ اللہ! یہ اتنے سارے روشن حسین چراغ ان کے پاس کہاں سے آئے؟

آغا صاحب تہنیت النساء بیگم کو "زور بیگم" کہا کرتے تھے جنھوں نے ادارے کے قیام کے دوران اپنے شوہر کا خلوص دل سے ہاتھ بٹایا ہے۔

سکینہ بیگم رحمت اللہ نواب عماد الملک کی نواسی اور محترمہ طیبہ بیگم بلگرامی (خدیو جنگ) کی دوسری صاحبزادی نے محبوبیہ گرلز اسکول سے سینیر کیمبرج کیا۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں مہارت رکھتی تھیں۔ مضمون نویسی اور افسانہ نگاری میں شہرت حاصل کی۔ جدید و قدیم رجحانات کا خوش گوار امتزاج رکھتی تھیں۔ سخن فہمی اور سخن سنجی کے ساتھ شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ سکینہ تخلص کرتیں۔ سید علی حیدر طباطبائی سے تلمذ حاصل تھا۔ انداز بیان سلیس، پراثر اور شستہ ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے شعبہ نسواں کی معتمد اور رسالہ "سب رس" کی مجلس ادارت کی رکن رہیں۔ "نذر دکن" کے

نام سے خواتین کی قلمی کاوشوں کو کتابی صورت دی اور "رسائل طیبہ" میں اپنی والدہ کے مضامین و تقاریر کو شائع کئے۔ ان کے افسانے اور تقاریر ریڈیو سے بھی نشر کیے گئے۔

غریب عورتوں کو تعلیم کے ساتھ انھوں نے دست کاری اور کشیدہ کاری بھی سکھائی ادارے کی طرف سے تعلیم بالغاں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں دلچسپی لی۔ گرل گائیڈ کی کمشنر رہیں۔ نسوانی کانفرنسوں، جلسوں، انجمنوں میں شریک رہیں۔ دواخانہ عثمانیہ میں نگراں کار کی حیثیت سے مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رہی۔ اپنی علمی اور سماجی کاموں کے سبب مقبول رہیں۔ "انجمن خواتین اسلام" اور "مدرسہ فوقانیہ نسواں معظم جاہی مارکٹ" کے کام سنبھالتی رہیں۔

بشیر النساء بیگم بشیر حیدرآباد کی علمی ادبی اور تہذیبی زندگی کی روح رواں تھیں۔ کوئی ادبی محفل ایسی نہ تھی جہاں بشیر کے نغمے نہیں گونجتے تھے۔ بشیر کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اردو فارسی پر عبور حاصل تھا۔ کم عمری سے ہی مزاج شاعری کے لیے موزوں ہوگیا۔ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ۱۹۲۷ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ نظم، غزل، قصیدے، نعت، مسدس لکھتی رہیں۔ قوم کو فلاح کی راہ دکھائی اور ناسازگار حالات سے واقف کرایا۔ حیدرآبادی تہذیب کی دلدادہ اور اسلامی معاشرت کی نمائندہ رہیں۔

"دکن دیس" خدمتِ نسواں، اردو زبان اور شاعری" بشیر کی ادبی سرگرمیوں اور وجاہت بھری زندگی کے چار معیار تھے جن کے اطراف ان کی زندگی پروانہ وار گھومتی رہی۔

بشیرؔ کی ذات ماضی کی شاندار روایات کی امین اور عہدِ نو کے نئے اقدار اور تقاضوں کی پاسبان تھی ۔ انسانی معاشرے میں عورت کو صحیح مقام کے نہ ملنے پر ان کا دل کڑھتا تھا :

عورت کے دم سے کہتے ہیں نظمِ حیات ہے
مجبور کیوں زمانے میں پھر اس کی ذات ہے ؟

عورتوں کے حقوق کی انھوں نے پُرجوش سفارش کی ۔

بشیرؔ مجسم شعریت تھیں ۔ ان کی شاعری لطافت و پاکیزگی ،نسوانی وقار، اعلیٰ اقدار اور قومی جذبات محبت سے معمور تھی ۔

اُلفت اگر ہو آپ کو ہندوستان سے
غافل نہ آپ ہوں کبھی اُردو زبان سے
اس دورِ کشمکش میں ہوئی نیم جاں ہے
للّٰہ سنبھالیے کہ یہ اپنی زبان ہے

اُردو زبان سے انھیں عشق تھا ۔ ایک جگہ لکھتی ہیں :

زباں کی قدر میں خود اپنی قدردانی ہے
زباں کے رشتے سے مربوط زندگانی ہے
زباں نہ ہو تو ادب کا کوئی وقار نہیں
ادب نہ ہو تو زباں کا کہیں شمار نہیں
مجھے یقین ہے جب تک ہے یہ دکن باقی
جیئے گی اُردو کہ اُردو کا ہے وطن باقی

بشیر ادارہ کے شعبہ نسواں کی شریک معتمد رہیں ۔ ان کے انتقال پر ڈاکٹر زورؔ نے یہ کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا " اردو شاعری کو کسی نے خیالی نزاکت، کسی نے جذباتی جدّت دی مگر بشیر نے سب سے بڑا احسان کیا ہے۔ اس نے اردو کو شرافت سے نوازا " ۔

اقبال کے فلسفۂ حیات سے متاثر رہیں۔ ان کے اشعار پر اکثر اقبالؔ کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہے۔ شاعری کے ساتھ نثر نگاری کا بھی شوق تھا۔ ان کا شعری مجموعہ " نگینۂ سحر " ادارہ ادبیات اردو نے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا جسن الدین احمد کے الفاظ میں " بندشوں کی دل کشی، خیال کی بلندی، فکر کی گہرائی اور الفاظ کے موزونیت نے اشعار میں ایک خاص رنگِ تغزّل پیدا کر دیا ہے "۔

پادشاہ بیگم صوفی نے مدراس یونیورسٹی سے ایف ۔ اے کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں ۔ فارسی سے شغف تھا اور محبوبیہ گرلز اسکول میں فارسی کی لکچرار تھیں ۔ " تاریخ ہند " کا انگریزی سے فارسی میں ترجمہ بھی کیا ۔ نسوانی محفلوں میں خوب تقریر کرتی تھیں ۔ شہزادی دُرِ شہوار کو اردو سکھانے کے لیے ان کا تقرر ہوا تھا ۔

تسنیم ربانی جامعہ عثمانیہ کی ان پانچ خواتین میں ایک تھیں جنھوں نے پہلی بار ایم ۔ اے میں کامیابی حاصل کی تھی ۔ ایم ۔ اے کے امتحان میں " ظفر کی شاعری " پر بلند پایہ مقالہ قلم بند کیا تھا ۔ کئی برس تک رسالہ " سب رس " میں لکھتی رہیں ۔

وسعتِ نظر اور اسلوبِ بیان میں لطافت کی وجہ سے تحریر دل کش ہوتی تھی۔

محمدی بیگم ۔ ڈپٹی نذیر احمد کی پر نواسی اور قیصر بیگم کی صاحب زادی کو اپنے نانا کی طرح اردو ادب اور مضمون نگاری سے بہت لگاؤ تھا۔ زبان پر قدرت حاصل تھی اور تحریر میں روانی تھی۔ اردو سلیس شستہ اور بامحاورہ لکھتی تھیں۔ انجمنِ خواتینِ دکن کی سکریٹری بھی رہیں اور انجمنِ حیاتِ طیبہ کی سرگرم معاون بھی۔ اچھی مقررہ تھیں۔ محمدی بیگم نے پی۔ ایچ ڈی کے لیے یورپ کا سفر کیا تھا اور اپنا "سفرنامۂ یورپ" رسالہ عصمت میں شائع کیا تھا۔ "تہذیبِ نسواں" "عصمت" "النساء" "سفینۂ نسواں" میں دل چسپ مضامین لکھتی تھیں۔

زبیدہ بیگم یزدانی نے محبوبیہ گرلز اسکول سے سینیئر کیمبرج اعزاز سے کامیاب کیا۔ ان کے اختیاری مضامین فرانسیسی اور لاطینی تھے۔ اردو سے شغف رکھتی تھیں اور اسکول کی میگزین میں لکھا کرتی تھیں۔

عظمت عبدالقیوم کو شاعری سے بہت لگاؤ تھا اور عظمت تخلص کرتی تھیں۔ ان کا کلام بھی ان کے نام ہی کی طرح عظیم اور پاک و صاف تھا۔ "رنگِ گل" اور "نذرِ گل" ان کے پاکیزہ خیالات اور ستھرے ذوق کی غمازی کرتے ہیں۔ "رنگِ گل" پر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے ایوارڈ بھی دیا ہے۔ عظمت کی شاعری کے لیے نیاز فتح پوری لکھتے ہیں "عظمت کی غزلیں عاشقانہ رنگ کی ہیں لیکن نہایت پاکیزہ۔

ان کے اشعار سے ان کی بلند قدرتِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ عظمت کی شاعری پر ان کے تخلص کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔"

عظمت خواتین کی ادبی انجمن "محفلِ خواتین" کی صدر رہی تھیں۔ مضمون نویسی سے بھی دل چسپی تھی۔ رسالہ "عصمت" میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

نمونۂ کلام عظمت عبدالقیوم:

عظمت غمِ حیات کی ہیں اس میں دھڑکنیں
کیوں کر نہ ہو پسند تری شاعری مجھے

o

داغِ دل زخمِ جگر لذّتِ احساسِ الم
پے در پے آپ تو احسان ہی فرماتے ہیں

o

مرے ہر نفس میں رقصاں تری یاد کے اشارے
ترے درد سے عبارت مرے دل کی زندگی ہے

o

کونین کے سینے میں چمکتی ہوئی بجلی
عظمت میرے اشعار کے سانچے میں ڈھلی ہے

o

ہیرہ سعید:

سرزمینِ آگرہ جہاں ایک شہنشاہ کے عزم نے زلفِ ممتاز کے خم میں ایک مقدس

آنسو کو جنم دیا تھا - ایک ایرانی نژاد بی بی نے اصفہانی خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ تہران میں ازدواجی رشتہ سے منسلک ہوئیں اور پھر حیدرآباد کو اپنا وطن بنالیا - یہ ہیں محترمہ بانو طاہرہ سعید۔ تاج محل کے ماحول میں پلنے والی روح کو شاعری ہونا تھا - بانو کا کلام بلند ترین اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ کلام میں سادگی، سلاست اور جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔ فکر و فن کی بلندیاں اور دل نوازی ملتی ہے۔ اکثر اشعار میں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے نظم اور غزل دونوں پر دسترس رکھی ہیں۔ رباعی، قطعے اور سانٹ بھی لکھتی ہیں۔ اردو، فارسی اور ہندی کے حسین امتزاج کو اپنے کلام میں سمو کر اپنا ایک منفرد مقام پیدا کرلیا ہے۔ ایرانی نژاد ہونے کے باوجود اردو سے انھیں بے انتہا پیار ہے اور محمد قلی کے شہر اور چمنِ آصفی میں اردو کو اپنے خونِ دل سے سینچتی رہی ہیں:

ہمارا نام بھی ہے خادمانِ اردو میں
جلائے ہم نے بھی اے طاہرہ سخن کے چراغ

"نگینے" "ہدیۂ طاہرہ" "برگِ سبز" "گلِ خوں چکاں" "آشیاں ہمارا" "مہکتے ویرانے" ان کے شعری مجموعے ہیں۔ "سات دوست" اور "خونِ جگر" نثر نگاری کے نمونے ہیں۔ انگریزی سے اردو میں منظوم ترجمے بھی کیے ہیں جن کا نام "مثبت منفی" ہے۔ "دل شب" فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ ان کے چند شعر پیش ہیں:

نشترِ غم کی چبھن ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کے زخموں میں جلن ہو تو غزل ہوتی ہے
یوں تو ہونٹوں کا تبسم بھی ہے اک شانِ فرح
ان کے ماتھے پہ شکن ہو تو غزل ہوتی ہے

گنگناتا ہے کوئی وجد میں آتا ہے کوئی
محفل اہلِ سخن ہو تو غزل ہوتی ہے

خدیجہ بیگم نورالحسن ڈرامہ نگار تھیں۔ بچوں کے لیے مختلف ڈرامے لکھے اور پیش کیے جن میں "نور جہاں" "تاناشاہ" اور "دسرتھ" قابلِ ذکر ہیں۔ ماڈل پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہ چکی ہیں۔ بچوں کو ڈراموں کے ذریعہ تاریخ سے روشناس کرانے کا ان کا ڈھنگ قابلِ ستائش ہے۔

عہدِ آصفی کی ان قابلِ ذکر خواتین کے علاوہ اس دور کی دیگر خواتین میں خجستہ سلطانہ بیگم، سارہ بیگم، رقیہ بیگم، انیسہ ہارون خاں شیروانی، قیصری بیگم جیسی نندی، پاشاہ بیگم صوفی اور نجمہ سمیع وغیرہ بھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ چند ایک نام میرے علم میں نہ آسکے ہوں جس کے لیے میں معافی کی خواستگار ہوں۔

خجستہ سلطانہ مضمون نگار اور مصنف تھیں۔ "تاریخ ہند کی کہانیاں" اور دوسری کتابوں کی مصنف اور "تاریخِ تیموریہ" ان کی گراں بہا تالیف تھی۔ "عصمت" "خاتون" "افادہ" جیسے رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ مطالعہ وسیع اور خیالات بلند تھے۔

قیصری بیگم ڈپٹی نذیر احمد کی نواسی تھیں۔ عربی زبان پر دسترس حاصل تھی اور لڑکیوں کو عربی پڑھاتی تھیں اور قرآن شریف حفظ کراتی تھیں۔ اردو زبان سے دلچسپی رکھتی تھیں اور مضامین بھی لکھتی تھیں۔

سارہ بیگم رابعہ بیگم کی بہن اور "ماتم سروش" اور "اساس القواعد" کی مصنفہ تھیں۔ رسالہ "افادہ" میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔ فارسی اور عربی کی اچھی قابلیت تھی۔

جیسی نندی جارج نندی کی دختر تھیں۔ محبوبیہ گرلز اسکول سے تعلیم حاصل کرکے مدراس یونیورسٹی سے بی۔اے۔ آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ لندن سے ٹیچرز ڈپلوما حاصل کیا اور محبوبیہ گرلز اسکول میں آپ کا تقرر ہوا۔ ترقی پاکر مہتمہ مدارس نسواں ہوئیں۔ اردو سے خاص شغف تھا۔ اپنے والد کے انگریزی ڈرامے کو اردو میں منتقل کیا تو بمبئی ٹاکیز نے "عزت" کے نام سے اس ڈرامے کو پردۂ سیمیں پر پیش کیا۔ ڈرامہ نگاری سے دلچسپی تھی۔ کئی ڈرامے اردو میں تحریر کیے۔

رقیہ بیگم اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ محبوبیہ اسکول سے سینیر کیمبرج کا امتحان کامیاب کیا اور وہیں معلمہ بھی رہیں۔ شاعری سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ کمتر تخلص کرتی تھیں۔

۱۹۴۸ء سے قبل نجمہ سمیع اللہ شاہ نے لکھا اور خوب لکھا مگر کبھی افسانوں اور ڈراموں کو کتابی شکل میں شائع نہیں کیا۔ "سب رس" "نوجی" وغیرہ میں لکھتی رہیں۔ بمبئی کے آل انڈیا ریڈیو سے ان کے افسانے نشر ہوتے رہے۔ "کرشن چندر" پر ایک مقالہ لکھا اور مخدوم کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی۔ طرز بیاں شگفتہ اور سلجھا ہوا ہوتا تھا۔ ایک دل پسند مصنفہ ہیں لیکن ادبی دنیا میں اب کم نظر آتی ہیں۔

ہندو خواتین نے بھی اُردو ادب کو اپنے خیالات سے مزین کیا ہے جن میں مسز برکت رائے، رتن کندن لال، تلسی اننت رام اور شیل بالا قابلِ ذکر ہیں جن کا مختصراً ذکر کردوں۔

رتن بنارس سے حیدرآباد آئیں۔ گھر کا ماحول خالص علمی تھا۔ محل پورہ اسکول سے تعلیم پانے کے بعد زنانہ سٹی ہائی اسکول سے بی اے بی ایس سی اور ایم ایس سی کیا۔ فنونِ لطیفہ اور شاعری کا بے حد شوق تھا۔ غزل اور نظم دونوں لکھتی رہیں۔ ان کی شاعری میں آمد تھی۔ تحریر سادہ اور موثر تھی۔

مسز برکت رائے نے گھر ہی پر اُردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم پائی۔ ملکی سماجی کاموں سے دلچسپی کے علاوہ مضمون نگاری اور شاعری بھی ان کے محبوب مشغلے رہے۔

بچّوں کے لیے بھی نظمیں لکھتی رہیں۔ نظموں کا مجموعہ "بچّوں کے بتاشے" بچّوں میں مقبول رہا۔

تلسی کشمیر سے جب حیدرآباد آئیں تو یہیں بس گئیں۔ تعلیم اردو، ہندی اور انگریزی میں ملی۔ اس کے بعد یونہ مشن اسکول میں شریک ہوئیں لیکن گھر پر اردو فارسی جاری رہی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ تلسی کو اردو ادب اور شاعری کا خاص ذوق تھا۔ چھوٹی بحر میں بھی لکھتی تھیں نمونہ ہے:

سجدۂ شوق کو کیا قیدِ مقام
کرلیا سجدہ جدھر یاد آیا
کس قدر آنکھ سے نکلے آنسو
جب بھری شام کو گھر یاد آیا

شیل بالا حیدرآباد کے کوی راج کنول پرشاد کنول کی شریکِ حیات ہیں۔ آگرہ کی تھیں لیکن اندور میں ابتدائی تعلیم پائیں۔ بنارس یونیورسٹی سے بی اے بی ٹی کر کے حیدرآباد آئیں۔ اردو ہندی میں افسانے اور نظمیں لکھتی رہیں۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد کی نشرگاہوں سے ان کی تخلیقات نشر ہوتی رہیں۔ شاعری سلیس اور ستھری ہے۔ ان کی ایک نظم "کس کو بھولوں کیا یاد کروں" ہندوستانی شاعری کا رسیلا نمونہ ہے۔

جامعہ عثمانیہ نے جن خواتین ادیب اور شعرا کو اردو زبان و ادب کی خدمت گزاری کے لائق بنایا۔ ان میں نوشابہ بیگم نوشابہ، جہاں بانو نقوی، لطیف النساء بیگم نعیم النساء بیگم، نجم النساء، قمر النساء، تصدق فاطمہ پنجتن، زینت ساجدہ، رفیعہ سلطانہ وحیدہ نسیم، فاطمہ عالم علی اور سلطانہ شرف الدین قابلِ ذکر ہیں۔ نئی نسل کی لکھنے والیوں میں آمنہ ابوالحسن، عفت موہانی، رفیعہ منظور الامین اور راقم الحروف ہیں۔

ان خواتین کے کلام و نثر میں قدیم معاشرت کی عکاسی بھی ملتی ہے اور جدید خیالات کی ترجمانی بھی۔ عشق و محبت کی داستانوں اور گل و بلبل کی حکایات میں شیریں بیانی اور جدت آفرینی ملتی ہے تو طرزِ جدید کی نثرنگاری اور شاعری میں ملک و قوم کو بیدار کرنے اور نئی منزلوں کو ڈھونڈنے کے پیام ملتے ہیں۔ ان میں غزل بھی ہے، تصوف بھی۔ یاس و حرمان کی تصویریں بھی ہیں اور سرور و مسرت کے نغمے بھی۔ بلند خیالی، سادگی، ندرت و نزاکت ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔

ان سب خواتین کا مختصراً ذکر کرتی چلوں۔

نوشابہ خاتون نوشابہ امروہہ میں پیدا ہوئیں پھر حیدرآباد آئیں۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پہ ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی اے کیا۔ جامعہ کی پہلی گریجویٹ تھیں۔ گریجویشن کے بعد زنانہ کالج میں عربی، فارسی اور انگریزی کی لیکچرار بنیں۔ زندگی ان کے نزدیک ایک نغمہ اور سرودِ حیات ایک آہِ دل سوز ہے۔ مناظرِ قدرت کی عاشق تھیں۔ شاعری کا ذوق رکھتی تھیں۔ کلام میں سادگی اور سلاست تھی۔ غزلیں کم لکھتی تھیں۔ نظم کو نئے سانچوں میں ڈھالتی رہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "موجِ تخیل" ہے۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے:

میر عثمان علی شہر یارِ دکن　　شاد و آباد رہیں تاجدارِ دکن
رہے تازہ خدایا بہارِ دکن　　رہے آباد یارب دیارِ دکن
ایک خلقت ہو کیوں نہ نثارِ دکن
رشکِ عالم بنا ہے دیارِ دکن

عدل پرور، مدبر ہیں اور مہرباں　　ایسا دیکھا کسی نے بھی ہے حکمراں
محوِ دل سے ہوا عدلِ نوشیرواں　　ہے دعا یہ ہماری خدائے جہاں
میر عثمان علی شہر یارِ دکن
شاد و زندہ رہیں تاجدارِ دکن

حاتمِ وقت ہیں وہ فریدوں حشم　　بحرِ فیضِ اتم حسن کا دست کرم
میر عثماں ہے فخرِ شہانِ عجم　　عہد میں جن کے بلدہ ہے رشکِ ارم
میر عثمان علی شہر یارِ دکن
شاد و زندہ رہیں تاجدارِ دکن

شہ کی ہمت پہ صد مرحبا مرحبا	یعنی بابِ حکومت کی ڈالی بنا
بن گئی، یاں بھی عثمانیہ کلیہ	کیوں نہ مانگے یہ ساری رعایا دعا

میر عثمان علی شہریارِ دکن
شاد و زندہ رہیں تاجدارِ دکن

داد خواہوں کو یاں دادِ نصفت ملی	یعنی نوشیروانی عدالت ملی
دردمندوں کو حق کی حمایت ملی	دولتِ علم، شہ کی بدولت ملی

میر عثمان علی شہریارِ دکن
شاد و زندہ رہیں تاجدارِ دکن

کر دعا دل سے نوشابہ خستہ تن	خالقِ دو جہاں اے خدائے زمن
اس جہاں میں ہے جبتک بقائے سخن	تیری رحمت رہے شہ پہ سایہ فگن

میر عثمان علی شہریارِ دکن
شاد و زندہ رہیں تاجدارِ دکن

دے ترقی خدا ملک و مال میں	کوئی ہمسر نہ ہو شان و اجلال میں
شہ ثانی نہ ہو جاہ و اقبال میں	ہر گرہ پر بڑھے عمر ہر سال میں

میر عثمان علی شہریارِ دکن
شاد و زندہ رہیں تاجدارِ دکن

جہاں بانو نقوی رائچور کے ایک ضلع میں پیدا ہوئیں۔ نامپلی گرلز اسکول سے میٹرک اور جامعہ عثمانیہ سے بی اے کیا۔ گیرزائی اسکول میں اردو پڑھاتی رہیں۔ پھر محبوبیہ گرلز اسکول میں منتقل ہوئیں۔ اور اسی زمانے میں ایم اے کیا اور زنانہ کالج

کے شعبۂ اردو میں لیکچرار بنیں۔

لکھنے کا شوق طالب علمی سے تھا۔ "شہاب" "ساقی" وغیرہ میں لکھتی رہیں۔ ان کی کتابیں "رفتارِ خیال" "فتراک" "بربطِ ناہید" (جو خطوط نویسی کا بہترین نمونہ ہے) اور "محمد حسین آزاد" قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ انگریزی افسانوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ ہر قسم کے موضوعات پر طبع آزمائی کرتی رہیں۔ نثر میں شاعری کرتی تھیں اور شاعری کا بھی بہت اچھا ذوق تھا۔ تشبیہیں اچھوتی، استعارے نازک ہوتے تھے اور عبارت دل کش اور دل آویز۔ نئی نسل کی لکھنے والیوں کی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔ "سب رس" کے شعبۂ خواتین کی مجلسِ عاملہ میں رکن کی حیثیت سے کام بھی کرتی رہیں۔ علمی اور ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔

لطیف النساء بیگم نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے حاصل کیا۔ شاعرہ اور انشا پرداز تھیں۔ نسوانی دنیا کی تہذیبی خرابیوں کو درد بھرے پیرائے میں قلم بند کرتی تھیں۔ "شہاب" "رہبرِ دکن" اور "پیام" میں ادبی اور تاریخی مضامین لکھتی رہیں۔ "سب رس" میں بچوں کے لیے اصلاحی اور علمی نظمیں لکھیں۔ "ولی کا تخیل" ان کا ادبی شاہ کار ہے جو تاریخِ ادبیات میں یادگار رہے گا۔ "سب رس" کے شعبۂ نسواں میں مجلسِ عاملہ کی رکن بھی تھیں۔ بلند پایہ مقرر تھیں۔ مجالسِ امام حسین میں ذکر بھی کرتی تھیں۔ اندازِ بیان پُرجوش ہوتا تھا۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ بھی رائچور میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کیا اور زنانہ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئیں۔ اردو کالج، پوسٹ گریجویٹ کالج اور آرٹس کالج میں بھی پڑھاتی رہیں۔ نظام کالج کے شعبۂ اردو میں ریڈر رہیں۔

ان کی تعلیمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے شاگردوں نے 1981ء میں جشنِ زینت ساجدہ بھی منایا تھا۔ انھیں ۱۹۸۰ء میں بہترین ٹیچر کا ایوارڈ حکومت ہند کی طرف سے عطا ہوا ہے۔

علم و ادب کا ستھرا ذوق رکھتی ہیں۔ مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ ان کے طنزیہ اور سنجیدہ مضامین، خاکے اور افسانے مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں دکھنی ادب میں ماہر ہیں۔ اشرف بیجاپوری کی "نوسرہار" پر جس محنت، لگن اور انہماک سے انھوں نے تحقیق کا کام کیا ہے اس کے صلے میں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی ہے۔

زینت ساجدہ کی کتاب "حیدرآباد کے ادیب" حصہ اوّل و دوّم مصنفین و شعرا کی سوانحی خاکے، اور ان کی تحریر کے نمونے ہیں جسے ساہتیہ اکیڈمی نے شائع کروایا ہے۔ ان کی تصانیف میں "جلترنگ" افسانوں کا مجموعہ ہے۔ "محبّ وطن خواتین" اور "بہادر عورتیں" بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ "کلیاتِ بحری" ہندی میں اور ہندی کے ۹ رتن" اور "تلگو ادب کی تاریخ" راما نوجا راؤ کے تعاون سے شائع ہو چکی ہیں۔ انداز بیاں شگفتہ اور دل آویز ہوتا ہے۔ ریڈیو سے بھی ان کی تقاریر نشر ہوتی رہی ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی کی رکن بھی ہیں اور انجمن ترقی اردو کی اراکین عاملہ میں شریک ہیں۔ کل ہند اردو کانفرنس کی سکریٹری بھی رہ چکی ہیں۔ اردو ہال کی مختلف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں۔ مصنفین اور شاعروں کے مجموعوں پر دیباچے اور پیش لفظ بھی لکھتی ہیں۔ حیدرآباد کی مانی ہوئی ادیبہ ہیں۔

رفیعہ سلطانہ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر زور

کی شاگرد رہ چکی ہیں۔ طالب علمی سے لکھنے کا شوق تھا۔ مختلف رسالوں میں لکھتی رہیں۔ دکھنی ادب پر تحقیق اور تنقیدی کام کرتی رہیں اور علمی، ادبی تنقیدی مضامین لکھتی رہیں۔

ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد زنانہ کالج میں فارسی کی لکچرار ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ اُردو رہیں پھر ڈین فیکلٹی آف آرٹس مقرر ہوئیں۔ جامعہ کی تخلیقی سرگرمیوں میں پیش پیش رہیں۔ "کچے دھاگے" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کی کتاب "اردو نثر کا آغاز وارتقاء۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے" پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ "اردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصہ" "کلمات الحقائق" اور کلیاتِ احسان" ان کی تحقیق پر مبنی کتابیں ہیں۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "فن اور فن کار" ہے۔ "حیدرآباد فرخندہ بنیاد" پر انھوں نے کتاب لکھی ہے۔ کئی ریسرچ اسکالرز ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کر چکی ہیں۔ "دودِ چراغِ محفل" ان کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔

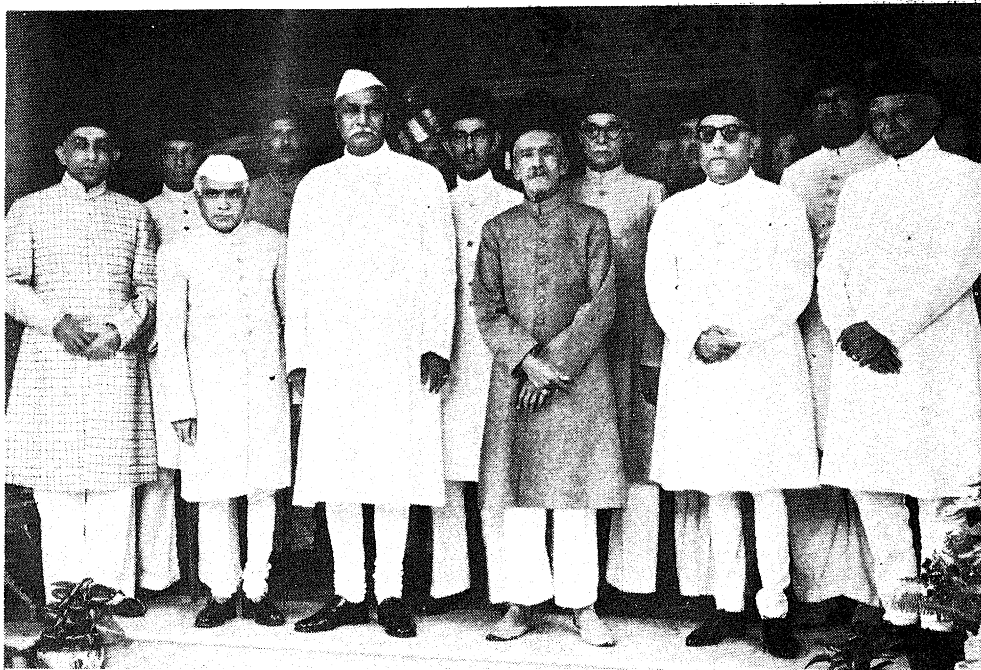
سلطانہ شرف الدین نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان جامعہ عثمانیہ سے بی اے بی ایڈ اور ایم اے ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ "شہاب" "رومان" "سب رس" اور مجلہ عثمانیہ میں افسانے اور مضامین چھپواتی رہیں۔ ڈاکٹر زور کی ایما پر بچوں کے لیے "نظیر اکبرآبادی" پر کتاب لکھی۔ "فن تعلیم" پر کئی چھوٹے چھوٹے مضامین مختلف اخباروں میں شائع ہوئے۔ "خواجہ حسن نظامی" پر حال ہی میں ایک مضمون "آج کل" میں چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ آغا حیدر حسن پر لکھے گئے انگریزی مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ ملک راج آنند کی کہانیوں



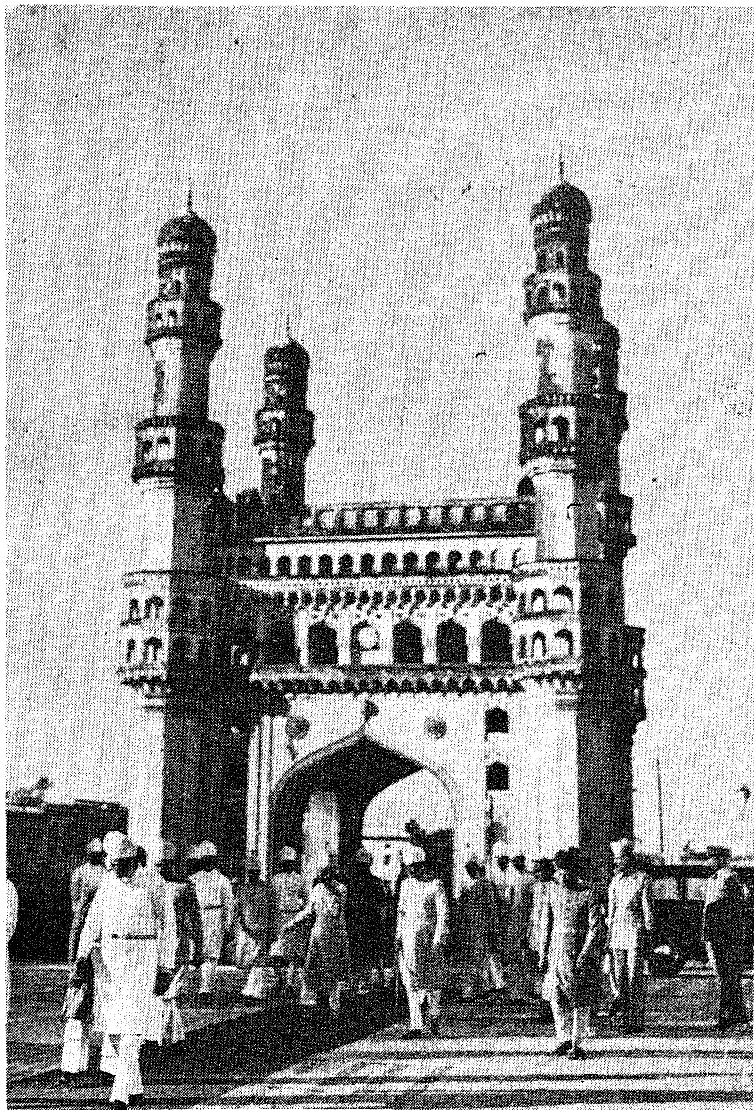
میر عثمان علی خاں آصف سابع اپنے امرا کے ساتھ۔ تصویر میں
مہاراجہ کشن پرشاد، افسر الملک دیکھے جا سکتے ہیں ۱۹۳۲ء



کنگ کوٹھی میں لنچ ۔ شہزادہ مکرم جاہ، شہزادی پاشاہ، بھیم سین سچر گورنر، شہزادہ مفخم جاہ، شہزادی درِ شہوار ۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۵۸ء



کنگ کوٹھی میں لنچ ۔ آصف سابع کے ساتھ ڈاکٹر راجندر پرشاد، صدرِ جمہوریہ ہند۔ زین یار جنگ
آعظم جاہ بہادر ۔ دین یار جنگ ۔ آصف سابع ۔ علی پاشاہ۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد
بی۔ رام کشن راؤ وزیر اعلیٰ ۔ معظم جاہ بہادر ۲۹ رجون ۱۹۵۵ء



آصف سابع چارمینار کے سامنے اپنے امرا کے ساتھ

۲۱ رفروری ۱۹۴۸ء

کے ترجمے بھی کیے۔ شاعری کا شوق رہا اور ترنم سے شعر پڑھتی رہیں۔ ایک صاحبِ طرز ادیبہ ہیں۔ لیکن لکھنے میں تساہل برتتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں اور مضامین کی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہ آسکی۔

ملازمت کی ابتدا پرائمری اسکول سے کی۔ پھر ہائیر سکنڈری اسکول اور اس کے بعد COMPREHENSIVE COLLEGE OF EDUCATION میں اُردو طریقہ تعلیم لیکچرار مقرر ہوئیں۔ چادر گھاٹ کالج فار ووئمن کی ہیڈ مسٹریس بھی رہیں۔ فی الحال چھوٹے بچوں کے لیے "دیا دیپ" اسکول چلا رہی ہیں۔

فاطمہ عالم علی جناب عبد الغفار صاحب جرنلسٹ اور ایڈیٹر "پیام" کی صاحبزادی ہیں جن کا تعلق مراد آباد سے تھا۔ تعلیم لکھنو میں ہوئی۔ پھر زنانہ کالج (جامعہ عثمانیہ) سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا (۱۹۴۵ء) اردو ادب سے موروثی لگاؤ رہا۔ چنانچہ مضامین، انشائیے اور خاکے لکھتی رہیں۔ مختلف رسائل میں انھوں نے اپنے رشحاتِ قلم چھپوائے۔ ۱۹۸۹ء - ۱۹۹۰ء میں "یادش بخیر" کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اندازِ بیان شستہ ہے۔ زبان پر لکھنو کا گہرا اثر ہے۔ دلچسپ اور حسین پیرائے میں لکھتی ہیں۔ محفلِ خواتین کی معتمد ہیں۔ ویمنس انڈسٹریل کوآپریٹیو سوسائٹی کی نائب صدر اور ویمنس فیڈریشن کی اسکریٹری ہیں۔

وحیدہ نسیم ریاست حیدرآباد کے تاریخی اور متمدن خطہ اورنگ آباد کے علم پرور گھرانے کی پیداوار ہیں۔ پیدا حیدرآباد میں ہوئیں لیکن پالن پوسن اورنگ آباد کے آٹولہ باغ کے پُرشفقت ماحول میں ہوئی۔ تعلیم حیدرآباد میں ہوئی تربیت اورنگ آباد میں۔ ۱۹۳۹ء سے شاعری کی ابتدا کی۔ زنانہ کالج جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۴۷ء میں بی ایس سی میں کامیابی حاصل کرکے ۱۹۴۸ء میں ایم۔ایس۔سی میں داخلہ لیا اور تحصیلِ تعلیم ختم ہونے پر ۱۹۵۲ء میں کراچی چلی گئیں۔ وہاں گورنمنٹ کالج کراچی میں نباتات کی لکچرار مقرر ہوگئیں اور ۱۹۸۰ء میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں پرنسپل ہوگئیں۔

وحیدہ نسیم نے اپنا تعارف یوں کیا ہے:

میں لعل ہوں یمن کا نہ موتی عدن کا ہوں
اک ذرۂ حقیر میں خاکِ دکن کا ہوں
مجھ کو بھلا سکوگے نہ تم اہلِ گلستاں
ٹوٹا ہوا میں پھول تمھارے چمن کا ہوں

وحیدہ نسیم ایک اچھی شاعرہ، ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ تحقیق ان کی نگارشات کا نمایاں پہلو ہے اور ان کی تازہ تصنیف "اورنگ آباد ــ ملک عنبر سے عالمگیر تک" ان کی اسی دلچسپ تحقیق کا ثمرہ ہے۔ ۱۹۸۷ء میں "شاہانِ بے تاج" خلد آباد کے اولیائے کرام پر کتاب تصنیف کی ہے۔

نعیم النساء بیگم جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرکے زنانہ مدرسہ فوقانیہ

میں معلمہ رہیں۔ مولانا شبلی پر مقالہ لکھا۔ ان کی تحریر اور اسلوب بیان شگفتہ ہوتا تھا۔

نجم النساء بیگم کی تعلیم کا آغاز نامپلی زنانہ اسکول سے ہوا پھر جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے سرکاری وظیفے پر یورپ روانہ ہوئیں "نذر ولی" ان کا دل چسپ مقالہ تھا۔

تصدق فاطمہ پنجتن ۔ غلام پنجتن کی صاحب زادی اور سراج یار جنگ کی پوتی تھیں ۔ گو تاریخ اختیاری مضمون تھا مگر فارسی اور اردو سے دل چسپی رکھتی تھیں۔ شاعری اور مضمون نگاری کا شوق تھا۔ ان کی تحریر میں لطافت ہوتی تھی۔

رضیہ بیگم نے علمی ماحول میں پرورش پائی ۔ اختر حسن جوائنٹ مدیر "پیام" کی بہن ہیں ۔ اردو انگریزی اور فارسی سے دل چسپی رکھتی ہیں ۔ مختلف رسالوں میں افسانے اور مضامین لکھتی رہیں ۔ اسلوب بیان پسندیدہ ہوتا ہے ۔ زنانہ کالج میں لکچرار بھی رہیں۔

ممتاز جہاں بیگم ۔ زنانہ کالج سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا اور سیاسیات کی لکچرار مقرر ہوئیں ۔ مضمون نگاری سے دل چسپی رہا ۔ 'سب رس' 'شہاب' وغیرہ رسالوں میں مضامین لکھتی رہیں ۔

عفت موہانی کا تعلق لکھنؤ سے ضرور ہے مگر رہتی ہیں حیدرآباد میں۔ نسوانی رسائل میں مضامین اور ناول لکھتی رہتی ہیں۔ متعدد ناول قسط وار رسالہ "حریم" لکھنؤ کے سالنامے سے شائع ہونے کے بعد نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ۲۴ - ۲۵ ناول لکھ چکی ہیں جن میں "درد آشنا" "شرارت" "داغ دل" اور "آہوں کے گیت" شامل ہیں۔

رفیعہ منظور الامین ناول نگار اور ڈرامہ نویس ہیں۔ ان کی قلمی کاوشیں مختلف رسالوں کی زینت بن چکی ہیں۔ اور ریڈیو پر بھی پیشکش ہوتی رہی ہیں۔ انداز بیان سلجھا ہوا اور شگفتہ ہے۔

رفیعہ نے زنانہ کالج عثمانیہ یونیورسٹی سے BSC کیا۔ فائن آرٹس کالج سے پینٹنگ اور مجسمہ سازی کی ٹریننگ حاصل کی۔ سائنس کے موضوع پر بھی انھوں نے کتاب لکھی جسے ناگپور یونیورسٹی نے BSC کے نصاب میں داخل کیا ہے۔ تقریباً ۳۰ برسوں سے افسانوں اور ناولوں کی دنیا میں جانی پہچانی جاتی ہیں۔ اب تک ۳ ناول اور کئی کہانیاں لکھ چکی ہیں جن کا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ یوپی اکیڈمی اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے ایوارڈز بھی حاصل کیے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی انھوں نے ڈرامے لکھے، جو دلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور جالندھر کے نشر و اشاعتی کیندروں سے پیش کئے گئے ہیں۔ ان کے ناول "عالم پناہ" کو ۱۳ قسطوں میں "فرمان" کے نام سے پیش کیا گیا۔

ناشکری ہوگی اگر مرحوم نصیر الدین ہاشمی کا نام نہ لوں جنھوں نے خواتینِ دکن کے ادبی کارناموں کو اپنی کتاب " خواتینِ دکن کی اُردو خدمات " کے ذریعے دنیائے ادب سے روشناس کرایا اور ان کی ادب نوازی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔

عہدِ آصفی میں علم و ادب میں دکن کی خواتین نے جو اہم رول ادا کیا ہے جو ادبی، سماجی اور تہذیبی خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخِ زبانِ اردو اور تاریخِ دکن کا روشن باب ہے ۔

دکن کے نسوانی ادارے

عہدِ عثمانی طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت کے لیے سلطان العلوم کی علم پرور حکومت نے جو اقدامات کیے اور تعلیم نسواں کے سلسلے میں خود دکن کی خواتین نے اصلاحِ معاشرت و تمدن کی جو کوششیں کیں تاریخِ دکن اسے بھلا نہیں سکتی۔

عثمان علی خاں نے جب عنانِ سلطنت سنبھالی، ریاست میں ۹۱ مدارس تھے جن میں ۶۳۴۶ لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں لیکن عہدِ عثمانی میں ان مدارس کی تعداد بڑھ کر ۷۳۶ ہو گئی جن میں تقریباً ۵۵ ہزار لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ان مدارس میں تحتانیہ، وسطانیہ اور فوقانیہ مدارس شامل تھے جن پر ۹ ½ لاکھ کا صرفہ آتا تھا۔ سال ۱۹۴۱ء کے اعداد و شمار کے لحاظ سے حیدرآباد میں دورِ عثمانی میں ۱۲ سرکاری کالج کھلے، ۱۵ امدادی انگریزی میڈیم اسکول، ۷ سرکاری فوقانیہ عثمانیہ اسکول، ۴ زنانہ امدادی انگریزی اسکول، ۲ امدادی فوقانیہ عثمانیہ اسکول اور ۵ مذہبی مدارس۔

چند سرکاری، امدادی اور خانگی نسوانی مدارس میں، مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی اردو میڈیم (سرکاری) محبوبیہ زنانہ اسکول جس میں انگریزی میڈیم تھا اور لڑکیاں سنیئر کیمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کالجِ اناث میں داخل ہوتی تھیں۔ اس کی پرنسپل مس گریس لینل تھیں۔ اس اسکول میں مصوری، دست کاری، موسیقی، پکوان، خانہ داری اور تیمارداری کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اس کے علاوہ

جمناسٹک اور دوسرے کھیلوں کا بھی انتظام تھا۔ یہاں حیدر آباد کے معزز گھرانوں کی لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔ اور ہندوستانی استانیوں کے علاوہ انگریزی ٹیچرز بھی ہوا کرتی تھیں۔ مس میری نندی مددگار پرنسپل تھیں۔ مس والش اور مس اسٹرین انگریزی کے لیے مقرر تھیں۔

۱۸۹۵ء میں اسٹینلی گرلز اسکول کی بنیاد مس ایونز نے رکھی۔ اس کی عمارت کا افتتاح نواب صاحب چھتاری صدرِ اعظم حکومت نے کیا تھا۔ یہاں بھی ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا۔

سینٹ جارج گرلز اسکول اور سینٹ انیز کانونٹ اور کیز ہائی اسکول انگریزی میڈیم کے اسکول تھے۔ یہ چاروں اسکول امدادی تھے۔

ایک ماڈل پرائمری اسکول محلہ حیدرگوڑہ میں قائم کیا گیا تھا جہاں لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا انتظام تھا۔ اس میں مانٹیسری اور فروبل طریقۂ تعلیم سے بچوں کو کھیل کھیل میں اور چیزوں کے مشاہدے سے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ ڈرامسٹکس، دست کاری، باغبانی کے ساتھ شہر کے مختلف اداروں، فیکٹریوں مثلاً گلاس فیکٹری، بسکٹ فیکٹری اور تاریخی مقامات کی سیر کرائی جاتی تھی اور بچوں کو اس کے متعلق لکھنے کہا جاتا تھا۔ محترمہ خدیجہ بیگم کے ڈراموں میں بچے اداکاری کرتے اور ان کی اس صلاحیت کو بڑھانے کا موقع ملتا۔ ان تاریخی ڈراموں کے ذریعے بچے اپنی تاریخ سے واقف ہو جاتے تھے۔ باغبانی میں بچے اپنے ہاتھوں سے پھول اور ترکاری اُگاتے اور کھلی فضا میں قدرت کے نظارے سے مستفید ہوتے۔ ساتھ ہی جسمانی ورزش اور کھیل کود کے لیے جناب محمد امجد علی تعال صاحب

کی خدمات حاصل تھیں۔ مس ڈوراننڈی، مس مریم غنی، امیر النساء بیگم، عزیز اللہ خاں درانی، مس کیپرال اور مسز کیمرن اس اسکول سے وابستہ تھیں۔ غوثیہ بیگم مسز جمال الدین اور زہرہ بیگم سید اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہ چکی ہیں۔ نواب مہدی یار جنگ مدار المہام کے زمانے میں مہتمم تعلیمات سید علی اکبر کی کوششوں سے یہ اسکول وجود میں آیا تھا۔

کلیۂ اناث طبقۂ نسواں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے سلطان بازار کے احاطہ میں رزیڈنسی کی عمارت میں قائم کیا گیا جس میں سرسبز باغ اور ہریالی اور پھلواری لڑکیوں کا استقبال کرتی اور ہر سال لڑکیاں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرتیں۔ یہ کالج ویمنس کالج یا زنانہ کالج کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لڑکیاں یہاں سے جامعہ عثمانیہ بھی جاتی تھیں۔ یہاں اردو میں تعلیم دی جاتی تھی جس کا سب سے بڑا مقصد اردو زبان کو ترقی دینا تھا۔

ساتھ ہی کئی علمی ادارے اور انجمنیں قائم ہوئیں۔ ۱۹۲۷ء میں انجمنِ ترقی تعلیم و تمدن نسواں کا ادارہ قائم ہوا۔ بیگم ولی الدولہ اس کی صدر اور مسز رستم جی فریدوں جی اس کی نائب صدر تھیں۔ ان دونوں کی سرپرستی میں یہ انجمن ترقی کرتی گئی۔ اس انجمن کا مقصد تھا لڑکیوں میں اشاعتِ تعلیم، اصلاحِ معاشرت، رسم و رواج، نادار غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف جاری کرنا اور زنانہ مدارس کی نگرانی اور امداد کرنا۔ شہر کے بیچ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک اقامت خانہ یا ہوسٹل قائم ہوا جس میں حیدرآباد کی مقامی طالبات کے علاوہ بیرونی طالبات بھی قیام کر سکتی تھیں۔

ایک دار المباحثہ کی بنیاد ڈالی گئی جس میں خواتین کے تقریری مقابلے ہوتے اور

ان کی تقریری قابلیت کو اجاگر کیا جاتا ۔ خواتین کو ان کے حقوق و فرائض، ان کی صحت اور تندرستی اور قانونی دشواریوں کے ضمن میں لکچر دیے جاتے اور مدد کی جاتی تھی ۔ اس انجمن کو کل ہند خواتین کی کانفرنس کی کمیٹی نے حیدرآبادی خواتین کی نمائندہ انجمن تسلیم کیا تھا ۔

انجمن خواتین دکن مسز صغرا ہمایوں مرزا کی صدارت میں قائم ہوئی ۔ سرپرست رانی شام راج تھیں ۔ اس کے مقاصد میں ہر مذہب و ملت کی غریب اور شریف خواتین کی امداد، ان کی شادی، تعلیم، بیوہ عورتوں اور نادار لڑکیوں کو دستکاری سکھانا، معذور عورتوں کو ماہانہ وظائف جاری کرنا، فضول رسم و رواج کو ترک کرنا اور صنعت و حرفت کی تعلیم دینا شامل تھا ۔

زنانہ کلب ، حیدرآباد اور سکندرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین کے لیے ایک کلب قائم کیا گیا جس میں مختلف قسم کے کھیل اور تفریحات کا انتظام تھا ۔ اس کی روح رواں تھیں طیبہ بیگم خدیو جنگ اور لیڈی سر اکبر حیدری ۔

محترمہ طیبہ بیگم خدیو جنگ نے ایک لیڈیز ایسوسی ایشن کلب کی بھی بنیاد ڈالی جس کی صدر لیڈی حیدری تھیں ۔ اس کلب کے ذریعے ہر سال دو طلائی تمغے انگریزی اور اردو کی طالبات کو امتیازی درجہ میں کامیابی حاصل کرنے پر دیے جاتے تھے ۔ غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف بھی ملتے تھے ۔ خواتین تقریری مقابلوں میں حصہ لیتیں اور کھیلوں کے ذریعے صحت مند فضا بناتیں ۔

لیڈیز ریکریشن کلب : رانی شام راج اس کی صدر تھیں ۔ اس میں مختلف تفریحات کے علاوہ تیراکی کا بھی انتظام تھا ۔

گرل گائیڈ کی تحریک سے لڑکیوں میں خود اعتمادی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ زخمیوں کی تیمار داری بھی اس میں شامل تھی۔

حیدرآباد کے خانگی ادارے قوم پرست تعلیم یافتہ اور باہنر خواتین نے اپنی سرپرستی میں اپنی غریب بہنوں کے لیے کارآمد ادارے کھولے۔

محترمہ سکینہ بیگم رحمت اللہ قادری نے ایک خانگی اسکول اپنے مکان واقع جاگیردار کالج پر ملازمین کی لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیا۔ جس میں سلائی اور کشیدہ کاری کی تعلیم خود وہ دیتی تھیں۔ ان کی سلی ہوئی چیزوں کو فروخت کرواکر اس کی اجرت ان لڑکیوں اور عورتوں کو دلوائی جاتی تھی۔

مسز امیر حسن نے نادار عورتوں کو سلائی اور آئینہ کا کام سکھانے کے لیے اپنے گھر پر ایک ادارہ کھولا۔

مس تندی نے اپنے گھر پر چھوٹے بچوں کے لیے ایک اسکول کھولا۔ جو ان کی وفات تک قائم رہا۔

مس میری نندی اور مس سنہ لتا جیٹو یا دیہ نے مل کر ایک ادارہ N.C.O.I EDUCATIONAL INSTITUTE کے نام سے کھولا جو آج بھی حیدرگوڑہ میں مسز دہاب کے تحت کام کر رہا ہے۔ یہاں سے میٹرک کے امتحان کے لیے لڑکیوں کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھجوایا جاتا تھا۔

انجمن خواتین اسلام کے نام سے محترمہ طیبہ بیگم خدیو جنگ نے مسلم لڑکیوں کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جسے ان کے انتقال کے بعد ان کی دو صاحبزادیاں معصومہ بیگم حسین علی خاں اور سکینہ بیگم رحمت اللہ آخری دم تک اپنی نگرانی میں چلاتی رہیں۔

مخطم جاہی مارکٹ اسکول کے نام سے ایک ادارہ غریب لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کھولا گیا۔ جسے حکومت کی امداد حاصل تھی ۔ اس ادارے کا کام محترمہ سکینہ بیگم ہی سنبھالتی تھیں۔ اس کی کمیٹی پر شہر کی چند تعلیم یافتہ خواتین کا انتخاب کیا گیا تھا۔ آج یہ اسکول شہر کا سب سے بڑا اسکول بن گیا ہے جس میں شہر کی غریب لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ مریم زمانی اسکول کی ہیڈ مسٹرس رہتی ہیں

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جب ادارہ ادبیات اردو قائم کیا تو اس کے شعبۂ نسواں کے لیے محترمہ رابعہ بیگم، محترمہ جہاں بانو نقوی، محترمہ سارہ بیگم محترمہ سکینہ بیگم اور محترمہ لطیف النساء بیگم کے ناموں کا انتخاب عمل میں آیا۔

محترمہ طیبہ بیگم باقر علی خاں نے لڑکیوں کے لیے صنعت و حرفت کا مدرسہ کھولا جہاں کئی طالبات آتی تھیں۔

اس طرح دکنی خواتین میں بیداری اس درجہ آچکی تھی کہ انھوں نے خود اپنے طبقے کی بہبودی کے لیے مختلف کارہائے نمایاں انجام دیے اور ترقی کی اس رفتار نے خواتین کے مستقبل کو روشن تر کر دیا۔

حیدرآباد دکن نے جہاں تحریر میں خواتین کی گل کاریاں دکھائیں وہیں خطیب اور مقررین بھی پیدا ہوئے جو اپنے الفاظ کا جادو جگاتی رہیں۔ ان میں قابل ذکر خواتین کے نام یہ ہیں:

بیگم بہادر یار جنگ، بیگم نواب زین یار جنگ، بیگم نواب غوث یار جنگ، بیگم نواب مہدی یار جنگ، لیڈی ہاسکر، مسز امیر حسن، مسز عبرو جیہ، مسز معصومہ حسین علی خاں جو آندھرا پردیش میں ممبر آف پارلیمنٹ کے فرائض انجام دیتی رہیں۔

مسز سکینہ بیگم رحمت اللہ، مسز رستم جی، مسز صغرا ہمایوں مرزا، مس نندی مسز نورالحسن اور بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو جو انگریزی میں شاعری کرتی تھیں لیکن دھواں دھار تقریر کرتی تھیں اور دونوں زبانوں یعنی انگریزی اور اُردو پر مہارت حاصل تھی۔

حوالے:

۱۔ جناب نصیر الدین ہاشمی "عہدِ عثمانی میں خواتین کی تعلیمی ترقی" ص ۲۷۵
۲۔ مرزا سیف علی خاں مرقع دکن (مرتبہ سید محی الدین قادری زور)
۳۔ صمصام شیرازی کون کیا ہے

وزرائے اعظم حیدرآباد[۱]

نام وزرا	تاریخ سرفرازی
۱۔ راجہ رگھوناتھ داس بہادر	۱۱۶۳ھ
۲۔ سید لشکر خان رکن الدولہ بہادر	۱۱۶۵ھ
۳۔ سید شہنواز خاں صمصام الدولہ بہادر	۱۱۶۷ھ
۴۔ نواب بسالت جنگ بہادر	۱۱۷۰ھ
۵۔ راجہ پرتاب ونت بہادر	۱۱۷۳ھ
۶۔ احتشام جنگ رکن الدولہ بہادر	۱۱۷۷ھ
۷۔ نواب ارسطو جاہ بہادر	۱۱۹۵ھ
۸۔ میر عالم سید ابوالقاسم بہادر	۱۲۱۹ھ
۹۔ نواب میر سعادت علی خاں غیور جنگ شجاع الدولہ منیر الملک بہادر	۱۲۲۴ھ
۱۰۔ راجہ چندو لعل بہادر	۱۲۴۸ھ
۱۱۔ نواب سراج الدولہ سراج الملک بہادر	۱۲۶۲ھ
۱۲۔ نواب امجد الملک بہادر	۱۲۶۴ھ

۱۔ یادگار سلور جوبلی آصف سابع "جشن عثمانی" ص ۷۷
تذکرہ باب حکومت ۱۳۳۸ھ – ۱۳۶۳ھ) محمد مظہر ص ۱۷ – ۱۸

تاریخ سرفرازی

۱۳۔ نواب شمس الامرا محمد فخر الدین بہادر	۱۲۶۵ھ
۱۴۔ راجہ رام بخش بہادر	۱۲۶۵ھ
۱۵۔ نواب سراج الملک بہادر	۱۲۶۷ھ
۱۶۔ نواب سالارجنگ اعظم شجاع الدولہ مختار الملک بہادر	۱۲۶۹ھ
۱۷۔ مہاراجہ نریندر پرشاد بہادر	۱۳۰۰ھ
۱۸۔ نواب میر لائق علی خاں سالارجنگ بہادر ثانی عماد السلطنت	۱۳۰۱ھ
۱۹۔ نواب بشیر الدولہ عمدۃ الملک اعظم الامراء امیر کبیر آسمان جاہ بہادر	۱۳۰۴ھ
۲۰۔ نواب سر وقار الامراء بہادر	۱۳۱۱ھ

عہدِ عثمانی کے وزرا

۱۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت	۱۳۱۹ھ
۲۔ میر یوسف علی خاں نواب سالارجنگ بہادر ثالث	۱۳۳۰ھ

وزرائے تنظیم جدید بابِ حکومت

۱۔ سرسید علی امام نواب مؤید الملک بہادر صدر اعظم	۱۳۳۸ھ
۲۔ نواب فریدون الملک بہادر صدر اعظم	۱۳۴۱ھ

۳۔ نواب ولی الدولہ بہادر صدر اعظم — ۱۳۴۲ھ

۴۔ مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت صدر اعظم — ۱۳۴۵ھ

۵۔ نواب حیدر نواز جنگ — ۲۹ رمحرم ۱۳۵۶ھ / ۱۹ ر اردی بہشت ۴۶ف

نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے نواب سر عقیل جنگ بہادر کو ۲۲ رمہر سنہ ۵۰ف کو جائزہ دیا۔

۶۔ نواب احمد سعید خاں صاحب چھتاری — ۲۶ رمہر سنہ ۵۰ف یکم ستمبر ۴۱ء مطابق ۸ شعبان سنہ ۶۰ھ کو جائزہ حاصل کیا۔

۷۔ سر مرزا اسماعیل — ۱۹۴۶ء — ۱۹۴۷ء

۸۔ میر لائق علی — ۱۹۴۷ء — ۱۹۴۸ء

آصفی دربار سے وابستہ امراء

صدر اعظمان

مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت
نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر
نواب سر علی امام موئد الملک بہادر
نواب سر فریدون ملک بہادر
نواب سید احمد خاں چھتاری
نواب سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ

مشیر خاص نظام

مولوی سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک بہادر

معین المہامان

نواب خان خاناں بہادر
نواب فخر الملک بہادر
نواب معین الدولہ بہادر

صدر المہامان

نواب سر امین جنگ بہادر
نواب تلاوت جنگ بہادر

نواب حیدر نواز جنگ بہادر
نواب عقیل جنگ بہادر
نواب مہدی یار جنگ بہادر
نواب لطف الدولہ بہادر
نواب نظامت جنگ بہادر
نواب خسرو جنگ بہادر
مولوی عبدالعزیز صاحب
مولوی عبداللہ یوسف علی
راجہ دھرم کرن بہادر

صدرالصدور

نواب صدر یار جنگ بہادر

معتمدین

نواب احمد یار جنگ بہادر
نواب اختر یار جنگ بہادر
نواب اکبر نواز جنگ بہادر
نواب ذوالقدر جنگ بہادر
نواب فصیح جنگ بہادر
نواب قمر یار جنگ بہادر
نواب علی یاور جنگ

نواب نذیر جنگ بہادر

مولوی سید کاظم علی خاں

مولوی آغا محمد علی خاں

دیوان بہادر کرشنا چاری

نواب سید نصیر حسن خیال

رائے بیج ناتھ صاحب

امرائے عظام

دھرم کرن بہادر

سالار جنگ بہادر

سلطان الملک بہادر

شام راج راجونت بہادر

علی یار جنگ بہادر

غازی جنگ بہادر

کمال یار جنگ بہادر

معین الدولہ بہادر

مہدی جنگ بہادر

علماء

نواب عابد نواز جنگ بہادر

نواب سردار نواز جنگ بہادر

نواب رفعت یار جنگ بہادر

نواب مسعود جنگ بہادر

نواب دین یار جنگ بہادر

نواب لطیف یار جنگ بہادر	غلام یزدانی صاحب
نواب محمد نواز جنگ بہادر	وینکٹ راما ریڈی صاحب
راجہ اندر کرن بہادر	خواجہ انور حسین صاحب
سید رحمت اللہ قادری صاحب	سید خورشید علی صاحب
سید محمد حسن بلگرامی	سید عطا حسین صاحب
مرزا مہدی خاں صاحب	غلام خورشت خاں صاحب
محمد عنایت اللہ صاحب	مرزا ثمر اللہ خاں صاحب
عبد الباسط خاں صاحب	مظہر حسین صاحب

خواجہ انور حسین صاحب

ارکان عدالت العالیہ

نواب جبار یار جنگ بہادر	نواب جیون یار جنگ بہادر
نواب سراج یار جنگ بہادر	نواب ہاشم یار جنگ بہادر
نواب ضیاء یار جنگ بہادر	نواب فاروق یار جنگ بہادر
نواب ناصر یار جنگ بہادر	پنڈت کیشو راؤ صاحب

نواب مرزا یار جنگ بہادر

تعلقداران

مولوی سید امیر حسن صاحب	نواب عزیز یار جنگ
مولوی سید شاد احمد صاحب	نواب رسول یار جنگ

نواب منظور یار جنگ

نواب دلیر یار جنگ

صوبہ داران

مولوی میرزا محمد علی خاں صاحب
نواب محی الدین یار جنگ

فضلاء

مولوی سید حسین بلگرامی عماد الملک بہادر
مولوی عبدالحق صاحب
مولوی عبداللہ صاحب عمادی
عبدالماجد دریا بادی صاحب
مولوی ہارون خاں شیروانی
جناب حبیب الرحمن خاں شیروانی
مفتی عبداللطیف صاحب
جناب وحید الدین سلیم صاحب
مولوی عبدالرحمن صاحب
قاضی محمد حسین صاحب
مولوی عبدالباری صاحب ندوی
محمد مجیب صاحب
مولوی قاضی تلمذ حسین صاحب
یوسف حسین خاں صاحب
سید علی اصغر بلگرامی
میر سیادت علی صاحب
عظمت اللہ خاں صاحب
سید علی رضا صاحب
نواب حیدر یار جنگ بہادر
ڈاکٹر حمید اللہ
صادق جنگ حلم
نواب فصاحت جنگ بہادر
نظم طباطبائی صاحب
ظفر یاب خاں صاحب
سید محمد حسین جعفری صاحب
نواب فضیلت جنگ بہادر
محمد حسن آزاد
مولوی ظفر علی خاں
ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا
مولوی سلیمان ندوی
مولوی عبدالحلیم شرر
آغا حیدر حسن
خواجہ حسن نظامی
مولوی مسعود علی خاں

شعراء

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ	حضرت امجد حیدرآبادی (سید احمد حسین امجدؔ)
مولوی شبیر حسن جوشؔ	محمد بہبود علی صفیؔ اورنگ آبادی
فصاحت جنگ جلیلؔ	فصیح الملک داغؔ
الطاف حسین حالیؔ	نواب لطف الدولہ بہادر لطفؔ
فانیؔ بدایونی	اصغر یار جنگ اصغرؔ
حیدر علی نظم طباطبائی	نثار یار جنگ مزاجؔ
صادق جنگ حلمؔ	یگانہ دہلوی
ضیا یار جنگ	صدق جائسی
عزیز یار جنگ عزیزؔ	حیرتؔ بدایونی
راجہ راجیشور راؤ اصغرؔ	نواب تراب یار جنگ سعیدؔ

ڈاکٹرز

ڈاکٹر نواب خدایار جنگ کریم خاں

ڈاکٹر حیدر علی خاں

ڈاکٹر خورشید حسین

ڈاکٹر سید عبد المناق

ڈاکٹر کے۔ ن۔ واگھرے

حوالہ: ۱۔ مرقعِ دکن مرتبہ سید محی الدین قادری زورؔ جنوری ۱۹۲۹ء

۲۔ "کون کیا ہیں"؛ صمصام شیرازی۔ مشیر عالم ڈائرکٹری

باب حکومت سے وابستہ امراء

۱۹۱۹ء میں حکومت میں وزرا کی ایک مجلس بنائی گئی جس میں ایک صدر اور چھ اراکین رکھے گئے۔ اس مجلس کی صدارت عظمیٰ کا منصب سب سے پہلے نواب موئدالملک سرعلی امام کے تفویض کیا۔ ان کے بعد سلسلہ وار حسب ذیل اصحاب نے اس منصب کو سنبھالا۔

نواب فریدون ملک

نواب ولی الدولہ بہادر

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت

نواب سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر

باب حکومت کے علاوہ حکومت دس معتمدیوں پر مشتمل تھی۔

معتمدی مجلس وضع آئین و قوانین: صدر نشین: نواب سر حیدر نواز جنگ صدر اعظم باب حکومت۔ اس محکمہ کا کام قانون سازی تھا۔

ارکان بہ حیثیت عہدہ:

نواب عسکر یار جنگ : معتمد مشیر قانونی سرکار عالی

محمد اظہر حسن : معتمد صیغہ عدالت و کوتوالی امور عامہ

نواب جیون یار جنگ : میر مجلس عثمانیہ عدالت العالیہ سرکار عالی

دیگر اراکین

نواب صمد یار جنگ معتمد فوج و طبابت سرکار عالی

محمد لیاقت اللہ خاں معتمد فینانس سرکار عالی

محمد فضل اللہ زائد معتمد شعبہ تنظیم نیابی

نواب علی یاور جنگ معتمد امور دستوری سرکار عالی

نواب رحمت جنگ کوتوال اندرون و بیرون بلدہ

نواب رئیس جنگ معتمد صنعت و حرفت سرکار عالی

غلام محمد قریشی زائد معتمد مالگزاری سرکار عالی

رائے ایکناتھ پرشاد اول تعلقدار ضلع نلگنڈہ

راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی اسپیشل افسر صرف خاص مبارک

چیف سکریٹری پیشی اعلیٰ حضرت

نواب کاظم یار جنگ بہادر

معتمدی سیاسیات

اس محکمے سے سیاست داخلہ و خارجہ دونوں کا تعلق تھا۔

خواجہ معین الدین انصاری ۔ معتمد سیاسیات ۔ حسن نواز جنگ بہادر

محمد مظفر الدین مددگار اول نواب عنایت جنگ مددگار شاخ صرفخاص۔

سید غوث الدین مددگار دوم دین شاہ رستم ترکی پرسنل مددگار۔

آر۔ پرمیشور ایر رجسٹرار

حوالہ: وزرائے اعظم حیدرآباد۔ یادگار سلور جوبلی آصف سابع۔ ص ۷۷

معتمدی فینانس . اس محکمے کا کام حساب داری تنقیح آمد و خرچ وعطیات تھا۔

محمد لیاقت اللہ خاں	معتمد
محمد عبدالرزاق	نائب معتمد
سید عمر ابوطالب	مددگار معتمد
محمد ظہیر الدین احمد	مددگار معتمد
تاراپور والا	مددگار معتمد
لچھمی نارائن گپتا	مددگار معتمد
محمد جواہر خاں	مددگار معتمد
محمد کرم اللہ خاں	پرسنل اسسٹنٹ صدر المہام فینانس
محمد عبدالواسع	منصرم مددگار معتمد

معتمدی ریلوے و معدنیات اس محکمے کا کام معدنیات ممالک سرکار عالی کی دریافت تھا۔ ریلوے کے محکمے . نظام اسٹیٹ کے انتظامات اس کے تفویض تھے ۔

محمد لیاقت اللہ خاں	معتمد
محمد حامد علی	صدر منتظم ریلوے

معتمدی مالگزاری اس محکمے کا تعلق درستیٔ مالی سے تھا ۔ اس کے تحت وہ تمام محکمے تھے جو ریاست کی آمدنی کا ذریعہ تھے ۔

آر ۔ یم ۔ کرانٹن	معتمد مال
غلام محمود قریشی	زائد معتمد مال
بی رنگا ریڈی	اسپشل افسر مال

نواب تراب یار جنگ — مددگار معتمد مال

محبوب علی خاں — نائب معتمد مال

محمد فخر الدین مسعود — مددگار معتمد مال

صدر المہام مالگزاری — سر ٹی۔ جے۔ ٹاسکر

معتمدی عدالت مملکت آصفیہ کے فرائض میں عدالت و انصاف کو بہت بڑی اہمیت تھی۔ حکومت آصفیہ نے اپنی عدالتوں کو دنیا کی بہترین عدالتوں کا ہم پایہ بنا لیا تھا۔

محمد اظہر حسن — معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ

سید محی الدین — شریک معتمد

سید رحمت اللہ قادری — انڈر سکریٹری

میر سیادت علی خاں — مددگار معتمد

خواجہ اسد اللہ خاں — زائد مددگار معتمد

عبد القیوم امین خاں — پرسنل اسسٹنٹ صدر المہام عدالت

صدر المہام عدالت — سید عبد العزیز صاحب

معتمدی تعمیرات و آب پاشی: ملک کی عمارتوں کی تعمیر اس محکمے کے تفویض تھی۔ اس نے اکثر مقامات کو خوش نما اور بارونق بنا دیا۔ ملک کی معاشی و زراعتی ترقیوں کی ضامن تھی۔

سید عارف الدین — معتمد آب پاشی — محمد احمد مرزا — معتمد ہائے عمارات

صدر المہام تعمیرات — راجہ دھرم کرن بہادر

معتمدی فوج سرکارِ عالی کی افواج باقاعدہ اور بے قاعدہ جمیعت پر مشتمل تھی ۔ ان افواج کو شہزادۂ برار نواب اعظم جاہ کی سپہ سالاری کی عزت حاصل تھی ۔ افواج کی تنظیم اور اصلاح کی طرف توجہ اس کے فرائض میں تھے ۔

نواب صمد یار جنگ — معتمد

نواب حسن نواز جنگ — معتمد سیاسیات متعینہ معتمدی فوج

نواب قدرت نواز جنگ — شریک معتمد

نواب رئیس یار جنگ — نائب معتمد

صدر المہام فوج — میجر جنرل نواب خسرو جنگ بہادر

معتمدی تجارت و حرفت اس محکمے کی جانب سے اہلِ ملک کو جدید ترین طریقہ پر صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی تھی ۔

نواب رئیس جنگ بہادر — معتمد تجارت و حرفت

نواب لطیف نواز جنگ — مددگار معتمد

صدر المہام صنعت و حرفت — نواب سر عقیل جنگ بہادر

معتمدی امور دستوری دفاقی اور بعض خارجی مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک مجلس قائم ہوئی جس کے تحت محکمے نظامت معلومات عامہ اور لاسلکی تھے ۔

نواب علی یاور جنگ — معتمد امور دستوری

سید تقی الدین — نائب معتمد

میر تراب علی — انڈر سکریٹری

عہدِ عثمانی میں نشرگاہ لاسلکی کا قیام عمل میں آیا ۔ سرورنگر کے ایک پُرفضا مقام

پر تھا. بعد میں اسے نوبت پہاڑ کے دامن میں باغ عام کے سامنے منتقل کر دیا گیا۔

سید فضل الرحمٰن ڈپٹی کنٹرولر لاسلکی

محبوب علی طاہر — ״ —

مجلسِ بلدیہ

نواب مہدی یار جنگ بہادر میر مجلس

راجہ ترمبک راج بہادر معتمد

معتمد باب حکومت

سید محمد مہدی صاحب (مہدی نواز جنگ)

صدر محاسب

میر طالب علی خاں صدر محاسب محمد عبدالعزیز سعید مددگار صدر محاسب

حسین عبدالمنعم نائب صدر محاسب رام کشن راؤ خزانہ دار خزانہ عامرہ

محمد عنایت الرحمٰن خاں مہتمم خزانۂ عامرہ سید اعظم الدین حسن بلگرامی مددگار صدر محاسب

نواب شہید یار جنگ مددگار صدر محاسب

سررشتہ جات

سررشتۂ انجمن ہائے امدادِ باہمی ۔ ایک متمدن حکومت کے لیے اس سررشتہ کی اہمیت ہے ۔ اس کا کام باہم امداد کرنا ہے ۔ غریب کسانوں اور اور حاجت مند سرکاری ملازموں کو قلیل منافع پر قرض دینا ہے تاکہ ساہوکاروں کے ظلم سے محفوظ رہ سکیں ۔

سید فضل اللہ ۔ ناظم امدادِ باہمی

سررشتہ کروڑگیری ۔ خاص اہمیت کا حامل تھا ۔ اس سررشتہ کے طریق کار اور انتظام پر مملکت کی تجارت و حرفت کی ترقی اور نشو و نما کا دار و مدار تھا ۔

ایرج شاہ چینائی ۔ ناظم کروڑگیری تھے ۔

سررشتہ جنگلات : اس سررشتہ کا کام جنگلی درخت لگانا اور ان سے مختلف پیداوار حاصل کرنے اور ان کے کیمیاوی اجزاء کی تلاش اور تحقیق تھی ۔

مرزا محمد علی بیگ : ناظم جنگلات تھے ۔

سررشتۂ آبکاری

قاضی محمد زین العابدین ناظم آب کاری تھے

سررشتہ بندوبست اس سررشتہ کا تعلق مالگزاری سے تھا۔ مقامی ٹیکس کی وصولی، مقامی آبادی سے اور عوام کو بلدی انتظام کی تربیت دینا اور اضلاع میں آب رسانی کا کام اس کے ذمّے تھا۔

جہانگیر جی بہمن جی جیتا ناظم بندوبست دیوانی و جاگیرات تھے۔

سررشتہ تعلیمات ریاست کا ایک کروڑ روپیہ تعلیم پر خرچ ہوتا تھا۔ میر عثمان علی خاں کو اس سررشتے سے گہری دلچسپی تھی۔ تعلیمی سطح کا اونچا ہونا اس کا نتیجہ تھی۔

سیّد محمد حسین جعفری ناظم سیّد علی اکبر معتمد مجلس تعلیمات

سیّد علی بلگرامی مددگار ناظم صدر المہام تعلیمات نواب مہدی یار جنگ بہادر

سررشتہ زراعت زراعتی کاروبار میں سہولت بہم پہنچانے کے لیے یہ محکمہ قائم کیا گیا تھا۔ اس سررشتے سے مختلف مقامات پر اچھے بیجوں کا فراہم کر کے تجرباتی فارم قائم کرنا تھا۔ اس محکمے کی قیام نے زراعت میں عظیم ترقی کی فضاء پیدا کر دی۔

نظام الدین حیدر ناظم زراعت تھے۔

سررشتہ انجمن ہائے امداد باہمی ایک متمدن حکومت کے لیے اس سررشتہ کی اہمیت ہے۔ اس کا کام باہم امداد کرنا ہے۔ غریب کسانوں اور حاجت مند سرکاری ملازموں کو قلیل منافع پر قرض دینا ہے تاکہ ساہوکاروں کے ظلم سے محفوظ رہ سکیں۔

سیّد فضل اللہ ناظم امداد باہمی

سررشتہ ہوائی جہاز یہ شعبہ معتمدی فوج سے متعلق تھا۔ اہم فضائی شہروں کے درمیان فضائی آمد رفت کے انتظام کا کام اس محکمے کے تحت ہوتا تھا۔

سید نقی بلگرامی مددگار مہتمم تھے۔

سررشتہ آثارِ قدیمہ قدیم آثار ملک جیسے غار ہائے ایلورا اجنٹہ کا تحفظ، اس کے ذریعہ قدیم آثاروں کی حفاظت کی گئی۔

غلام یزدانی ناظم آثارِ قدیمہ تھے

سررشتہ امور مذہبی سرکار عالی کے نظم و نسق میں یہ ایک اہم سررشتہ تھا مختلف مذاہب میں خوش گوار تعلقات برقرار رکھنے کی کوشش اس کے مقاصد میں سے تھا۔

سررشتہ رجسٹریشن اس محکمے کا تعلق معتمدی عدالت و کوتوالی امورِ عامہ سرکار عالی سے تھا۔ اس محکمے کا کام رجسٹریشن اسٹامپ جات تھا۔

سید احمد محی الدین انسپکٹر جنرل

سید رحمت اللہ قادری انسپکٹر جنرل

سررشتہ حیوانات اس سررشتہ کا کام انسداد امراض جانور اور ان کی نسل کی اصلاح و ترقی اور ان کے لیے بہترین چارے کا انتظام کرنا تھا۔

بی ۔ کے ۔ یاد امی ناظم علاجِ حیوانات تھے

سررشتہ معلوماتِ عامہ حیدرآباد کی سرگرمیوں سے باہر کے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ تنقیدی اخبارات کی طرف محکموں کو توجہ دلانا اور غلط اطلاعات کی تردید کرنا

سررشتہ بلدیہ بلدیہ کے انتظامات صفائی، امراض وبائی کا انسداد وغیرہ اس سررشتے کے تفویض تھا۔

نواب مہدی نواز جنگ ناظم بلدیہ

میر باقر علی خان مددگار ناظم تھے

اس کے انتظام کے لیے ایک مجلس مقرر تھی جس کے میر مجلس نواب مہدی یار جنگ تھے۔

سررشتہ باغات معتمدی تعمیرات و آب پاشی سے متعلق تھا جس کا کام سرکاری باغات کی نگرانی کرنا تھا۔

سیّد جمال الدین ناظم باغات تھے

سررشتہ ٹپہ سرکار عالی کا اپنا ٹپہ تھا، عوام کو رسل و رسائل ٹپہ میں سہولت کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

سیّد تراب علی ناظم ٹپہ تھے۔

سررشتہ کوتوالی بلدہ شہر کی پولیس کوتوال بلدہ کے ماتحت تھی جو بالراست وزارت پولیس کی جواب دہ تھی۔ کوتوالی بلدہ کا کام نظم و ضبط، حسنِ انتظام اور رعایا کی جان و مال کی حفاظت، جرائم کا انسداد، ملزموں کی نگرانی اور دیکھ بھال اس کے تفویض تھی۔

نواب رحمت یار جنگ شریک کوتوال بلدہ تھے۔

کورٹ آف وارڈز یہ محکمہ جاگیرات کی دیکھ بھال اور ان کو تباہی سے بچانے کا ذمہ دار تھا۔ جاگیرداروں کو قرضہ کی زیر باری اور وراثت کی نزاع سے بچانا اس کا کام تھا۔

سررشتہ طبقات الارض اس سررشتے کا کام زمین کی پیمائش تھا۔

کے بکرمجی، کرشنا مورتی اور ڈاکٹر مہادیون اس محکمے کے مددگار مہتمم تھے۔

سررشتہ عدالت مملکت آصفیہ میں برطانوی ہند کی طرح محکمہ عدالت کو نفع بخش محکمہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

نواب جیون یار جنگ میر مجلس عدالت العالیہ تھے

سررشتہ مردم شماری و اعداد و شمار ملک کی معاشی حالت کی دریافت، مردم شماری، دیہاتی و قصباتی مزدوریوں کی شرح دریافت کرنا، اور ممالک محروسہ کا اعدادی خلاصہ تیار کرنا تھا۔

سررشتہ ٹیلی فون

مرزا مصطفیٰ بیگ مہتمم ٹیلی فون تھے

سررشتہ آرائش بلدہ اس کے ذریعے شہر کی آرائش و زیبائش حفظانِ صحت کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ یہ محکمہ بورڈ کے زیر نگرانی تھا۔ نواب معظم جاہ بہادر اس محکمے کے چیرمین تھے۔

سررشتہ طباعت کے تحت ممالک محروسہ سرکار عالی کا تمام طباعتی کام تھا۔ ماہوار جریدہ شائع ہوتا تھا جسے جریدۂ اعلامیہ کہتے تھے۔ نستعلیق ٹائپ کے اجراء میں حصہ لے کر اس کاروبار قائم کیا۔

سررشتہ عمارات جامعہ عثمانیہ تعمیر کا کام اس کے تفویض تھا۔

نواب علی نواز جنگ کنسلٹنگ انجنیر

نواب احسن یار جنگ چیف انجنیر

حسن لطیف صاحب ۔۔ ۔۔ ۔۔

سید دلدار حسین مددگار چیف انجنیر تھے

چیف آرکیٹکٹ عثمانیہ یونیورسٹی پراجکٹ نواب زین یار جنگ بہادر تھے۔

مددگار آرکیٹکٹ سید حشمت رضا تھے۔

حیدرآباد دکن کے تاریخی آثار

حیدرآباد ہندوستان کا ایک بہترین اور خوب صورت شہر ہونے کے علاوہ بہت بڑا تہذیبی اور تعلیمی مرکز بھی ہے۔ اس شہر کو گولکنڈے کے قطب شاہی سلطنت کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ نے اپنی تخت نشینی کے پندرہ سال بعد اپنے دارالسلطنت سے ۵ میل کے فاصلے آباد کیا تھا۔

گولکنڈہ قلعہ کے اطراف آبادی پھیلتی جارہی تھی اور اس کی ضروریات کے لیے شہر ناکافی تھا چنانچہ ۱۵۹۰ء میں حیدرآباد شہر وجود میں آیا۔

شہر کی تعمیر کے لیے ایک خاص نقشہ تیار کیا گیا۔ قلی قطب شاہ کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ چناں چہ سب سے پہلے اس نے شہر کے مرکزی مقام پر چار مینار جیسی خوب صورت اور بلند عمارت بنوائی۔ پاس ہی میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ مسجد سے کچھ فاصلے پر ایک حوض "گلزار حوض" کے نام سے تعمیر کیا جس کے چاروں طرف چار کمانیں بنوائیں جن سے ہو کر چار شاہ راہیں مختلف سمتوں پر جاتی تھیں۔ ایک طرف لاڈ بازار کو جاتی، دوسری طرف یاقوت پورہ کو، تیسری حسینی علم کو اور چوتھی گلزار حوض کی جانب نکلتی ہے۔ چار مینار شہر کی سب سے قدیم عمارت ہے۔

دوسری عمارت جو قلی قطب شاہ کی یادگار ہے وہ ہے مکہ مسجد۔

شہر سے ۵ میل پر گولکنڈے کا قلعہ ہے جو قطب شاہی بادشاہوں کا دار السلطنت تھا اس کے قریب ہی ان بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔

شہر کی دوسری خوب صورت عمارتوں میں فلک نما پیلس، ہائی کورٹ یا عدالت العالیہ، دواخانۂ عثمانیہ، سٹی کالج، جاگیردار کالج، کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ، جوبلی ہال، ٹاؤن ہال اور آرٹ گیلری قطب شاہی اور آصف جاہی حسنِ ذوق کے نمونے ہیں۔ سالار جنگ میوزیم جو موسیٰ ندی کے کنارے واقع ہے، سالار جنگ اوّل کے قیمتی نوادرات پر مشتمل ہے۔ معظم جاہی مارکٹ، مسافر خانہ امیسلی، عزاخانۂ زہرا، شفاخانۂ زہرا، یونانی دواخانہ دورِ آصف جاہی کی یادگار ہیں۔

شہر سے ۱۲ میل دور عثمان ساگر (گنڈی پیٹ) اور حمایت ساگر کے تالاب ہیں۔ یہاں سے شہر کو پینے کے لیے صاف کیا ہوا پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ حسین ساگر حسین شاہ ولی کا یادگار ہے جو قطب شاہی عہد میں ابراہیم قطب شاہ کے داماد اور اعلیٰ پایہ کے انجینئر تھے۔ یہ حسین ساگر حیدرآباد کے بیچوں بیچ واقع ہے جس پر حسین ساگر کٹہ سکندرآباد اور حیدرآباد دو شہروں کو آپس میں جوڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ کٹہ ایک میل لمبا ہے۔ حسین ساگر سے بھی پینے کا پانی فراہم کیا جاتا ہے۔

نظام ساگر: آب پاشی کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے نظام ہفتم نے نظام ساگر کو نواب علی نواز جنگ کی نگرانی میں تعمیر کروایا تھا جو دریائے مانجرا کو روک کر بنایا گیا تھا۔ اس کا کٹہ تقریباً ۲ میل لمبا ہے اور چوڑائی اتنی کہ دو سواریاں بہ آسانی

گزر سکیں ۔ کٹے میں ۱۶ دروازے ہیں - پانی حد سے بڑھ جاتا ہے تو پمپ کے ذریعے ایک بڑے ڈبے میں آتا ہے جس کے اثر سے پہلا دروازہ اور پھر باری باری سارے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں - صدر دروازے کے کھلنے پر پانی اطراف و اکناف کی زمینوں کو سیراب کر دیتا ہے ۔ تالاب کا رقبہ ۵۹ مربع میل ہے"
(حوالہ نظام ساگر: مرقع دکن ۔ جلال صدیقی)

سکندر آباد میں بلارم ایک فوجی چھاونی ہوا کرتی تھی -

شہر کے اطراف نہریں ہیں' باغ ہیں جو قطب شاہوں کے پاکیزہ ذوق کا آئینہ ہیں - مشہور و معروف موسیٰ ندی شہر کے بیچوں بیچ بہتی ہے جس پر پرانا پل قطب شاہ کی داستانِ عشق کا جیتا جاگتا گواہ ہے ۔

گلستانِ چچلم کی رنگیں کہانی　　قطب شاہ کے دل کی کافر جوانی
غرورِ محبت کی زندہ نشانی　　ضیائے چراغِ شبستاں ہے تو
پڑی بھاگ نگر کی بنیاد تجھ سے　　ہوا دشت ویراں آباد تجھ سے
بنا تجھ سے ہاں حیدرآباد تجھ سے　　مری داستانوں کا عنوان ہے تو
وہ دن جا چکے وہ زمانہ نہیں ہے　　وہ زلفیں نہیں ہیں وہ شانہ نہیں ہے
مگر یہ حقیقت فسانہ نہیں ہے　　کہ سچی محبت کا پیمان ہے تو

۱۵۷۸ء میں پرانے پل کی تعمیر کے بعد بھاگیہ نگر کے بھاگ جاگے اور قلی قطب کے آنے جانے سے چچلم کے چھوٹے سے گاؤں نے "بھاگ نگر" کا روپ لیا - بھاگ متی کے عاشق نے چچلم کو بسایا ...... گزارنا شروع کیا -
کے دلکش منظر اور کھلی تازہ آب و ہوا کی وجہ سے اپنا لیا

بقیہ

اس کے بعد بنا سجانے والے پلوں میں چادر گھاٹ کا پل اور نیا پل ہیں۔
اکبر وفاقانی نے نئے پل کے لیے چند اشعار لکھے جس سے اس کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے:

نیا پل

اک طرف تعمیر عدل[1] اور اک طرف دار الشفاء[2]
دور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا
سامنے دار الکتب[4] کی دل نشین تعمیر ہے
جس کی خشت و سنگ میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے
رودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے
جس کی دو رنگی میں دونوں کی تعمیر ہے

موسیٰ ندی میں ایک ندی عیسیٰ ندی آکر ملتی ہے۔ میر محبوب علی خاں کے عہدِ حکومت میں اس ندی میں سیلاب آیا تھا (۱۹۰۸ء) اور شہر کی تباہی ہوئی تھی۔

سلسلہ ۔ ۱۵۸۰ء میں ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد قلی قطب شاہ کا لقب پاکر قلی قطب تخت نشین ہوا۔ تو ۱۵۹۰ء میں اپنی محبوبہ کے گاؤں چچلم کے آس پاس نئے شہر کی بنیاد ڈالی۔ شہر کا نام بھاگ نگر رکھا۔ جب بھاگ متی ملکہ بنی تو حیدر محل کا خطاب پایا اور یہ بستی حیدر آباد کہلانے لگی۔ ۱۰۰۶ء میں اسی بستی کو "فرخندہ بنیاد" کا نام دیا گیا۔ جو سرکاری دفاتر میں بہت عرصے تک چالو رہا۔ بعد میں یہ "حیدر آباد فرخندہ بنیاد" کہا جانے لگا۔

[1] عدالت العالیہ ۔ [2] عثمانیہ دواخانہ ۔ [3] کامیہ ملبدہ سٹی کالج
[4] کتب خانہ آصفیہ ۔ موسیٰ ندی پر پانچ پل تعمیر ہوئے: ۱۔ ریل کا پل ۲۔ چادر گھاٹ کا پل ۔ ۳۔ افضل گنج کا پل ۴۔ مسلم جنگ کا پل ۵۔ پرانا پل

چناں چہ ان ندیوں پر بند باندھ دیئے گئے۔ پانی کو روک کر دو بڑے تالاب عثمان ساگر اور حمایت ساگر بنائے گئے جن کے ذریعے شہر کو فلٹر کیا ہوا پانی ملنے لگا۔ حسین ساگر کے مقام پر پہلے ایک چھوٹا سا کنٹہ تھا جو قطب شاہی باغ کے ایک گوشے میں تھا۔ ابراہیم قطب شاہ نے اپنی بیمار بیٹی شہزادی خیرۃ النساء کے لیے ایک پُر فضا تالاب بنانے کا حکم دیا اور حسین شاہ ولی نے جو بادشاہ کے داماد اور صدر المہام تعمیرات تھے، اپنے بادشاہ کے حکم پر اس تالاب کی تعمیر کی۔ ابتداء میں اس کا نام ابراہیم ساگر رکھا گیا تھا لیکن تعمیر کے دوران "حسین ساگر" مشہور ہو گیا۔

میکشؔ نے اس تاریخی تالاب کو خوب صورت طریقے سے یوں بیان کیا ہے:

اپنے عالی حوصلہ شاہوں کے گُن گاتی ہوئی
اُٹھ رہی ہے سطح سے ہر موج لہراتی ہوئی

اس کی موجوں کو نظر سے چُومتا تھا آسماں
اب بھی خاموشی سناتی ہے وہ خونیں داستاں

قافلہ گزرا تھا جب اس پر سے تانا شاہ کا
اس نے گزرانا تھا تحفہ نالۂ جاں کاہ کا

بے کسی میں اپنے شہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس
اس کے پانی نے بجھائی تھی خدا بندے[1] کی پیاس

داغِ دل بن کر قطب شاہوں کے نقشِ قدم
ہو سوکھنے پاتا نہیں اس کا کبھی دامانِ نم

۱۔ تانا شاہ کا اکلوتا فرزند

سیر کرنے والے ان رنگینیوں میں کھو نہ جا
حال کے جلوؤں میں یونہی ماضی سے غافل ہو نہ جا
قہقہوں کی گونج میں پوشیدہ آہوں کو نہ بھول
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے قطب شاہوں کو نہ بھول
رو رہا ہے آسماں یہ شبنم افشانی نہیں
اشک کا سیل رواں ہے دیکھ یہ پانی نہیں

تالاب، ماں صاحب ۔ سلطان ابراہیم قطب شاہ کی پوتی اور محمد قلی قطب شاہ کی اکلوتی بیٹی حیات بخشی بیگم کے بنوائے ہوئے تالاب کو ماں صاحب کا تالاب کہا جاتا ہے۔ حیات بخشی بیگم محمد قطب شاہ کی ملکہ اور عبداللہ قطب شاہ کی ماں تھیں ان کی اجازت کے بغیر عبداللہ کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ صحیح معنی میں یہی حکمران تھیں اور عوام و خواص سب میں بے حد مقبول تھیں۔ بادشاہ اور عوام سبھی انھیں "ماں صاحب" کہتے تھے۔ اب گو اس تالاب کے آثار باقی نہیں رہے' اس کی جگہ عمارتیں بن گئی ہیں لیکن اس علاقے کا نام اب بھی "ماں صاحب ٹینک" ہی ہے۔

خیرت آباد کے مقام کا نام شہزادی خیرۃ النساء کے نام پر رکھا گیا ہے۔ چوں کہ شہزادی کی صحت خراب رہا کرتی تھی اور گولکنڈہ کی گنجان آبادی مناسب نہیں تھی۔ طبیب نے کھلی اور خوش گوار جگہ پر قیام کرنے کی تجویز دی۔ چناں چہ بادشاہ ابراہیم قطب شاہ نے ابو عبداللہ نصیر الدین حسین جو حضرت حسین شاہ ولی کے نام سے مشہور تھے' اپنا داماد بنا لیا تھا اور ۱۰ ہزار فوج کے سپہ سالار بھی تھے۔ انھوں نے اس جگہ پر ایک باغ' محل اور مسجد بازار اور تالاب تعمیر کروایا تھا۔ مسجد تالاب

اور بازار اب بھی قائم ہیں لیکن باغ اور محل اُجڑ چکا ہے۔

حسین شاہ ولی کی کرامات کی وجہ سے لوگ ان کے بہت معتقد تھے۔ ان کی بنوائی ہوئی یہ دونوں تاریخی عمارتیں آج بھی باقی اور آباد ہیں۔

فتح میدان: مغل بادشاہ اورنگ زیب جب گولکنڈے کے محاصرے کے لیے دکن آئے تو یہیں پر قیام کیا تھا۔ اس لیے اس کا نام فتح میدان پڑ گیا۔ آج یہاں کھیل کود کے لیے اسٹیڈیم نظر آتا ہے۔ قدیم عمارت جو پویلین کے نام سے یاد کی جاتی تھی، توڑ دی گئی ہے۔ اسٹیڈیم کے اطراف دکانیں سجائی گئی ہیں۔

نوبت پہاڑ مغل دور کی یادگار پہاڑی کا نام ہے جہاں سے بادشاہوں کے احکام کا اعلان نوبت کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا نام "نوبت پہاڑ" پڑ گیا۔ آج یہاں پلانیٹوریم بنا دیا گیا ہے، چمن بندی کی گئی ہے، اس پہاڑ سے اسٹیڈیم بھی نظر آتا ہے۔ اس کے روبرو باغِ عامہ اور لیجسلیٹو اسمبلی کی عمارت ہے۔ قریب کے پہاڑ پر برلا مندر بنا دیا گیا ہے۔ نوبت پہاڑ سطح زمین سے ۳۰۰ سو فیٹ بلند ہے۔

مساجد

مکّہ مسجد چار مینار کے قریب ہی محمد قطب شاہ کی یادگار ہے جو ایک پارسا اور متقی بادشاہ تھا۔ گو اس کی بنیاد اس نے رکھی لیکن اس کی تکمیل اورنگ زیب کے ہاتھوں ہوئی۔ مکّہ مسجد کے وسیع صحن میں آصف جاہی سلاطین کے مزار بھی ملتے ہیں۔

جامع مسجد: چار مینار کے قریب دوسری مسجد ہے جو قلی قطب شاہ

کے عہد میں بنوائی گئی تھی۔

اس کے علاوہ مسجد میاں مشک، ٹولی چوکی کی مسجد بھی ہے۔

گولکنڈے کے قلعہ میں عبداللہ قطب شاہ نے ہیرا مسجد بنوائی تھی۔ مسجد صفا، مادنا کا دیول، بارہ دری اور قطب شاہوں کے عالی شان مقبرے اور گنبد آج بھی دکن اور اس کے شاہوں کی عظمت کا ثبوت دیتے ہیں۔ گیارہ قطب شاہی گنبدوں میں ایک حیات بخشی بیگم کا گنبد بھی ہے۔

گولکنڈے کے کھنڈروں میں حیات بخشی بیگم کا محل بھی نظر آتا ہے جو آج بھی نگاہوں کا مرکز ہے۔ بھاگ متی کا محل بھی ہے جہاں وہ دولت خانہ عالی'' میں منتقل ہونے سے پہلے رہتی تھی۔

محلات

قلی قطب شاہ نے کئی محلات بنائے۔ یہ شاہی محل نیرنگیٔ زمانے کے ہاتھوں مسمار ہو چکے ہیں۔ لیکن گولکنڈے کے قلعے اور اس کے اندر کے بوسیدہ محل اور کھنڈروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اونچے اونچے محلوں پر حوضوں میں پانی پہنچانے کا انتظام کس نفاست سے کیا گیا تھا۔

چار مینار کے شمال مغرب میں "دولت خانۂ عالی'' کی تعمیر ہوئی۔ اس کے جلو خانے میں چار طرف چار بلند ۵۰ فیٹ کی کمانیں کھڑی کیں۔ بیچ میں ایک ہشت پہلو حوض ہے تاکہ سپاہیوں اور جانوروں کو ہر وقت پانی مل سکے۔ یہی حوض "گلزار حوض'' کے نام سے مشہور ہے۔

جلو خانے کے مغرب میں شاہی محلات کھڑے ہوئے۔ اس جانب جو کمان تھی

وہ دروازۂ دولت خانہ یا دروازۂ شیر علی کہلاتی تھی۔

(نورور صاحب "قلی قطب شاہ" ص ۱۱۰ تا ۱۱۱)

اس کے بعد چندن محل اور گگن محل آتے تھے جن میں ترک، عرب اور دکنی مسلح دار رہتے تھے۔ قدیم ملازموں کے لیے ایک الگ حصہ تھا۔

"سجن محل" میں خوب صورت عمارتیں تھیں جن میں شہر کے فضلاء اور اعیان رہتے تھے۔ مشرق کی سمت بڑے ہال میں ہر قسم کے کھانے پکتے اور ہزاروں امراء، فضلا، علماء اور سادات کے لیے شاہی دسترخوان بچھتے تھے۔

'خداداد محل'، محمد قلی کی آٹھ منزلہ قیام گاہ تھی۔ اس کا رُخ گولکنڈے کے قلعے سے ہوتی ہوئی چارمینار آنے والی سڑک کے سامنے تھا۔

موجودہ شاہ گنج، محبوب گنج اور چوک کی جگہ کہتے ہیں کہ ایک وسیع میدان تھا درمیان میں ایک حوض اور اطراف میں بازار تھے۔

"داد محل" سے اس میدان اور بازار کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ یہاں مظلموں اور فریادرسوں کی فریاد سنی جاتی تھی۔ خود سلطان اس محل کے بیرونی جھروکے پر برآمد ہوتے اور فریاد سنتے تھے۔ داد محل چار منزلہ عمارت تھی۔ جب اورنگ زیب نے گولکنڈے پر قبضہ کیا تو اس محل کے سامنے بنے ہوئے تالاب نما حوض کو توڑ دیا گیا۔

یہ چاروں محل یعنی خداداد محل، داد محل، چندن محل اور گگن محل سرکاری محل تھے لیکن موسیٰ ندی کے کنارے خانگی تفریح اور آرام کے لیے ندی محل بنوایا گیا تھا۔ کوہ طور پہ جو محل بنوایا تھا وہ بھی سلطان قلی کا خانگی محل تھا۔ اس کے علاوہ سجن محل

اعلیٰ محل، حیدر محل، حنا محل اور قطب مندر بھی اس کی رہائش گاہیں تھیں۔

ان سارے محلوں پر اس نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اور نبی کے صدقے اور اماموں کے کرم سے ان محلوں میں اپنی بارہ محبوباؤں کے ساتھ عیش کی زندگی بسر کرنے کی دعا بھی مانگی ہے۔ خداداد محل سلطان محمد کے بیٹے کی پیدائش کے دن جل کر راکھ ہو گیا تھا۔

موجودہ فلک نما پیلس کی جگہ "کوہ طور محل" ایک سہ منزلہ محل تھا۔ اس میں وسیع ایوان اور شاہ نشین تھے۔ نیچے ایک بڑا حوض تھا۔ سبھی ایوانوں میں حوض اور فوارے تھے۔ کوہِ طور محل' پر جو نظم اس نے لکھی ہے اس میں کہا ہے کہ اس پر خدا کی تجلی نظر آتی ہے۔ اور بارہ برجوں پر بارہ اماموں کی نظر عنایت ہے یہاں ایمان کی روشنی چمکتی ہے اور بلندی کے لحاظ سے قطب تارہ معلوم ہوتا ہے۔ نظم بہت ہی خوب صورت ہے اور جگہ جگہ تشبیہوں اور تمثیلوں سے کام لیا گیا ہے۔ اس محل کی بلندی سے گولکنڈہ اور شہر حیدر آباد خوب نظر آتا تھا۔

عبداللہ قطب شاہ نے بھی اس محل میں دن رات بسر کئے تھے۔ جب سلطنت کا خاتمہ ہوا تو یہ محل بھی مسمار ہو گیا اور اسی کے کھنڈر پر فلک نما قصر تیار ہوا ـــ "جہاں نما" بھی یہیں آباد ہوا۔

سجن محل یا دولت خانہ عالی شاہوں کا زنانہ محل تھا۔ سلطان عبداللہ کے دور میں جب مغلوں نے اس پر حملہ کیا تو یہ محل بھی لُٹ گیا۔ چنانچہ عبداللہ نے گولکنڈہ میں پناہ لی۔ یکے بعد دیگرے مغل فوجوں نے سب ہی محلوں کو تباہ کر دیا۔

قلی قطب شاہ کے کلام میں، اعلیٰ محل، حیدر محل اور قطب مندر کا ذکر بھی ملتا ہے۔

حیدر محل یا حیدر منڈوہ تفریح گاہ تھی۔

"عیدِ قربان" والی نظم میں 'حنا محل' کا ذکر ملتا ہے جو موجودہ سرکاری زنانہ دواخانہ کی جگہ پر واقع تھا۔ یہاں ملک امین الملک' محمد قلی کے سپہ سالار کا باغ تھا جو کئی برس سے "امین باغ" کے نام سے مشہور تھا۔ یہ باغ وسعت میں ندی کے کنارے سے لے کر خداداد محل اور دولت خانہ عالی تک پھیلا ہوا تھا۔ قطب شاہی محلات کی طرح کئی حمام' مساجد اور عاشور خانے' لنگر خانے' مہمان خانے' کاروان سرائے' دواخانے اور مدرسے بھی اس قطب شاہی دور میں بنوائے گئے تھے جن کے آثار کہیں کہیں اب بھی نظر آتے ہیں جو نہ صرف خوب صورت بلکہ مضبوط بھی ہیں۔

چار مینار:

۱۰ ویں صدی ہجری کی سب سے قدیم عمارت ہے اور کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین کے تعزیے کی یادگار ہے۔ صاحبزادہ میکشؔ اور باقیؔ کی دو نظمیں چار مینار کی عظمت و اہمیت کو یوں بیان کرتی ہیں:

تکلّم بن ہی جاتی ہیں کبھی خاموشیاں تیری
سُنی ہیں عرشیوں نے چرخ سے سرگوشیاں تیری
نگاہیں سب یہ ہیں' وطن کا پاسباں ہے تو
تری رفعت کا کیا کہنا' زمیں پہ آسماں ہے تو
قطب نے مہر سے لے کر تجھے تابندگی دی ہے
خدا نے تجھ کو شاید جاودانی زندگی دی ہے

آصف سابع

نہیں آنکھیں مگر تو آشنائے بیش و کم نکلا
ہزاروں گردشیں آئیں مگر ثابت قدم نکلا
گلے میں اپنے ڈالا مسجد و زنّار کو تو نے
مٹایا امتیازِ کافر و دیں دار کو تو نے
جہاں کے انقلابوں نے کیا ہے تیرا نظارہ
ترے قدموں کا بوسہ لے رہا ہے وقت کا دھارا
تری پیرانہ سالی بھی بہارِ نوجوانی ہے
قطب شاہوں کے ذوقِ حُسن کی زندہ نشانی ہے
تصوّر مٹ چکا بھولے ہوئے خوابِ پریشاں کا
ہے تیرے سر پہ سایہ آصفی شاہوں کے داماں کا
وہی موجِ مسرّت اب بھی بہتی ہے جو بہتی تھی
وہی رونق ہے اب بھی تجھ پہ جو ماضی میں رہتی تھی
نگاہوں سے ترے دیوار و در کو چوم لیتے ہیں
ترے اطراف اب بھی جانے والے گھوم لیتے ہیں

میکش

❖

عظمتِ شاہانِ ماضی کی نرالی یادگار
اے وطن کی سرزمینِ حُسن کے آئینہ دار

شہر کے سینے میں روشن ہے ترا نقشِ وفا
تیرے میناروں میں دل کی دھڑکنیں جلوہ نما
چار سُو جلتا ہے تیرے عشقِ دائم کا چراغ
دیکھ کر تجھ کو فلک کی سمت جاتا ہے دماغ
ثبت ہے سکوں کے دل پر تیری تصویریں ہنوز
ظلمتوں میں بھی ہیں روشن تری تقدیریں ہنوز
تو جہانِ حسن کے نایاب شہ کاروں میں ہے
عشق کی برقِ تجلّی تیری دیواروں میں ہے

یاقی

اس تاریخی چار مینار کی بڑی لمبی تاریخ ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں اور اس کی اہمیت کی بنا پر اس عمارت کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔

گولکنڈے کے ۵ ویں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی محبّت کی یادگار کے طور پر گولکنڈے سے ۵ میل دور اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر شہر بسایا تھا جس کا ذکر اس نے اپنی مناجات میں کہیں شہرِ حیدر، حیدر نگر اور پھر حیدرآباد کے نام سے کیا ہے۔

اس کی بنیاد اس طرح پڑی کہ گولکنڈہ کی بڑھتی آبادی اور اطراف کی چمن بندی اور عمارتوں کی تعمیر نے جگہ اس قدر تنگ کر دی کہ مزید لوگوں کو بسانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ آبادی موسیٰ ندی کے کنارے کنارے پھیلتی گئی اور ۱۰۰۰ھ میں قلی قطب شاہ نے اس نئے شہر کو بسانے کی ضرورت محسوس کی۔

چچلم جو بھاگ متی کا دیس تھا، ایک پُر فضا مقام پر واقع تھا جہاں قلی قطب شاہ اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اسی مقام پر اس نے اس نئے شہر کی بنا ڈالی جہاں موجودہ چار مینار، مکہ مسجد، مغل پورہ اور کشن پرشاد کی دیوڑھی واقع ہے۔

شہر کے بیچوں بیچ اس نے "چار مینار" کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کی تعمیر میں ۲ لاکھ ۵۲ ہزار سے لے کر ۳ لاکھ ہزار روپے خرچ ہوئے۔ چار مینار ۱۸۹ فیٹ بلند ہے۔ اس کے اوپری حصے میں ایک مسجد اور ایک حوض بھی بنوایا جس میں جل پل تالاب سے پانی مہیا کیا جاتا تھا۔

چار مینار کے چاروں سمت شاہ راہیں بنوائیں اور شہری ضروریات کے تحت بازار لگوائے۔ کہتے ہیں کہ اس میں ۱۴ ہزار دکانیں تھیں۔ اطراف میں نہریں اور فوارے لگائے۔ شہر کی آرائش و زیبائش میں اس نے بہت دلچسپی لی۔ یہ شہر اسے اس قدر من بھایا کہ اس نے خدا سے دعا کی کہ

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

(اے خدا تو میرے شہر کو اس طرح لوگوں سے معمور کردے جس طرح دریا میں مچھلیاں رکھی ہیں)۔

اس کی دعا کی تاثیر دیکھئے کہ آج شہر حیدرآباد بڑھتا اور پھلتا پھولتا ہی جارہا ہے۔

کشادہ بازاروں، عالی شان محلوں اور حماموں کے ساتھ حیدرآباد کے شایانِ شان باغ لگوائے جن کے اطراف چار دیواری کھینچی اور اس کے ساتھ میں پھول مہکتے۔

اس کے کلام میں ان باغوں اور باغوں میں انگور، نالا، کھجور، سپاری، جامن، ناریل

اور بادام (محمد محل) کے نام ملتے ہیں۔ "باغ محمد شاہی" والی نظم میں اس زمانے کے باغ پھل پھول کی تفصیلات کا ذکر ملتا ہے۔ جہاں اب میر عالم کی بارہ دری، نئے پل کا دروازہ، چھتہ بازار اور یوسف گنج ہے وہاں یہ باغ محمد شاہی واقع تھا۔

ایک اور باغ "امین باغ" دلّی دروازے کے مقرب میں واقع تھا جو موسیٰ ندی سے لے کر موجودہ دار الشفاء کی عمارت، پرانی حویلی، دیوان دیوڑھی پر محیط تھا۔ وہ ہریالی، برسات اور پانی کا دل دادہ تھا۔ چناں چہ ایسے ہی مقامات پر اس نے باغ محل اور عمارتیں بنوائیں کہ شہر میں سرسبزی اور شادابی رہے۔ اس نے کئی محل بنوائے جس کا ذکر آچکا ہے۔ پانی کی نہریں جاری کروائیں اور سایہ دار درخت لگائے۔

جو شاہی محل اس نے تعمیر کروائے نیرنگیٔ زمانے نے انھیں مسمار کر دیا۔ لیکن گولکنڈے کے قلعے اور اس کے اندر کے بوسیدہ محل اور کھنڈروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اونچے اونچے محلوں پر حوضوں میں پانی پہنچانے کا انتظام کس نفاست سے کیا گیا تھا۔

حیدر آباد دکن کے تاریخی مقامات

گولکنڈہ۔ پہلے ورنگل کے راجاؤں کے تحت تھا۔ جب بہمنی بادشاہوں کے ہاتھ آیا اور اس کے بعد قطب شاہی سلاطین کا پایہ تخت بنا تو "حیدر آباد شہر" آباد ہوا۔ گولکنڈہ کا قلعہ بہت مشہور ہے جس پر ایک بارہ دری سطح زمین سے ۴۰۰ فیٹ بلند ہے۔ مسجد صفا، مادنا کا دیول، محلات کے کھنڈر اور شاہان قطب کے مقبرے اپنی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ ہیرا مسجد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی یادگار ہے۔ قطب شاہی بادشاہ علم پرور تھے۔ تاریخ کے ہر ورق پر ان بادشاہوں کے کارنامے جلی حروف میں لکھے نظر آتے ہیں۔

اس مشہور زمانہ گولکنڈہ کا خاتمہ اورنگ زیب کے ہاتھوں ہوا۔ یہاں کی سرزمین سے بوئے وفا آتی تھی۔ یہاں کی فضا میں شاعری گنگناتی تھی۔ یہاں محبت کے سکے ڈھلتے تھے۔ حسیناؤں کے پائل جھنجھناتے تھے لیکن جب مغل بادشاہ اورنگ زیب نے ادھر کا رُخ کیا تو زندگی کی ترنگیں موت کی آغوش میں سوگئیں۔ عبدالرزاق لاری جیسا وفادار، بہادر سپہ سالار اورنگ زیب کی ساری فوج پر بھاری تھا، جو زخموں سے چور چور تھا لیکن اپنے آقا قلی قطب شاہ کے آہنی دروازے پر کھڑا دشمنوں سے لڑتا رہا۔ ایک غدار نے دروازہ کھول دیا اور مغلیہ فوج اندر داخل ہوگئی۔ لیکن جب لہولہان لاری کو اورنگ زیب

کے سامنے لایا گیا تو بھی اس نے اپنا سر اونچا رکھا کہ
"گردن مری کٹ سکتی ہے سر جھک نہیں سکتا"

سکندر علی وجد کے الفاظ میں

شمشیرِ دکن! تو نے عجب دھاک بٹھا دی
دشمن کو شبِ گور کی تصویر دکھا دی
اے مردِ خدا قدرِ وفا تو نے بڑھا دی
قرباں ترے مالک کے لیے جان لٹا دی
جب تک یہ نظامِ سحر و شام رہے گا
تاریخِ دلیراں میں ترا نام رہے گا

حیدرآباد کے نوجوان شاعر صاحبزادہ میکش نے گولکنڈے کے زائرین سے مخاطب ہو کر کہا ہے:

حق شناسی چاہیے اس آستانے کے لیے
دل میں پیدا کر تڑپ آنسو بہانے کے لیے
آنسوؤں میں درد، آہوں میں اثر بھی چاہیے
دیکھنے کے واسطے ذوقِ نظر بھی چاہیے
ان شکستہ بام و در کو تو نے پہچانا نہیں
شان و شوکت کا یہ قبرستان ہے جانا نہیں

سو رہی ہیں رونقیں، ویرانیاں بیدار ہیں
سُن سکے تو سُن کہ ذرّے مائلِ گفتار ہیں
تیری من بیتی ہے افسانہ سمجھتا ہے جسے
شمع آبادی ہے ویرانہ سمجھتا ہے جسے

میکش

اورنگ آباد : ۱۶۱۰ء میں ملک عنبر نے اورنگ آباد کو بسایا تھا۔ اس کا قدیم نام کھرکی یا کوکی تھا۔ جب اورنگ زیب نے اسے فتح کر لیا تو اس کا نام اپنے نام پر اورنگ آباد رکھ دیا۔ یہیں اورنگ زیب نے اپنی ملکہ دِل رس بانو بیگم کا مقبرہ آگرہ کے تاج محل کے نقوش پر تعمیر کروایا۔ جو آج بی بی کا مقبرہ یا رابعہ درانی کا مقبرہ کہلاتا ہے۔

اورنگ آباد کی مختلف صنعتوں میں ہمرو کی صنعت بہت مشہور ہے۔ یہاں اولیائے اللہ کے مزار بھی ہیں۔ اُردو شاعری کے نامور ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی اور سکندر علی وجد جیسے شاعر اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔

خلد آباد : اورنگ آباد سے ۱۴ میل پر خلد آباد واقع ہے۔ یہاں کی سرزمین میں بزرگانِ دین مدفون ہیں۔ اورنگ زیب اور ان کے بیٹے اعظم شاہ کی بھی یہ آرام گاہ ہے۔ یہیں نظام الملک آصف جاہ اوّل، سلطنت آصفیہ کے بانی اور اورنگ زیب کے بہادر سپہ سالار پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کے بیٹے ناصر جنگ اور ان کے دوست میر غلام علی آزاد بلگرامی جو عالم، ناقد اور شاعر تھے، اسی خلد آباد میں دفن ہیں۔ ملک عنبر اور آخری قطب شاہی سلطان ابوالحسن تاناشاہ بھی اسی خاک میں پیوند ہیں۔

دولت آباد: پہلے یہ دیوگری کے نام سے مشہور تھا۔ محمد تغلق کے انتقال کے بعد دو بھائیوں نے وجیانگر سلطنت کی بنیاد رکھی تو ساتھ ساتھ مسلمانوں نے بھی اپنی ایک سلطنت قائم کی جس کا بانی ظفرخاں تھا جو محمد تغلق کا صوبہ دار تھا۔ اس نے علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے لقب سے بہمنی سلطنت قائم کی اور دولت آباد کو اپنا پائیہ تخت بنایا۔

دولت آباد کا نام محمد تغلق کے دور ہی میں پڑچکا تھا۔ دولت آباد میں ایک قلعہ مشہور ہے جس میں چینی محل اور چاند مینار ہیں۔ چاند مینار حسن گنگو کی فتح کا یادگار ہے۔

بیدر: احمد شاہ ولی نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ کئی عرصے تک بہمنی سلطانوں کا پائیہ تخت بھی رہا۔ محمود گاواں کا مدرسہ، جامع مسجد، سولہ کھم کی مسجد اور برید شاہی سلطانوں کے مقبرے اسی بیدر کی سرزمین میں ہیں۔ سید سادات کے چشمے، فرح باغ اور پاپناس کا جھرنا یہاں قابل دید ہیں۔

گلبرگہ: یہاں کے برگ وگل میں خواجہ بندہ نواز کی خوشبو مہکتی ہے۔ ہر سال آپ کا عرس دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ زائرین کی زیارت گاہ ہے کچھ عرصہ تک یہ مقام بھی بہمنی بادشاہوں کا پائیہ تخت رہا۔ یہاں شاہان بہمنیہ کے ہفت گنبد ہیں۔ مسجد قرطبہ کے نمونے پہ تعمیر ہوئی۔ یہاں کی مسجد جو جامع مسجد کہلاتی ہے، مسلم طرز تعمیر کا خوب صورت نمونہ ہے۔

پیٹھن: اورنگ آباد سے ۳۲ میل پر دریائے گوداوری کے کنارے ایک قدیم تعلقہ ہے جہاں ساڑیوں کی صنعت مشہور ہے۔ یہاں کا کپڑا یونان اور روم

تک مشہور تھا۔

عثمان آباد ۔ 'نیپا' نام کے غاروں کا سلسلہ یہاں مشہور ہے۔ یہاں جین اور وشنو قوم کے دیول بھی ہیں۔ پرینڈہ تعلقہ میں ایک قلعہ مشہور ہے جسے اورنگ زیب اپنی کثیر فوج کے باوجود فتح نہ کر سکا تھا۔

تلجاپور : عثمان آباد سے ۱۴ میل پر واقع ہے۔ یہاں تلجا بھوانی کا مندر ہے جو ایک پہاڑی سلسلہ کے دامن میں ہے۔ ہندو قوم کی تیرتھ گاہ ہے۔

بھدراچلم : یہاں رام جی کا مندر مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اپنے بن باس کے زمانے میں رام چندر جی یہاں رکے تھے اور راون نے سیتا کا یہیں سے اغوا کیا تھا۔ مندر گوداوری کے اس پار جہاں پہنچنے کے لیے کشتیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اکنا مادنا کا بھتیجا رام داس نے اس مندر کی مرمت بھی کروائی تھی۔

نلدرگ میں پانی محل کی عمارت بہت مشہور ہے جو ایک ندی کے بیچوں بیچ واقع ہے۔

ہنمکنڈہ : ہزار کھمبوں کا دیول قابل دید ہے۔

اجنتا : اورنگ آباد سے ۵۲ میل دور اور بمبئی سے ۳۰۰ کیلو میٹر پر ایک چھوٹا سا گاؤں اجنتا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۸۰۰ برس قبل وہاں کے کاریگروں اور سنگ تراشوں نے اجنتا کے چٹانوں کو تراش کر اس میں ۲۰ غار بنائے۔ بدھ مذہب کے عبادت خانے اور دیول ہیں۔ بدھ مذہب کے یہ شاہکار نقوش ہندوستانی آرٹ اور سنگ تراشی کے بہترین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ ان

آثار کو دیکھنے سے اس زمانے کے چالوکیہ خاندان کی تہذیب و معاشرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہاں کے غار نمبر ۹ ۔ ۱۰ ۔ ۱۹ ۔ ۲۶ اور ۲۹ نہایت ہی کشادہ اور قدیم عبادت خانوں پر مشتمل ہیں جن کی چھتوں اور ستونوں کو دیکھنے سے کسی گرجا گھر کا شبہ ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ غار رہنے کے مقصد سے تراشے گئے تھے۔ غار نمبر ۱ ۔ ۲ ۔ ۱۶ اور ۱۷ اور ۱۰ کی رنگینی، حسن کاری اور جذبات نگاری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سنگ تراشوں نے صرف اپنے اوزار پلاسٹر اور مٹی اور مختلف رنگوں کے ذریعے ان غاروں میں جذبات نگاری کے جادو جگا دئے ہیں۔ اور پتھروں کو حیرت انگیز تقدیس بخشی ہے۔

"ان چٹانوں کو جذبۂ انسانی نے نقش و نگار و رنگ کا لباس پہنایا ہے"۔ عورت کی نزاکت اور مرد کی مردانگی کو، عورت کے رنگ و روپ، گہنوں، سنگھار سجاوٹ اور اداؤں کو اس خوب صورتی اور نفاست سے پتھروں میں تراشا ہے لگتا ہے جیسے وہ ابھی جی اٹھیں گے، رقص کرنے یا گنگنانے لگیں گے۔

مہاتما بدھ کی تعلیمات کو بھی ان سنگ تراشوں نے پتھروں میں جاوداں کر دیا ہے۔ خود بدھا کو مختلف ڈھنگوں میں کہیں بیٹھا، کہیں لیٹا اور کہیں کھڑا ہوا بتایا گیا ہے اور ان کی زندگی کے حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہر نقش کی باریکی کو اس خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ان غاروں کی صحیح تصویر کشی اور تفسیر اورنگ آباد کے حساس شاعر سکندر علی وجد نے اپنی نظم "اجنتا" میں پیش کی ہے جو قاری کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔

وجدؔ نے ان غاروں کی خوب صورتی، ہنرمندی، تقدیس اور جذبات نگاری سے متاثر ہوکر جو کچھ لکھا ہے اس سے بہتر خراجِ تحسین ادا نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آنسوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

آگے چل کر لکھتے ہیں:

در و دیوار پر ہیں نقش حُسن و عشق کی گھاتیں
پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
گلستانِ اجنٹا پر جنوں کا راج ہے گویا

پھر کہتے ہیں:

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حُسن کاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا
دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ان خاموش ہونٹوں کے خاموش فسانوں کو جو دلِ کہسار میں دھڑک رہے ہیں، صرف ان کا پروردگار ہی سمجھ سکتا ہے یا شاعر کا نازک احساس۔

 اداؤں سے عیاں ہے لذّتِ دردِ جگر دوی ہے
کھلیں گے راز، اس ڈر سے دہن پر مہر کوی ہے
یہ تصویریں بہ ظاہر گو یوں ہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے راز کہتی ہیں

فسوں کاروں کے اس لازوال و جاوداں نقوش کی سحرکاری پر وجد یوں رقم طراز ہیں :

چٹانوں پر شباب و حُسن کی موجیں رواں کردیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کردیں
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

آج اجنٹا کے یہ غار ایک قومی اثاثہ ہیں اور سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے ہیں

ایلورا : دولت آباد سے ۸ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ایلورا کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں اندور کی رانی نے ایک دیول بنوایا تھا۔ ایلورا سے ایک میل پر ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس کے دامن میں ایلورا کے غار واقع ہیں۔ یہاں بھی ان چٹانوں کو تراش کر بدھ مت، برہمن اور جینی مذہب کے دیول اور مندر بنائے گئے ہیں جو تعداد میں ۳۴ ہیں۔ اس میں کیلاش مندر بہت مشہور ہے۔

اجنٹا اور ایلورا کے یہ غار ہندوستان کی تاریخ، معاشرت، تہذیب و تمدن کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے علاوہ حیدرآباد کے اضلاع میں عادل آباد، نظام آباد محبوب نگر، کھمم، رائچور، نلگنڈہ، میدک، ورنگل، کریم نگر، ناندیڑ وغیرہ مختلف

چیزوں کے لیے مشہور ہیں۔

عادل آباد میں ڈچپلی سے ۶۰ میل پر نرمل انڈسٹری ہے جہاں لکڑی پر لکھ اور رنگ کاری کے خوب صورت نقوش، بیل بوٹے، اور اجنٹہ ایلورا کی مورتیاں نقش کی جاتی ہیں۔ یہاں پہاڑوں پر برجیاں بنی ہیں جو کہتے ہیں کہ فرانسیسی اور یوروپین افسروں نے بنوائی تھیں۔

نظام آباد: لکڑی کے کھلونوں کی صنعت کے لیے مشہور ہے۔ قصبہ بودھن میں شکر کا فیکٹری ہے۔ یہاں جین اور برہمن مذہب کے سنگ تراشی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ "عالم گیر مسجد" ہے جس میں اورنگ زیب کے زمانے کے کندہ شدہ پتھر ہیں۔ ایک پرانی مسجد دیول مسجد کے نام سے ہے جس میں محمد تغلق کے زمانے کے دو کندہ شدہ پتھر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد پہلے جین مذہب کا عبادت خانہ تھی کیوں کہ مسجد کے کچھ ستون پر مورتیوں کے نقوش ہیں۔

محبوب نگر کا برگد کا درخت بہت مشہور ہے جو ۲۱۰۰ مربع گز پر پھیلا ہوا ہے۔

محبوب آباد میں دیا سلائی کا کارخانہ ہے۔

کھمم میں ورنگل کے راجہ کا قلعہ تھا جس پر قلی قطب شاہ اوّل نے ۱۵۲۵ء میں چڑھائی کر کے راجہ کو شکست دی تھی۔

رائچور کے مشہور قلعے کو ملک کافور نے فتح کیا تھا۔ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی یہاں گورنر تھا۔ کئی زمانے تک ہندو، جین اور مسلمانوں کے لیے یہ میدانِ جنگ بنا رہا۔

وجیانگر کے راجہ ہری ہرا نے فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں رائچور پر چڑھائی کی تھی۔ بہمنی سلطنت کے بعد بیجاپور کے سلاطین نے حملہ کیا اور یہ قلعہ عادل شاہوں کے ہاتھ آیا۔ پھر مغل بادشاہوں کے قبضہ میں رہا اور آخر میں آصف جاہی سلطنت کی ملکیت رہی۔

رائچور کی جامع مسجد کے دروازے پر خطِ طغریٰ میں قرآن شریف کے سورۃ الناس کنول کے پھول کی شکل میں کندہ ہے۔ محمود شاہ بہمنی کے دور میں عنبر نامی ایک شخص نے یہاں ایک میناری مسجد بنوائی۔

نلگنڈہ میں ہندو راجاؤں کے زمانے کا قلعہ ہے جس میں ایک ہی پتھر کی سل کو تراش کر ایک ستون بنایا گیا ہے جس کی بلندی زمین سے ۳۱ فیٹ بلند ہے۔ پانگل تالاب ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں ۱۵۵۱ء کا بنایا ہوا ہے جس کے کٹّے کو بعد میں آصف جاہی سلطنت نے درست کروایا تھا۔

میدک ورنگل کے راجاؤں کے تحت تھا پھر بہمنی سلطنت کے تحت آیا۔ جمشید قلی قطب شاہ نے حملہ کر کے علی برید شاہ سے حاصل کیا۔ یہ عیسوی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز رہا۔ مانجرا ندی کے کٹّے کو باندھ کر محبوب نہر نکالی گئی پوچارام کا تالاب ہے۔ ۲۴ میل کی دوری پر نظام ساگر دورِ عثمان میں تعمیر ہوا۔

ورنگل پر راجہ اندر ہنس کی حکومت تھی پھر کاکتیہ راجاؤں کا پائیۂ تخت بنا۔ ہنمکنڈہ میں ہزار ستون کا دیول دراوڑی قوم کی یادگار اور چالوکیہ طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ یہ سری رودرا دیو راجہ کے وقت کا بنا ہوا دیول ہے اور سنگ تراشی کے لیے مشہور ہے۔ رودرا دیو کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی رودرماں نے ۳۰ برس یہاں حکومت کی۔

اسی زمانے میں مارکو پولو دکن آیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں رانی کا ذکر کیا ہے۔ جب پرتاپ رودرا نے تخت سنبھالا تو علاءالدین خلجی کا سپہ سالار ملکِ کافور نے ۱۲۹۵ء میں ورنگل پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔

۱۳۲۴ء میں سلطان محمد تغلق نے حملہ کیا اور ۱۴۲۲ء میں یہ سلطنت بہمنی کے تحت آیا۔

ورنگل کے قالین اور کپڑوں کی صنعت مشہور ہے۔ پاکھال کا تالاب اور شکارگاہ بھی ہے۔

عثمان آباد کے تلجاپور میں تلجا دیوی کا دیول ہے اور نلدرگ تاریخی قلعہ ہے۔

بیدر پر محمد تغلق نے پہلا حملہ کیا تھا۔ یہ بہمنی سلطنت کا پایۂ تخت رہا۔ یہاں گنبدانِ سلاطینِ بہمنی اور برید شاہی سلاطین ہیں۔ وزیر محمد شاہ بہمنی نے مدرسہ محمود گاواں کی عمارت بنوائی۔ یہاں کی بیدری صنعت جو بہمنی دورِ حکومت میں ۱۶ ویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی تھی آج بھی مشہور اور پایندہ ہے۔

پٹن چرو کے ایوانِ شاہی میں مہاویر کی سنگِ سیاہ میں مورتیاں تراشی گئی ہیں۔ جین مت کے مندر بھی ہیں۔ چاندی اور زر کا مہین کام اور نقش نگاری کی جاتی ہے۔

نارائن پیٹ میں پارچہ بافی کی صنعت مشہور ہے۔ یہاں کی ساڑیاں مشہور ہیں۔

ننگاریڈی میں ریشمی کپڑا بُنا جاتا ہے۔

کریم نگر میں "سلور فلیگری" یا چاندی کے تاروں کا خوب صورت باریک کام ہوتا ہے۔

ناندیڑ: چالوکیہ راجاؤں کی شکار گاہ تھی۔ چالوکیہ کے خاتمے پر کاکتیہ اور یادو سلطنتیں قائم ہوئیں تو اس جگہ کو بہت اہمیت حاصل ہوئی۔ ۱۳۱۰ء میں ملک کافور نے اس پر حملہ کیا پھر تغلق خاندان کے دور میں ناندیڑ سلطنتِ دہلی میں شامل ہوگیا۔ امیرانِ صدہ کے زمانے میں بہمنی سلطنت میں آگیا۔ دکن کی پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں تو یہ نظام شاہی سلطنت میں شامل ہوا۔ اس کے بعد مغل پرچم اس پر لہرانے لگا اور آصف جاہی دور میں آصفی پرچم کے زیرِ سایہ آیا۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ ہندوستان میں شامل ہوگیا اور مہاراشٹرا کا حصہ بن گیا۔

بھونگیر میں بلند چٹان پر ایک قلعہ ہے جو ایک میل پر محیط ہے۔ دولت قلی جو قطب شاہ اوّل کا بیٹا تھا، اس قلعہ میں قید رکھا گیا تھا۔ بھونگیر مٹی کی صراحیاں اور موتر کی کاشت کے لیے مشہور ہے۔

گلبرگہ میں علاء الدین حسن گنگو کا مزار ہے جو بہمنی سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس نے جامع مسجد کی تعمیر کی۔ یہاں صوفی بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ بھی ہے جو فیروز شاہ بہمنی کے دور میں ان کی دعوت پر یہاں آئے تھے اور یہیں ان کا وصال ہوا۔

راج کونڈہ کے ایک ویران قلعہ کے نقوش ہیں جسے قلی قطب شاہ اوّل نے فتح کیا تھا۔

دیور کنڈہ سے ۵۰ میل پر ایک قلعہ ہے جو قلی قطب شاہ اوّل نے وجیانگر کے راجہ سے حاصل کیا تھا۔

سوریا پیٹ میں چند قدیم دیول ہندی فن تعمیر کے لیے مشہور ہیں۔
ناگل پاڑ کے دو دیول مشہور ہیں۔ تالاب پالیر عہد عثمانی میں تعمیر ہوا۔
شاہ آباد میں شاہ آبادی پتھر اور سمنٹ کا کارخانہ مشہور ہے۔

غرض دکن کے گوشے گوشے میں تاریخ چھپی ہے۔ یہاں کے کھنڈروں
میں زندگی اور ویرانوں میں تہذیب و تمدن پنہاں ہے۔

میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع

کے عہدِ حکومت کی

عمارتیں اور کلچر

آرٹ، ادب اور مشرقی و مغربی علوم کی سرپرستی خاندانِ آصف جاہی کی امتیازی روایات میں داخل تھیں جس کے سبب ادیبوں، عالموں، فاضلوں اور شاعروں نے دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کے اُجڑنے کے بعد یہاں آکر پناہ لی تھی۔

دکن کے اولین شعرا ولی اور سراج اسی دکن کی پیداوار تھے۔ شاہ نواز خاں نے اسی سرزمین پر تاریخی سوانح لکھی تھی جو 'تاریخ فرشتہ' کے بعد سب سے اہم تاریخ مانی جاتی ہے۔ فرشتہ خود ابتدا میں اسی دکن میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی عالم اور شاعر اور ناصر جنگ بہادر کے قریبی دوست دونوں اسی سرزمینِ دکن میں پیوندِ خاک ہوئے۔

شاہوں کے ساتھ امرا نے بھی علوم کی سرپرستی کی۔ علم ہیئت کے لیے جدید قسم کی رصدگاہ قائم ہوئی اور میر عالم کی "حدیقۃ العالم" وجود میں آئی۔

مدرسہ طبیہ یا طبیہ کالج کے بعد کتب خانۂ آصفیہ قائم ہوا جس میں ملی کتابوں کا ذخیرہ جمع ہوا۔ 'دائرۃ المعارف' کی بنیاد پڑی جس میں عربی ادبِ عالیہ کی اشاعتوں کو بین الاقوامی شہرت ملی۔

اسی علمی ادبی سرپرستی نے جامعہ عثمانیہ کو وجود میں لایا۔

جامعہ عثمانیہ مغل اور ہندو آرٹ کا نمونہ ہے جو اپنی رعایا کی تعلیم کے لیے ۱۹۱۹ء میں میر عثمان علی خاں نے اپنے عوام کو تحفہ میں دیا۔ جامعہ عثمانیہ کو قائم کر کے اردو زبان کو ترقی دی۔

جس طرح آج ہندی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، قلی قطب شاہ کے دور میں فارسی سرکاری زبان تھی لیکن عثمان علی خاں نے اردو کو سرکاری زبان بنا کر اسے پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا۔

کتب خانہ آصفیہ میں مشرقی مخطوطات کا انمول ذخیرہ ہے جہاں مصنفوں اور عالی مرتبت سلاطین کی تحریریں موجود ہیں۔ موسیٰ ندی کے کنارے عثمان علی خاں کے دور کی تعمیر شدہ عمارت ہے۔

کتب خانہ آصفیہ آصف جاہی بادشاہوں کی یادگار ہے۔ میر محبوب علی خاں نے نواب عماد الملک بہادر کی نگرانی میں اس کتب خانے کی بنیاد رکھی تھی جو شاہی کتب خانے کے نام سے مشہور تھا اور عابد روڈ پر واقع تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اسے دو منزلہ عمارت میں تبدیل کر دیا گیا۔ موسیٰ ندی کے کنارے اس عمارت کی افتتاح عثمان علی خاں نے کی تھی۔[1]

---

[1] دوسرے کتب خانے جو شہر حیدرآباد کے عوام کے لیے دورِ عثمانی میں قائم کیے گئے، وہ ہیں:

کتب خانہ محبوب حسین، کتب خانہ سر علی بلگرامی، کتب خانہ چراغ علی، کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، کتب خانہ سید محمد قاسم اور کتب خانہ عمر یافعی۔

شہر کی دوسری خوب صورت عمارتوں میں فلک نما پیلیس، ہائی کورٹ یا عدالت العالیہ، دواخانہ عثمانیہ، سٹی کالج، جاگیردار کالج، جوبلی ہال، ٹاؤن ہال، عجائب خانہ اور آرٹ گیلری اور معظم جاہی مارکٹ، آصف جاہی ذوق ولقافت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

دواخانہ عثمانیہ: ۲۵ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کردہ یہ دواخانہ شہریوں کے علاج کے لیے جدید آلات سے لیس، موسیٰ ندی کی بائیں جانب اور سٹی کالج کے مقابل خوب صورت عمارت ہے اور مسلم آرٹ کا نمونہ ہے۔
اس سے ملحق طبیہ کالج کی پرانی عمارت ہے جو نواب ناصر الدولہ کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔

سٹی کالج: نوجوانانِ حیدرآباد کی تعلیم کے لیے وسط شہر میں اس کالج کی بنا ڈالی گئی۔

جاگیردار کالج: میر عثمان علی خاں نے اپنے امراء کے لڑکوں کے لیے ایک علاحدہ کالج معہ ہاسٹل کے قائم کیا۔ یہ کالج بیگم پیٹ میں ایک عالی شان عمارت میں تھا۔ یہاں لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ تربیت بھی دی جاتی تھی۔ نشست و برخواست کے طریقے، رہن سہن کے ڈھنگ اور کھانے پینے کا سلیقہ سکھایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کھیل کود کے لیے بہت بڑا میدان بھی تھا۔ جسمانی ورزش اور صحت کے لیے ہر طرح کی سہولت تھی۔

آج حیدرآباد پبلک اسکول اسی عمارت میں قائم ہے۔

عدالت العالیہ عثمانیہ: آصف سابع کے عہد میں ریاست کے انتظام

عدالت نے جو ترقی کی اس کی زندہ مثال ہے۔ اس کی رفیع الشان عمارت موسیٰ ندی کی دائیں جانب ہندی عربی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے جو ۱۹۱۹ء میں ۲۲ لاکھ کی رقم سے مکمل ہوئی۔ پوری عمارت سنگِ گرانٹ سے بنائی گئی ہے۔

حیدرآباد کا عدالتی نظام برطانوی ہند کی عدالتی تنظیم کے نقوش پر ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عدلیہ کا عاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۹۲۱ء میں مال گزاری کے پورے اختیارات عدالت کے تفویض ہو گئے لیکن خود مال گزاری سے متعلق قانون برائے امن مال گزاری کو حاصل رہے۔ ۱۹۲۶ء میں اس کی بنیاد اصول، اس کے فرائض و اختیارات کی وضاحت عثمان علی خاں نے ایک منشور کے ذریعہ جاری کیے۔

۱۹۲۸ء میں قانون عدالت العالیہ کے عہدہ داروں میں ایک چیف جسٹس، آٹھ جج، انسٹگیٹنگ آفیسر شامل تھا۔ اس کے علاوہ ایک رجسٹرار اور ایک مفتی بھی اس سے منسلک تھے جو اسلامی رُو سے سنگین مقدموں، سزائے موت، وغیرہ کو بادشاہ کے مشورے سے اور خصوصی شاہانہ اختیارات کی رُو سے تبدیل کر سکتے تھے۔

معظم جاہی مارکٹ: حیدرآباد کی سب سے بڑی مارکٹ کی بنیاد عثمان علی خاں کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔

مسافر خانہ نامپلی، شفاخانۂ زہرا، عزاخانۂ زہرا اور یونانی دواخانہ، جو چارمینار سے قریب اور مکہ مسجد کے مقابل ہے۔ یونانی طریقۂ علاج کے لیے تعمیر کیا گیا۔

شفاخانہ نظامیہ ۸ لاکھ روپے سے تعمیر ہوا۔ اور ۵ سال کے عرصے میں

مکمل ہوا۔

چومحلہ پیلس قدیم عمارت ہے جہاں عثمان علی خاں نے ایک دربار ہال بنوایا تھا۔ اس دربار ہال میں شہزادہ مکرم جاہ کی رسم تخت نشینی بھی انجام پائی۔ اس پیلس میں شاہی دعوتیں دی جاتی تھیں۔

فلک نما پیلس ۔ نواب وقار الامراء نے تعمیر کروایا تھا لیکن عثمان علی خاں نے اسے خرید لیا۔ اس کی سجاوٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ قیمتی جواہرات اور نوادرات بھی یہاں رکھے تھے۔ پرنس آف ویلز اور وائسرے ہند یہاں بطور مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔

پُرانی حویلی : آصف جاہی خاندان کا شاہی محل تھا۔ نواب سکندر جاہ یہیں رہتے تھے افضل الدولہ نے بھی یہیں قیام کیا تھا۔ میر محبوب علی خاں کی پیدائش اسی حویلی میں ہوئی تھی اور عثمان علی خاں اسی قدیم حویلی کی آغوش میں رہے اور ولی عہد مقرر ہوئے۔

کنگ کوٹھی : ولی عہد بننے کے بعد عثمان علی خاں کی رہائش کے لیے اس کوٹھی کا انتظام ہوا اور اسی کوٹھی میں انھوں نے آخری سانس لی۔ یہ کوٹھی نواب کمال خان المخاطب کمال یار جنگ کی کوٹھی تھی جسے عثمان نے خرید لی تھی۔ تمام شیشہ جات اور سامانِ آرائش پر K.K لکھا ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے کنگ کوٹھی کا نام تجویز پایا۔

رزیڈنسی برطانوی رزیڈنٹس کے لیے مقرر تھی۔ رزیڈنسی روڈ اور رزیڈنسی

بازار رزیڈنٹ کے رہنے کی وجہ سے مشہور ہوئے۔

عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے بعد "شاہ راہِ عثمانی" اور "سلطان بازار" کہلانے لگے۔ رزیڈنسی کی اسی عمارت میں لڑکیوں کا کالج ہے اور سلطان بازار بڑا شاپنگ سنٹر بن چکا ہے۔

باغِ عامہ کی ساری عمارتیں جیسے جوبلی ہال، ٹاؤن ہال، آرٹ گیلری، حضرت محبوب دکن کے دور کی نشانیاں ہیں۔ جوبلی ہال آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کی جوبلی کے موقع کی یادگار ہیں۔

"باغِ عامہ" پر استادِ شاہ جلیل نے چند خوب صورت اشعار قلم بند کیے ہیں۔

روئے گل پر کاکلِ سنبل ہے بل کھائی ہوئی
برگِ گل میں لعل لب کی ہے جھلک آئی ہوئی
وہ ہے باغِ عام پر جوبن کہ انساں کیا جلیل
بن کے چشمِ شوق نرگس بھی تماشائی ہوئی

آج باغِ عام سے ہے اور ہی شانِ دکن
ہر کلی اس بوستاں کی ہے گلستانِ دکن
پتی پتی نے لکھا ہے کلکِ قدرت سے جلیل
شاہِ عثمان آصفِ سابع سلیمانِ دکن

جلیل مانک پوری

کتابیات

احمد محی الدین۔ "رہبرِ دکن" سالگرہ نمبر۔ حیدرآباد ۱۳۵۳ھ

"رہبرِ دکن" جشن سیمیں نمبر۔ جلد ۱۸۔ ۱۳۵۷ھ حیدرآباد

احمد عارف صبحِ دکن روزنامہ سال گرہ نمبر جلد دوم ۱۳۴۹ھ حیدرآباد

احمد عارف۔ صبحِ دکن " روزنامہ ۱۳۵۵ھ حیدرآباد

صبحِ دکن " روزنامہ ۱۳۵۷ھ حیدرآباد

ادارۂ ادبیات اردو۔ "تاریخ ادب اردو" ادارۂ ادبیات اردو۔ ۱۹۴۰ء حیدرآباد

اصغر حسن۔ دلچسپ مقامات۔ صوبہ اورنگ آباد" حصّہ دوم۔ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد ۱۹۳۸ء

بشیر احمد میاں۔ "اردو ۱۹۴۰ء میں" لاہور۔ رسالہ ہمایوں ۱۹۳۵ء

برق موسوی۔ "دین یار جنگ۔ زندگی اور کام" ولا اکیڈیمی چادر گھاٹ حیدرآباد ۱۹۷۱ء

مصطفیٰ صدیقی "پاکیزہ آنچل" سال گرہ نمبر۔ نئی دہلی۔ ۱۹۹۰ء

جانکی پرشاد۔ "حیدرآباد کے جدید دستور پر ایک نظر" حیدرآباد

حامد حسن قادری۔ تاریخ و تنقید ادبیاتِ اردو" آگرہ۔ لکشمی نرائن اگروال ۱۹۳۹ء

"داستانِ تاریخ اردو" آگرہ لکشمی نرائن اگروال۔ ۱۹۴۱ء

حمید احمد خواجہ۔ "تحریکِ مملکتِ آصفیہ" عہد آفریں پریس۔ حیدرآباد۔ ۱۳۴۷ف

رفیعہ سلطانہ۔ مرتبہ۔ "حیدرآباد" ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ شمارہ ۳/۱۔ حیدرآباد ۱۹۴۴ء

شمس اللہ قادری۔ "سلطنت" حیدرآباد۔ ۱۳۶۲ھ

سلطنت سال گرہ نمبر۔ حیدرآباد ۱۳۶۴ھ

سلطنت سال گرہ نمبر۔ حیدرآباد ۱۹۴۵ء

صمصام شیرازی "مشیر عالم ڈائرکٹری" ۔ حیدرآباد ۱۹۴۰ء

"مشیر عالم ڈائرکٹری"۔ حیدرآباد ۱۹۵۱ء

"مشیر عالم ڈائرکٹری"۔ حیدرآباد ۱۹۵۷ء

طیب انصاری۔ "حیدرآباد میں اردو صحافت" حیدرآباد

عبدالمجید صدیقی۔ "مقدمۂ تاریخ دکن" ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد۔ ۱۹۴۰ء

عبدالغفار، محمد۔ "آئین عثمانی" شمس الاسلام پریس۔ حیدرآباد ۱۳۳۳ھ

عبدالجبار ملکاپوری۔ "تذکرۂ اولیائے دکن"

عبدالقادر، حاجی محمد۔ رہنمائے تاریخ اردو" اعظم گڑھ۔ معارف پریس ۱۹۲۸ء

عبدالرحمٰن رئیس۔ "نشور" سال گرہ نمبر۔ اعظم اسٹیم پریس۔ حیدرآباد ۱۳۵۲ھ

عتیق صدیقی محمد ہندوستانی اخبار نویسی۔

عظیم الدین محبت۔ "مملکت آصفیہ" ناشر ادارۂ محبانِ دکن کراچی ۱۹۷۸ء

علی اصغر بلگرامی سید۔ مؤلفہ مآثر دکن ۱۹۲۲ء۔ ۱۹۲۴ء۔ دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

مانک راؤ وٹھل راؤ۔ بستانِ آصفیہ" (حصہ اول، دوم، چہارم، ششم)
شمس الاسلام پریس۔ حیدرآباد

"دستور حکمرانی" شمس الاسلام پریس۔ حیدرآباد ۱۳۲۲ف

محمد فاضل۔ جشن عثمانی۔ یادگار سلور جوبلی آصف سابع خصوصی نمبر۔ جلد اول
حیدرآباد ۱۹۳۵ء

محمد مظہر۔ "تذکرۂ بابِ حکومت" (۱۳۳۰-۱۳۶۳ھ) اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد ۱۹۴۵ء

مجلہ عثمانیہ - "جامعہ عثمانیہ نمبر" حیدرآباد

مراد علی طالع - نظام الملک آصف جاہ اول سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

۔۔۔۔۔۔ " نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث " " " " "

۔۔۔۔۔۔ نواب ناصر الدولہ بہادر آصف جاہ رابع " " " "

۔۔۔۔۔۔ نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ " " " " "

۔۔۔۔۔۔ حضرت محبوب علی خاں آصف جاہ سادس " " " " "

محی الدین قادری زور، سید - "داستانِ ادب حیدرآباد" ادارۂ ادبیاتِ اردو - حیدرآباد - ۱۹۵۱ء

۔۔۔۔۔۔ نذرِ محمد قلی قطب شاہ " " " " " ۱۹۵۱ء

۔۔۔۔۔۔ "دکنی ادب کی تاریخ" کراچی اردو اکیڈیمی - سندھ

مشتاق احمد خاں - "زوالِ حیدرآباد کی ان کہی داستان" لاہور - آفتابِ عالم پریس ۱۹۸۶ء

مصطفیٰ کمال، سید ڈاکٹر - حیدرآباد میں اردو کی ترقی " سلسلہ مطبوعات شگوفہ پبلیکیشنز حیدرآباد

نجم الغنی، غلام محمد - "تاریخِ ریاست حیدرآباد دکن" حیدرآباد

نصیر الدین ہاشمی - خواتین عہد عثمانی" اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد ۱۹۳۶ء

______ "دکن میں اردو" مکتبہ ابراہیمیہ نظام دکن پریس حیدرآباد ۱۹۳۶ء۔

______ "خواتینِ دکن کی اردو خدمات"

______ "دکن کے نسوانی ادارے"

وقار احمد۔ "نظام گزٹ" روزنامہ حیدرآباد ۔ ۱۹۲۷ء

______ "نظام گزٹ" روزنامہ حیدرآباد ۔ ۱۹۳۱ء

______ "نظام گزٹ" روزنامہ حیدرآباد ۔ ۱۹۴۸ء

ویرپا وکیل ۔ "حدیداً آثار قدیمہ ممالک محروسہ" مطبع نظام دکن ۔ حیدرآباد ۱۳۲۴ف

یعقوب علی عرفانی "ارمغانِ عرفانی موسوم بہ حیاتِ عثمانی جلد اول ۔ اعظم اسٹیم پریس (ایڈیٹر "سالار" بمبئی) ۱۹۳۶ء

یوسف حسین خاں ، ڈاکٹر "تاریخ دکن ۔ عہد حالیہ" دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۴۴ء

تمت